دیوانِ غالب کامل

نسخۂ رضا

تاریخی ترتیب سے

مرتّبہ

کالی داس گپتا رضا

ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹیڈ، بمبئی ۴۰۰۰۲۰

بار اوّل	۱۵ فروری ۱۹۸۸ء
بار دوّم	۱۹۹۰ء
بارِ سوّم (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)	۱۵ فروری ۱۹۹۵ء
تعداد	پانچ سو
قیمت	پانچ سو روپے
طباعت	پنکج انٹرپرائزرز۔ واشی نیو بمبئی۔ ۴۰۰۷۰۳
پبلشرز	ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ۔ ۱۰۷ ارجولی بھون۔ ۱ ۱۰ ارینو مرین لائنز۔ بمبئی ۴۰۰۰۲۰
کتابت	پرویز خاں

رفیقۂ حیات

ساوِتری گپتا

کے نام

اُسی کے ہمہ وقتی تعاون سے
یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ سکا

فہرستِ مضامین

تصویریں

(چاروں تصویریں اور درجِ ذیل مختصر اقتباسات "مرقّعِ غالبؔ" سے ماخوذ ہیں)

۱ ۔ "یہ تصویر..... کلیاتِ غالبؔ طبع دوئم میں چھپی تھی ... ۱۸۶۳ء میں ..... مرزا کی زندگی میں....."

2 ۔ "مُوقلم کی یہ رنگین نادر تصویر مرزا غالبؔ نے ..... بہادر شاہ ظفرؔ کو پیش کی تھی ....."

۳ ۔ "مُوقلم کی یہ رنگین سنہری تصویر..... ۱۲۸۲ھ ..... کی بنی ہوئی ہے ....."

۴ ۔ بقول نواب سر امیر الدین احمد خان فرخؔ مرزا یہ "آخر وقت کی تصویر ہے اور مرنے سے کچھ مہینے پہلے کی حالت ہے ..... میرے روبرو فوٹو لیا گیا تھا ۔ مرزا صاحب کو والد صاحب (نواب علاء الدین احمد خاں علائیؔ) نے مجبور کیا تھا ۔"

مقدّمے سے پہلے

"دیوانِ غالب کامل، تاریخی ترتیب سے نسخۂ رضا" کا یہ تیسرا ایڈیشن ہے۔ اگرچہ دوسرے ایڈیشن میں بھی ردّ و بدل کیا گیا تھا مگر وہ کچھ ایسا نمایاں نہ تھا۔ یہ ایڈیشن (تیسرا، جو آپ کے ہاتھوں میں ہے) پہلے دونوں ایڈیشنوں سے کافی مختلف ہے۔ اس لیے اب یہ محض "دیوانِ غالب کامل (نسخۂ رضا)" کا تیسرا ایڈیشن ہی نہیں بلکہ ایک طرح سے جدید ایڈیشن ہے۔

(۱)

ذیل میں چند اضافوں کی نشاندہی کی جاتی ہے جو اس ایڈیشن میں روا رکھے گئے ہیں

۱۔ اشعار کی ترتیب میں فرق رہ گیا تھا۔ اسے مختلف ماخذوں کی مدد سے روایت کے مطابق کر دیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب ہر شعر اپنی صحیح جگہ پر درج ہے۔

۲۔ بعض اشعار کو غالب کے فکر کردہ تسلیم کرنے میں تامّل ہوتا تھا۔ انہیں متن سے خارج کر دیا گیا ہے مگر مقدّمے میں الگ باب

کے تحت شامل رکھا گیا ہے تاکہ وہ کلامِ غالبؔ کی ٹوہ میں رہنے والوں کی نگاہ سے اوجھل نہ رہیں۔

۳۔ مزید غور کرنے پر بعض غزلوں اور اشعار کا سالِ فکر دوبارہ متعین کیا گیا ہے۔

۴۔ نسخۂ بھوپال بخطِ غالبؔ (۱۸۱۶ء) یا کسی بھی اساسی نسخے کے سالِ کتابت سے جن غزلوں اور اشعار کا سالِ فکر متعین کیا گیا تھا اُن میں بعد کے کہے ہوئے اشعار بھی شامل ہیں مگر یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ اشعار پہلے پہل کب کہے گئے تھے یا کس ماخذ میں پہلی بار درج ہوئے تھے۔ اب نشاندہی کر دی گئی ہے۔

۵۔ نسخۂ عرشی میں درج مفصّل اختلافِ نسخ کے پیشِ نظر میں نے اپنے نسخے (دیوانِ غالبؔ کامل۔ نسخۂ رضا) میں اختلافِ نسخ ظاہر کرنے سے گریز کیا تھا مگر عرشی صاحب کے ماخذوں میں نسخۂ بھوپال بخطِ غالبؔ (رنخ) دیر سے شامل ہوا تھا شاید اسی لیے یہ "اختلافِ نسخ" میں نہیں لیا جا سکا تھا۔ یہ کمی بُری طرح کھٹک رہی تھی چنانچہ اب میں نے کلامِ غالبؔ کے آج تک کے دریافت شدہ اس قدیم ترین نسخے کا مکمّل اختلافِ نسخ اضافہ کر دیا ہے۔

۶۔ "دیوانِ غالبؔ کامل (نسخۂ رضا)" کے پہلے ایڈیشنوں میں تمام غزلوں یا دیگر اصناف پر سالِ فکر درج کرنے کا التزام تھا مگر اب سالِ فکر صرف ہر صفحے کے شروع میں لکھ دیا گیا ہے جس سے مُراد یہ ہے کہ اس صفحے کے تمام اشعار اسی سالِ فکر کے تحت آتے ہیں۔ اگر کسی صفحے پر کہیں سالِ فکر تبدیل ہو گیا ہے تو اُسے متعلقہ مقام پر ظاہر کر دیا گیا ہے۔

(ب)

جن مشاہیر اور قارئین نے "دیوانِ غالبؔ کامل (نسخۂ رضا)" کی تعریف و توصیف سے میرا دل بڑھایا ان کی تعداد بہت ہے۔ ان سب کا میں احسان مند ہوں۔ اگرچہ فرداً فرداً شکریہ ادا کرنا ممکن نہیں تاہم جناب مالک رام مرحوم، جناب جمیل الدّین عالی، ڈاکٹر گیان چند، جناب مشفق خواجہ، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، جناب لطیف الزّماں خاں، ڈاکٹر مختار الدّین احمد، جناب شمس الرّحمٰن فاروقی، جناب رشید حسین خاں، ڈاکٹر حنیف نقوی، محبّی شبن۔ کاف۔ نظام، محبّی افتخار امام صدّیقی، اور محبّی محمد یوسف کھتری کے نام بطورِ خاص میرے شکریے کے مستحق ہیں۔ ان میں سے بعض نے میری کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے اور بعض نے کام کو ترقی دینے کی غرض سے مجھے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ میں تمام مشورے تو قبول نہیں کر سکا تاہم اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس تیسرے ایڈیشن [دیوانِ غالبؔ کامل جدید (نسخۂ رضا)] کے بنانے سنوارنے میں ان دانشوروں کی پُرخلوص دلچسپی شامل ہے۔ اس لیے اُن کا اور سب علم دوستوں کا تہہِ دل سے شکریہ۔

(ج)

میں نے جب بھی غالبؔ پر قلم اٹھایا، غالبؔ، غالبؔ کے پیشروؤں، ہم عصروں اور پیروکاروں کو اپنے گرد و پیش موجود پایا۔ میں نے اُن کے کلام تقابلی نظر سے دیکھے، پڑھے، کھنگالے اور پرکھے۔ نتیجے میں غالبؔ کو اُن سب سے الگ پایا۔

پھر غالبؔ کے محقّقوں، نقّادوں، نکتہ چینوں اور مُوَیّدوں کی۔ جن میں میرے بزرگ اور ہم عصر دونوں شامل ہیں۔ موشگافیوں کا انہماک سے مطالعہ کیا۔ بعض کی تائید کی بعض کی تردید کرنی پڑی۔ میرے کتب خانے کے غالبؔ کلکشن

میں غالب اور غالبیات سے متعلق دو ہزار سے زائد کتابیں اور رسالے ہیں، یہ سارا مواد غالب، غالب کے ہم عصروں، پیروکاروں، محققوں، نقادوں اور مؤیدوں ہی کی دین ہے۔ اس پورے انبار کو پیشِ نظر رکھا۔ جی بھر کے چھان پھٹک کی اور خوشہ چینی بھی۔ حوالے ہر جگہ موجود ہیں۔

میں آج سے اپنی عمر کے سترّویں سال میں داخل ہو رہا ہوں۔ اس لیے احتیاطاً یہ تو نہیں کہتا کہ میں غالب پر مزید کام ہی نہیں کروں گا مگر تنِ تنہا کوئی موقّر اور ضخیم کام شاید اب مجھ سے بن نہ پڑے۔ اس لیے رخصت۔

کالی داس گپتا رضا
بمبئی۔ ۲۵ اگست ۱۹۹۴ء

ماخذوں کی تاریخی ترتیب اور علامتیں[ا]

نمبر شمار	نام ماخذ	علامت	تقریبی تاریخِ ترتیب یا طباعت
۱۔[ب]	نسخۂ بھوپال (قدیم) بخطِ غالب	نخ	۱۲۳۱ھ = ۱۸۱۶ء
۲۔[ج]	نسخۂ بھوپال	ق	۱۲۳۷ھ = ۱۸۲۱ء
۳۔	نسخۂ شیرانی	قا	۱۱۴۲ھ = ۱۸۲۶ء

ا۔ یہ فہرست بیشتر نسخۂ عرشی اشاعتِ دوّم (مقدمہ ص ۱۵۵) سے اخذ کی گئی ہے اور عرشی صاحب ہی کی علامتوں کو برقرار رکھا گیا ہے تاکہ حوالوں میں یکسانیت رہے۔

ب۔ اصل مخطوطہ اب دستیاب نہیں۔ تاہم یہ تین عکسی اشاعتیں (۱) از عرشی زادہ (۲) از کمال احمد صدیقی اور (۳) مشمولہ نقوش لاہور میرے پیشِ نظر رہی ہیں۔

ج۔ اصل مخطوطہ گم ہو چکا ہے اس لیے نسخۂ بھوپال مشمولہ نسخۂ حمیدیہ کے تین مطبوعہ نسخوں مرتّبہ مفتی محمد انوار الحق اور چوتھے نہایت اہم مطبوعہ نسخے مرتّبہ حمید احمد خاں سے استفادہ کیا گیا ہے۔
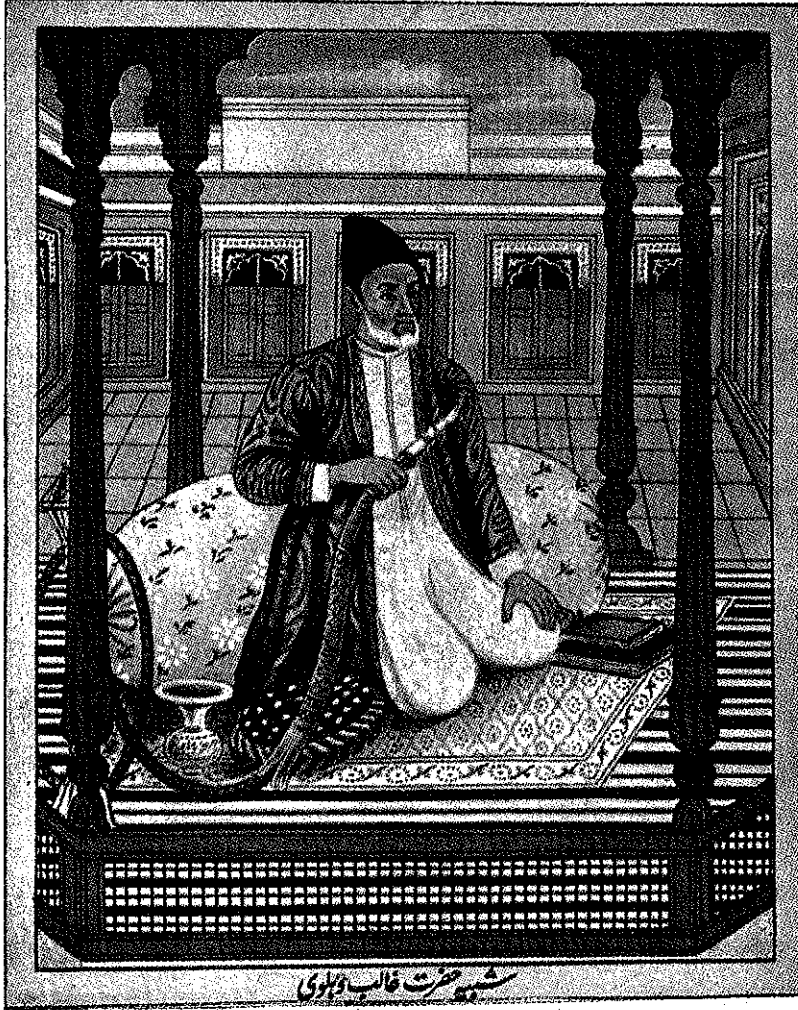
شبیہ حضرت غالب دہلوی

نمبر شمار	نام ماخذ	علامت	تقریبی تاریخ ترتیب یا طباعت
۴۔	گلِ رعنا	گل	۱۲۴۴ھ = ۱۸۲۸ء
۵۔	نسخۂ رام پور (اوّل یا قدیم)	قب	۱۲۴۹ھ = ۱۸۳۳ء
۶۔	انتخابِ غالبؔ	غب	۱۲۵۲ھ = ۱۸۳۶ء
۷۔	نسخۂ بدایوں	قبا	۱۲۵۴ھ = ۱۸۳۸ء
۸۔	پہلا مطبوعہ ایڈیشن	م	۱۲۵۷ھ = ۱۸۴۱ء
۹۔	نسخۂ دلینہ	قبج	۱۲۶۱ھ = ۱۸۴۵ء
۱۰۔	نسخۂ کریم الدّین (نسخۂ کراچی)	قبد	۱۲۶۱ھ = ۱۸۴۵ء
۱۱۔	دوسرا مطبوعہ ایڈیشن	ما	۱۲۶۳ھ = ۱۸۴۷ء
۱۲۔	نسخۂ لاہور	قج	۱۲۶۸ھ = ۱۸۵۲ء
۱۳۔	نسخۂ رام پور (ثانی یا جدید)	قد	۱۲۷۱ھ = ۱۸۵۵ء
۱۴۔	تیسرا مطبوعہ ایڈیشن	مب	۱۲۷۸ھ = ۱۸۶۱ء
۱۵۔	چوتھا مطبوعہ ایڈیشن	مج	۱۲۷۸ھ = ۱۸۶۲ء
۱۶۔	پانچواں مطبوعہ ایڈیشن	مد	۱۲۸۰ھ = ۱۸۶۳ء
۱۷۔	انتخابِ غالبؔ	خ	۱۲۸۳ھ = ۱۸۶۶ء

د۔ اس مخطوطے کو جناب امتیاز علی خاں عرشی مرحوم نے ۱۹۴۲ء میں اپنے روایتی رکھ رکھاؤ کے ساتھ طبع کرادیا تھا، وہی مطبوعہ نسخہ میرے پیشِ نظر ہے۔ یہ انتخاب چوتھے مطبوعہ ایڈیشن (۱۲۷۸ھ = ۱۸۶۲ء مطبع نظامی کانپور) پر مبنی ہے۔
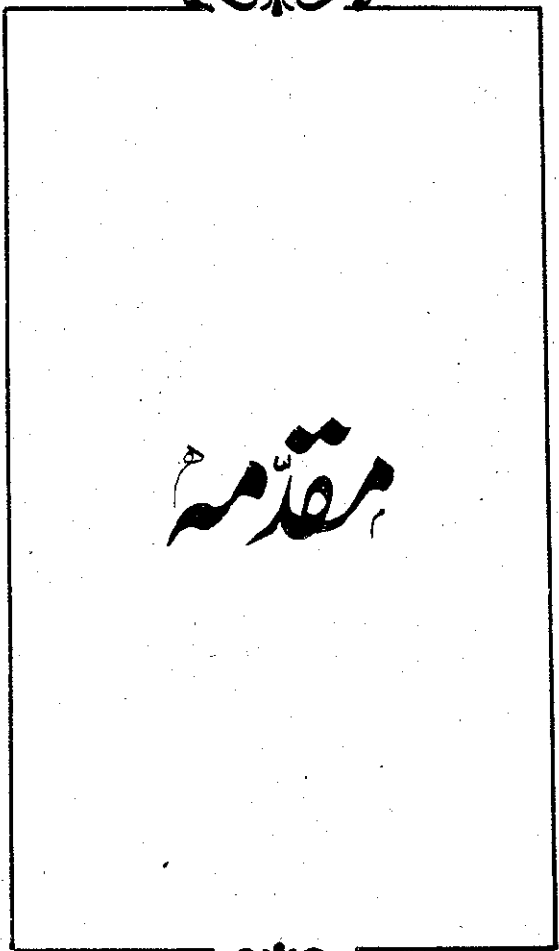
مقدمہ

کلامِ غالب کی تاریخی ترتیب کیوں

نصف صدی سے بھی کچھ پہلے کی بات ہے، مَیں کوئی دس گیارہ سال کا رہا ہوں گا۔ مادری زبان پنجابی ہونے کے باوجود گھر کے کونے کونے میں اُردو زبان چھاؤنی چھائے ہوئے تھی۔ پورے پنجاب کا یہی حال تھا۔ میرے والدِ محترم اُردو کے ادیب تو نہ تھے، مگر انگریزی کے گریجویٹ ہوتے ہوئے بھی اُردو فارسی کے اس حد تک رسیا تھے کہ اُنھیں اِن زبانوں کا عالم کہنا کچھ زیادہ غلط نہ ہوگا۔ مدرسے کے بعد گلستان، بوستان اور انوارِ سہیلی کے اسباق مَیں اُنھی سے لیا کرتا تھا۔

ہمارے یہاں ادبی کتابوں میں آبِ حیات (آزادؔ) اور یادگارِ غالبؔ (حالیؔ) سامنے ہی دھری رہتی تھیں۔ مَیں نے اِنھیں نہایت رغبت سے پڑھا، 'آبِ حیات' پوری اور 'یادگارِ غالبؔ' کا سوانحی حصّہ۔ قصّے کہانیاں سمجھ کر اِن سے بہت حظ اُٹھایا۔ اُنھی ایّام میں ایک چھوٹی سی کتاب 'یوسفِ ہندی قیدِ فرنگ میں'، نئی نئی آئی تھی۔ چوری چھپے پڑھی۔ مواد ثقیل تھا اور فارسی اشعار بہت تھے۔ کچھ پلّے نہ پڑا۔ گھر میں ہر سال ہمارا خاندانی بھاٹ راجستھان سے آیا کرتا تھا۔ پرانے تاریخی اور فی البدیہہ

کبت بہت اچھے کہا کرتا تھا۔ محرّم میں تعزیہ اُٹھتا تھا۔ نوحہ خوانی ہوتی تھی۔ بعض نوحے دل کو چھو لیتے تھے۔ سب پر مستزاد یہ ادبی کتابیں خاص کر 'آبِ حیات'۔ مجھے شعر کہنے کی چاٹ لگ گئی جس سے آج اٹھاون سال گزر جانے پر بھی سیری نہیں ہوئی۔ ناسخ کیا اچھا کہہ گیا ہے۔ ؎

یہ لگی چاٹ مرے زخموں کو سیری نہ ہوئی
ہو گئے کتنے ہی قاتل کے نمک داں خالی

جنوری ۱۹۷۰ء میں کینیا مشرقی افریقہ سے ہندوستان لوٹا اور بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ شاعری سے والہانہ وابستگی تو تھی ہی، تھوڑا سا رُخ تحقیقِ ادب کی طرف بھی پھر گیا اور یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا۔

اس مشغلے کے لیے ذاتی کتب خانے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ ایک ان کتابوں کی نئی خرید کے ڈھیر میں سے ایک کتاب "یوسفِ ہندی قیدِ فرنگ میں" نکل آئی۔ محسن بن شبّیر کی لکھی ہوئی اور ربیع الثّانی ۱۳۵۱ھ میں حیدرآباد کی چھپی ہوئی۔ یہ وہی ایڈیشن تھا جس کا اٹھاون سال پہلے میں نے مطالعہ کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اب کے اسے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا اور غور کرنے پر معلوم ہوا کہ شاعر کے کسی شعر کو سامنے رکھ کر قصّہ گھڑ لینے کی جو روِش ہمارے پُرانے تذکرہ نویسوں اور سوانح نگاروں نے اختیار کر رکھّی تھی وہ آج بھی جاری ہے جیسے کہ محسن بن شبّیر لکھتے ہیں۔ (ص ۱۵)

"رفعِ افکار کے لیے ان (غالب) کو بھی تفریحِ طبع کا کچھ سامان کرنا ضرور تھا۔ دو حرفی (مے) کا استعمال بھی وہ غم غلط کرنے کے لیے کیا کرتے تھے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے"

یہ شعر نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے متن میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اسی سال یا اس سے کچھ

پہلے کہا گیا ہوگا۔ اس وقت مرزا پورے شباب پر تھے، کیا بلحاظِ عمر اور کیا بہ اعتبارِ شاعری، لہٰذا اس شعر سے غم غلط کرنے کا مطلب ہرگز نہیں نکلتا۔ نسخۂ شیرانی میں اس غزل کے دس شعر ہیں، ہر شعر سے رنگِ تغزّل اُمڈا پڑتا ہے۔ دُور دُور تک آلام و افکار کا پتا نہیں۔ یوں بھی یہ مرزا بیدل کے اس شعر کا ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے ؎

مطلبم از مے پرستی تر دماغی ہا نہ بود
یک دو ساغر آب دادم گریۂ مستانہ را[1]

پھر (ص ۴۰) لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ قرض خواہوں نے نالش کی جواب دہی میں طلب ہوئے۔ مفتی صدر الدّین آزردہ کی عدالت تھی۔ جس وقت پیشی میں گئے، یہ شعر پڑھا ؎

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن"

آزردہ[2] ۱۵ر جون ۱۸۴۴ء کو صدر الصّدور مقرر ہوئے تھے۔ اس سے پہلے (شاید ۱۸۲۷ء سے) صدر امین تھے۔ صدر امین کو اب منصف کہتے ہیں اس کی اپنی عدالت نہیں ہوتی لیکن شعر نسخۂ بھوپال (حمیدیہ۔ ۱۸۲۱ء) کے متن میں موجود ہے۔ اس وقت غالب ۲۳۔۲۴ سال سے زیادہ کے نہ تھے۔ واقعہ کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے جیسے شعر بھری عدالت میں فی البدیہہ پڑھا گیا ہو۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ شعر کو

---

[1] معلوم ہوتا ہے بیدل نے بھی یہ مضمون خیّام کی رباعی ہی سے اڑایا ہے ؎

مے خوردنِ من نہ از برائے طرب است ❊ نے بہرِ فساد و ترکِ دین و ادب است
خواہم کہ بے خودی بر آرم نفسے ❊ مے خوردن و مست بودنم زیں سبب است

[2] مفتی صدر الدین آزردہ از پرواز اصلاحی ص ۲۱

سامنے رکھ کر قصہ گھڑ لیا گیا ہے۔ نالش کا واقعہ بھی اس شعر کی تخلیق سے کم از کم ۱۶ سال بعد کا ہے۔ آہنگِ[1] غالب میں درج ہے۔

"جامِ جہاں نما کی ۷ جون ۱۸۴۷ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ میکفرسن صاحب نے جو ایک انگریز شراب فروش تھا، مرزا غالب کے خلاف دعوے دائر کر کے ڈھائی سو روپے کی ڈگری حاصل کر لی۔ جب وہ کسی سے ملنے جا رہے تھے تو عدالت کے چپراسی نے انھیں گرفتار کر لیا اور تھانے میں لے گیا۔ اتفاق سے اس وقت نواب امین الدین خان کو اس کی اطلاع ہو گئی تو انھوں نے فوراً چار سو روپے مع اصل ادا کر کے غالب کو حوالات سے نکلوایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ص ۵۳ پر حالی کے حوالے سے لکھتے ہیں :

"کپڑا اور تمام ضروریات ان کو گھر سے پہنچتی تھیں"

یہاں حالی نے سچ کو چھپایا ہے۔ غالب خود اس بات کی نفی کرتے ہیں ؎

شادم از بند کہ از بندِ معاش آزادم
از کفِ شحنہ رسد جامہ و نانم در بند

یعنی میں اس قید سے خوش ہوں کیونکہ اس نے مجھے قیدِ معاش سے بری کر رکھا ہے۔ اب مجھے روٹی کپڑا داروغۂ جیل پہنچاتا ہے۔ آزاد کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ (ص ۵۴)

"جس دن [غالب] وہاں [قید خانے] سے نکلنے لگے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو کرتا وہیں پھاڑ کر پھینکا اور یہ شعر پڑھا :

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا"

اس اقتباس کا پہلا حصہ بھی درست نہیں ہو سکتا کیوں کہ جیل خانے کے کپڑے واپس کرنے پڑتے ہیں، پھاڑ کر پھینکے نہیں جا سکتے اور شعر والا حصہ تو نرا افسانہ ہے کیونکہ

---

[1] آہنگِ غالب (اشاعت دوم) ستمبر ۱۹۷۱ - ص ۸۷

یہ شعر بھی ۱۸۲۱ء یا اس سے پہلے کا کہا ہوا ہے جبکہ اسیری کا حادثہ مئی ۱۸۴۷ء میں پیش آیا اور جیل سے رہائی غالباً اگست ۱۸۴۷ء میں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ شعر فی البدیہہ نہیں کہا گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ موقع دیکھ کر پڑھ دیا گیا ہوگا مگر شعر واقعے کے لحاظ سے بھی ایسا باموقع نہیں۔ اسے خواہ مخواہ میں اس حادثے سے جوڑ دیا گیا ہے۔ یہ غزل مرزا کی بہترین غزلوں میں سے ہے۔

حبسیۂ[1] غالب' میں ڈاکٹر سید رغیب حسین رقم طراز ہیں :

"دنیا کا شاید ہی کوئی غم ہو جو غالب کے حصے میں نہ آیا ہو۔ بچپن ہی میں سایۂ پدری کا اٹھ جانا، بھائی کی دیوانگی، اولاد سے محرومی، اقتصادی پریشانیوں کا نرغہ، عارف کی ناوقت موت، شریکِ حیات کی مفارقت، دلی کا اجڑنا، بھائی کا مرنا، مختصر یہ کہ غموں کا ایک ہجوم تھا جس میں غالب تمام عمر گھرے رہے ..... انھوں نے خالقِ کائنات سے غموں کا شکوہ کرنے کے بجائے صرف یہ مطالبہ کیا کہ ؎

میری قسمت میں غم، گر، اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

عرض ہے کہ عارف کا انتقال اپریل ۱۸۵۲ء میں ہوا اور اُن کی بیوی کا اُن سے تین چار ماہ پہلے، غالب کی بیگم غالب کی وفات کے ایک سال بعد فوت ہوئیں، دلی ۱۸۵۷ء میں اُجڑی، بھائی (مرزا یوسف) ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو مرے، جبکہ مندرجہ بالا شعر ۱۸۴۷ء کے کچھ ہی عرصے بعد کا فکر کردہ ہے۔ بتائیے اس کا اطلاق ان واقعات پر کیونکر ہو سکتا ہے؟ یوں بھی اگر اس غزل کے باقی تین شعر (کُل چار شعر ہیں) دیکھیے تو ان میں داستانِ غم کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ یہ میر کے اس شعر کی ترقی یافتہ شکل ہے اور ایسے شعر ہر غزل گو کے یہاں پائے جاتے ہیں :

کاش کے دل دو تو ہوتے عشق میں ؎ ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں

---

[1] مطبوعہ ادارۂ فروغِ اردو لکھنؤ فروری ۱۹۷۱ء ص ۵

اس ادھوری غزل کا مقطع بھی میرؔ ہی کے یہاں سے اخذ کیا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ میرؔ کہتے ہیں :

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

مرزاؔ نے اسے یوں کر لیا :

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

اسی مضمون کا ایک شعر قائمؔ کے یہاں بھی ہے :

بعد خط آنے کے اس کے تھا وفا کا احتمال
لیک واں تک عمر نے اپنی وفاداری نہ کی

حالیؔ نے 'یادگارِ غالبؔ' میں 'لطیفے' کے تحت لکھا ہے

" ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے جو نہایت ظریف الطبع تھے اور جن کو چند روز قلعہ دہلی سے تعلق رہا تھا، مرزاؔ سے کسی موقع پر یہ کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آتا اور اسی وقت دو مصرعے خود موزوں کر کے مرزاؔ کے سامنے پڑھے :

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے گل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزاؔ یہ سن کر سخت حیران ہوئے اور کہا : 'حاشا' یہ شعر میرا نہیں ہے ۔ مولوی عبدالقادر نے ازراہِ مزاح کہا میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے اور دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں، آخر مرزاؔ صاحب کو معلوم ہوا کہ مجھ پر اس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمہارے دیوان میں اس قسم کے

اشعار ہوتے ہیں ...."

اس لطیفے سے یہ نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں

(۱) گفتگو مولوی عبدالقادر رامپوری اور غالبؔ کے مابین ہوئی تھی مگر اس کے راوی کا علم نہیں ۔

(۲) مولوی صاحب کو چند روز قلعے سے تعلق رہا تھا ۔ ظاہر ہے کہ غالبؔ سے ملاقات اور گفتگو اسی زمانے میں ہوئی ہوگی ۔

(۳) غالبؔ کا دیوان چھپ چکا تھا جبھی تو مولوی صاحب نے کہا کہ " دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں "۔

مولوی عبدالقادر[1] رامپوری ۱۸۳۸ء میں ضلع مراد آباد میں صدر الصدور تھے ۔ اسی سال ملازمت ترک کر کے دلی آ گئے ۔ وہ رامپور میں پیدا ہوئے، رامپور اور مراد آباد میں تعلیم پائی اور ۱۸۰۹ء میں ضلع مراد آباد ہی میں سرکار کمپنی کے ملازم ہوئے ۔ بقول ڈاکٹر محمد ایوبؔ قادری[2]

"....... ۱۸۱۴ء میں بسلسلۂ ملازمت دہلی پہنچے اور ۱۸۱۵ء میں واپس آ گئے اور ۱۸۱۷ء میں دوبارہ گئے اور ۱۸۱۸ء میں اُن کا تبادلہ اجمیر ہو گیا........"

اجمیر، راجستھان، جبلپور، ناگپور میں بڑے بڑے عہدوں پر ملازم رہے ۔ اخیر مراد آباد میں صدر الصدور مقرر ہوئے ۔

حالیؔ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے، وہ ۱۸۵۴ء میں بعمر ۱۷ سال دلی آئے تھے ۔ ظاہر ہے (۱) کہ حالیؔ نے یہ روایت کسی سے سُنی ہے خود مولوی صاحب نے انھیں نہیں بتائی کیونکہ وہ ۱۸۴۹ء میں فوت ہو چکے تھے ۔ شاید شیفتہؔ اُس کے راوی ہوں ۔

(۲) دلی آنے کے بعد مولوی صاحب ۶ ماہ شاہ ظفرؔ کے پاس رہے ۔ بقول ڈاکٹر محمد ایوبؔ

۱۔ مفتی مولوی عبدالقادر خاں تخلص غمگینؔ متوفی ۱۸۴۹ء ۔ تذکرۂ کاملانِ رامپور ص ۲۳۴

۲۔ غالبؔ اور عصرِ غالبؔ ۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۸۲ء ص ۱۸۹

قادری "بہادر شاہ ظفر کے دربار میں مولوی عبدالقادر تقریباً ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۰ء) میں وکیل مقرر ہوئے"۔ شیفتہ اور غالب کے تعلقات تو تھے ہی۔ معلوم ہوتا ہے شاہ ظفر کی ملازمت کے بعد بھی مولوی صاحب چندے دلّی ہی میں رہے کیونکہ (۳) غالب کا دیوانِ اُردو (پہلا ایڈیشن) ۱۸۴۱ء میں چھپا اور ظاہر ہے یہ بات اُنھی دِنوں کی ہوگی ورنہ وہ دیوان دیکھنے کی بات کیوں کرتے۔

یہ روایت تذکرۂ کاملانِ رام پور میں بھی درج ہے۔ اُس میں لکھا ہے کہ مرزا غالب "گھر آکر دیوان کو دیکھتے ہیں، پریشان ہو کر ایک ایک سے دریافت کرتے ہیں کہ بھائی یہ شعر (پہلے تو روغنِ گل ......) کہاں ہے۔ نواب مصطفٰے خان شیفتہ نے کہا کہ مولوی صاحب نے آپ کے کلام سے ظرافت کی ہے"۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد حالی "یادگارِ غالب" میں لکھتے ہیں:

"مرزا نے اس قسم کی نکتہ چینیوں پر اُردو فارسی دیوان میں جابجا اشارہ کیا ہے۔ اُردو میں ایک جگہ کہتے ہیں ۔

نہ ستایش کی تمنا، نہ صِلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

ایک اور اُردو غزل کا مطلع ہے۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے "

مگر یہ دونوں شعر تو نسخۂ بھوپال (حمیدیہ)، مکتوبہ ۱۸۲۱ء کے متن میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ سن و سال کے لحاظ سے ان کا اطلاق ۲۰ سال بعد کے واقعے پر نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب نے ایسے اشعار اور بھی کہے ہیں۔ جیسے ۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمایش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) ۱۸۲۱ء

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے — مدّعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

۱۸۲۱ء نسخۂ حمیدیہ (حاشیہ)، ۱۸۲۶ء نسخۂ شیرانی (متن)

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ — کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

نسخۂ شیرانی ۱۸۲۶ء

مگر یہ سب کے سب اسی عہد کے ہیں کوئی ۱۸۲۶ء کے بعد کا نہیں۔ اس لیے انھیں ۱۸۴۱ء کے کسی واقعے سے مربوط کر لینا قطعی نادرست ہے۔ ۱۸۲۶ء کا وہ زمانہ ہے جب غالب طرزِ بیدل سے آزاد ہوتے ہیں اور یہی وہ زمانہ ہے جب انھوں نے فارسی میں باقاعدگی سے کہنا شروع کیا مگر چونکہ اس وقت تک وہ بیدل (اور اسیر و شوکت) کی طلسماتی گرفت سے نکل چکے تھے، اس لیے فارسی کلام پر ان کی چیستانی طرز کا اثر نمایاں نہیں ہے۔ اس عہد کے بعد کا اُردو کلام بھی بیشتر اس طرزِ سخن سے پاک ہے۔

جنابِ خورشید الاسلام مکتوبِ غالب بنام علائی سے اقتباس پیش کرتے ہیں[۱]۔

"پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش مرحوم نے ایک زمین نکالی، میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل ۔

پلا دے اوک سے ساقی جو مجھ سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے شراب تو دے "

پھر لکھتے ہیں "یہ خط ۱۸۶۲ء کا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ غزل ۱۸۱۲ء میں لکھی گئی تھی۔ اور اس وقت غالب کی عمر محض ۱۵ سال یا اس سے بھی کم تھی۔ اس قسم کی نشو و نما کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ آدمی پردہ کے رنگ سے خوش یا مطمئن ہو جانے کے بجائے یہ جستجو کرنے لگتا ہے کہ اس کے پیچھے کیا ہے ......"۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ غزل پہلے پہل ۱۸۲۱ء کے مخطوطے کے حاشیے میں ملتی ہے تب غالب کی عمر ۱۵ سال کی نہیں بلکہ ۲۴ سال سے زیادہ کی تھی۔

---

[۱] غالب۔ تقلید اور اجتہاد۔ اشاعتِ سوم ۱۹۷۹ء ص ۲۹

ظاہر ہے کہ غزل ۱۸۲۱ء اور ۱۸۲۶ء کے درمیان کسی وقت بھی کہی گئی تھی ۱۸۱۲ء میں نہیں۔

غالبؔ نے شاہ ظفر کی طرف سے ایک مثنوی، شیعت سے براءت کے مضمون کی ۱۸۵۳/۵۴ء میں کہی تھی۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ غالبؔ بھی اس کی زد میں آ گئے۔ زچ ہو کر سلطان العلماء مولوی سیّد محمدؔ لکھنوی کو لکھتے ہیں :

"اب وقت آگیا ہے کہ غزل کے پردہ میں اپنے عقیدہ کا اظہار کروں تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ کُنجِ ناکامی کے خاک نشیں کے دل میں کیا ہے[1] ...."

اب سوال یہ ہے کہ غالبؔ کی، اس "غزل" سے مراد، کون سی غزل ہے جس میں وہ اپنا دل کھول کر رکھ دینا چاہتے تھے۔ حاشیے میں مہاجر صاحب نے "مشغولِ حق ہوں بندگیِ بُوتراب میں" کے مقطعے والی غزل کو یہ غزل قرار دیتے ہیں، مگر یہ غزل تو دیوانِ غالبؔ مطبوعہ ۱۸۴۷ء کے متن میں موجود ہے گویا ۱۸۴۷ء یا اس سے پہلے کہی گئی تھی — اسے ۱۸۵۳/۵۴ء کی فکر کردہ کیونکر کہا جا سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کا اشارہ اُس غیر متداول ۱۲ شعری سلام کی طرف ہے، جو ۱۸۵۴ء میں کہا گیا تھا اور جس کا مطلع یہ ہے ؎

سلام اسے کہ اگر بادشا کہیں اُس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اُس کو

مندرجہ بالا چند مثالوں سے بخوبی ظاہر ہے کہ جب تک غالبؔ کے تمام کلام کا تاریخی ترتیب سے مطالعہ نہ کیا جائے گا، ہم نتائج اخذ کرنے میں اکثر ٹھوکر کھاتے رہیں گے۔ میں نے اسی مقصد کو رہنما بنا کر اس کام کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ تاریخی ترتیب ہی سے غالبؔ کے سوانحی اور فکری ارتقا کا صحیح تجزیہ ہو سکے گا۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ غالبؔ کے اُردو کلام کے کئی ایک مخطوطے فراہم ہو چکے ہیں۔ جو اُن کے مختلف فکری ادوار کی نشاندہی کرتے ہیں اور پھر مولانا امتیاز علی خاں عرشیؔ مرحوم کا مرتبہ 'دیوانِ غالبؔ' موجود ہے جو کسی نعمتِ عُظمیٰ سے کم نہیں۔

[1] اقتباس از پنج آہنگ' اُردو ترجمہ از مہاجر۔ پاکستان

تعارف

غالبؔ کی زندگی میں ان کا مجموعۂ کلامِ اُردو پانچ بار چھپا۔ اس کا نام انھوں نے دیوانِ غالبؔ رکھا۔ پہلے دو ایڈیشنوں کے سرورق کی عبارت میں 'دیوان' کا لفظ موجود ہے، اگرچہ سرورق پر "دیوانِ غالبؔ" کا عنوان طبع نہیں ہوا ہے، البتہ آخری تین ایڈیشنوں کا عنوان "دیوانِ غالبؔ" ہی ہے جو اُن کے سرورق پر نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اشاعتوں کی تفصیل یہ ہے۔

پہلا ایڈیشن	مطبعِ سیّد الاخبار، دِلّی	اکتوبر ۱۸۴۱ء کل شعر	۱۰۹۶[1]
دوسرا ایڈیشن	مطبعِ دارالسّلام، دِلّی	مئی ۱۸۴۷ء ,, ,,	۱۱۵۸[2]
تیسرا ایڈیشن	مطبعِ احمدی، دِلّی	۲۹ جولائی ۱۸۶۱ء ,, ,,	۱۷۹۶
چوتھا ایڈیشن	مطبعِ نظامی، کانپور	جون ۱۸۶۲ء ,, ,,	۱۸۰۲

[1] اس بحث کے لیے دیکھیے دیوانِ غالبؔ [اکتوبر ۱۸۴۱ء] (عکسی) کا پیش لفظ مطبوعہ ۱۹۸۶ء

[2] ,, ,, ,, ,, ,, [جون ۱۸۶۲ء] (عکسی) کا پیش لفظ مطبوعہ ۱۹۸۷ء

پانچواں ایڈیشن	مطبعِ مفیدِ خلائق، آگرہ	بعد از جون ۱۸۶۳ء	کل شعر ۱۷۹۵

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا، چوتھے ایڈیشن یعنی مطبعِ نظامی کے نسخے میں کلام سب ایڈیشنوں سے زیادہ ہے یعنی اس میں ۱۸۰۲ اشعار ہیں۔ اس کے برعکس جو نسخہ اِس وقت آپ کے مطالعے میں ہے اس کے متن میں ایک مصرعے کی کمی کے ساتھ ۴۱۸۰ شعر پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں وہ چند شعر شامل ہیں جو غالب کے نہیں مگر جن کو غالب نے تضمین کر کے اپنا بنا لیا ہے مگر وہ ۱۷ شعر اور ۶ مصرعے شامل نہیں جو محض غالب کی شوخیِ طبع اور حاضر دماغی کے آئینہ دار ہیں اور کسی ادبی حیثیت سے عاری ہیں۔ تاہم ایسے اشعار کو "غالب کے کچھ ہنگامی مصرعے اور شعر" کے عنوان سے مقدّمے میں شامل کر لیا گیا ہے تاکہ یہ مواد بھی قاری کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہے۔ "دیوانِ غالب کامل"..... پہلے دو ایڈیشنوں کے متن سے مَیں نے ۳۰ اشعار خارج کر کے الگ سے ایک باب "حرفِ نامعتبر" قائم کر دیا ہے جو مقدّمے میں شامل ہے۔ ان اشعار کے بارے میں یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ غالب ہی کے فکر کردہ ہیں۔ اس طرح اب اس ایڈیشن میں صحیح تعدادِ اشعار یوں ہوگی:

متن	۴۱۷۹ شعر	=	۸۳۵۷	مصرعے
ہنگامی مصرعے	— شعر	=	۶	مصرعے
ہنگامی شعر	۱۷ شعر	=	۳۴	مصرعے
"حرفِ نامعتبر"	۳۰ شعر	=	۶۰	مصرعے
میزان	۴۲۲۶ شعر	=	۸۴۵۷	مصرعے

ضخامت اور تعدادِ اشعار کے پیشِ نظر اِسے غالب کے اُردو کلام کا کلیّات کہنا چاہیے مگر میں نے غالب کے مجموعہ کلامِ اُردو کی روایت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس کا نام "دیوانِ غالب" ہی رہنے دیا ہے۔ صرف ایک لفظ 'کامل' کا اضافہ کر دیا ہے یعنی "دیوانِ غالب (کامل)"۔ ظاہر ہے کہ اس میں غالب کے متداول ۱۸۰۲ اشعار بھی

آ گئے ہیں۔

مَیں نے مندرجۂ ذیل درجۂ اوّل کے ۱۹ ماخذوں کی مدد سے غالب کے کلامِ اُردو کے گیارہ ادوار قائم کیے ہیں جو مع تعدادِ اشعار یہ ہیں۔ اسی جدول میں یہ بھی دکھا دیا گیا ہے کہ ہر دَور کے جملہ اشعار میں سے کتنے شعر متداول دیوان کے لیے انتخاب کیے گئے۔ درجۂ دوم کے ماخذ نظر انداز کر دیے ہیں۔

ادوار	کُل اشعار	دیوان کے لیے منتخب اشعار
...... تا ۱۸۱۲ء	۴۴	۴
۱۸۱۳ء تا ۱۸۱۶ء	۱۷۴۰	۳۰۸
۱۸۱۷ء تا ۱۸۲۱ء	۸۰۱	۴۴۱
۱۸۲۲ء تا ۱۸۲۶ء	۱۷۹	۱۵۲
۱۸۲۷ء تا ۱۸۲۸ء	۱۰۰	۹۵
ستمبر ۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۳ء	۸۴	۷۳
۱۸۳۴ء تا ۱۸۴۷ء	۸۹	۸۵
۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۲ء	۴۵۲	۳۹۳
۱۸۵۳ء تا ۱۸۵۶ء	۴۲۹	۲۴۵
مئی ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۲ء	۸۶	۶
۱۸۶۳ء تا ۱۸۶۷ء	۱۷۵	-
میزان	۴۱۷۹	۱۸۰۲

ماخذوں کی تفصیل یہ ہے:

(۱) تذکرۂ عیار الشّعراء (۲) تذکرۂ عمدۂ منتخبہ مطبوعہ (۳) نسخۂ بھوپال بخطِ غالب۔

تین عکسی اشاعتیں، عرشی زادہ، کمال احمد صدیقی، نقوش لاہور (۴) نسخۂ بھوپال مشمولہ نسخۂ حمیدیہ۔ تین مطبوعہ نسخے مرتبہ مفتی محمد انوار الحق۔ چوتھا مطبوعہ نسخہ مرتبہ حمید احمد خاں (۵) نسخۂ شیرانی عکسی اشاعت (۶) گلِ رعنا قلمی اور مطبوعہ (۷) نسخۂ رام پور اوّل یا قدیم (۸) انتخابِ غالب (۹) نسخۂ بدایوں (۱۰) ـ دیوانِ غالب پہلا مطبوعہ ایڈیشن (۱۱) نسخۂ دیسنہ (۱۲) نسخۂ کریم الدین یا نسخۂ کراچی (۱۳) دیوانِ غالب دوسرا مطبوعہ ایڈیشن (۱۴) نسخۂ لاہور (۱۵) نسخۂ رام پور ثانی یا جدید (۱۶) نادرنامۂ غالب مطبعِ نظامی کانپور ۱۲۹۵ھ، فیضِ محمدی لکھنؤ ۱۸۹۲ء، مصری لال پریس ہاتھرس ۱۸۹۶ء (۱۷) دیوانِ غالب تیسرا مطبوعہ ایڈیشن (۱۸) دیوانِ غالب چوتھا مطبوعہ ایڈیشن (۱۹) دیوانِ غالب پانچواں مطبوعہ ایڈیشن ـ

ان میں سے مندرجہ ذیل ۸ ماخذ میں نے نہیں دیکھے۔ اس لیے ان کے لیے کلّی طور پر دیوانِ غالب مرتبہ عرشی (اشاعتِ دوم) سے استفادہ کیا گیا ہے۔ باقی تمام ماخذ میرے کتب خانے کے غالب کلکشن میں موجود ہیں:

(۱) تذکرۂ عیارالشّعرا (۲) نسخۂ رام پور اوّل یا قدیم (۳) انتخابِ غالب (۴) نسخۂ بدایوں (۵) نسخۂ دیسنہ (۶) نسخۂ کریم الدین (۷) نسخۂ لاہور (۸) نسخۂ رام پور ثانی یا جدید۔

کلام کے زمانۂ فکر کے تعیّن کے لیے یہ قاعدہ اختیار کیا گیا ہے کہ اگر کسی ماخذ کی غزل کا ایک شعر بھی کسی قدیم تر ماخذ میں پایا گیا ہے تو اس پوری غزل کو قدیم تر ماخذ میں شامل سمجھا گیا ہے کیونکہ پوری غزل نہ کہی گئی ہو تو بھی اُس کی اساس اسی عہد میں رکھی گئی تھی۔ اسی طرح اگر بعد کے عہد میں کوئی شعر اُسی زمین (قافیہ ردیف اور وزن) میں پایا گیا ہے جس میں پوری غزل قدیم تر ماخذ میں موجود ہے تو اس کو بھی قدیم تر عہد میں کہی ہوئی غزل کی توسیع مان کر قدیم تر ماخذ میں شامل کیا گیا

ہے، مگر ایسے اشعار کی تعداد زیادہ نہیں۔

اگرچہ اوقاف، اعراب، املا اور روایتِ اشعار کے لیے نسخۂ عرشی پیشِ نظر رکھنا ناگزیر تھا تاہم بہت سے مقامات پر اس سے گریز بھی کیا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ اس اختلاف کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

ق (۱۸۲۱ء) اور اس کے بعد کے کلام سے متعلّق اختلافِ نسخ کہیں واضح نہیں کیا گیا کیونکہ یہ کام نسخۂ عرشی میں احسن طریقے سے انجام دیا گیا ہے۔ البتّہ دیوانِ غالب زیرِ مطالعہ کے ۱۷۹۴ اشعار میں سے پہلے ۱۷۸۴ اشعار کا اختلافِ نسخ از سرِ نَو تیّار کر کے درج کر دیا گیا ہے۔ اس کے دو سبب ہیں اوّل یہ کہ یہ اشعار بیشتر نسخۂ دیوانِ غالب بخطِ غالبؔ (خ) مکتوبہ ۱۸۱۶ء سے متعلّق ہیں جس کا اختلافِ نسخ کسی وجہ سے دیوانِ غالب نسخۂ عرشی میں باقاعدہ شامل نہ ہو سکا تھا، دُوم اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ خ کا کلام نسخۂ حمیدیہ (ق) مکتوبہ ۱۸۲۱ء سے یقیناً پہلے کا ہے اور جیسا کہ بعض ناقدوں نے قیاس کیا تھا، جعلی نہیں ہے۔

بہت سے اشعار کے درمیان یا آگے، اور نظموں، قصیدوں قطعوں وغیرہ کے عنوانات کے نیچے 'م' کا نشان بنا دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی پہچان ہے کہ یہ کلام متداول) دیوانِ غالب میں شامل ہے۔ اس نسخے میں حواشی کثرت سے ہیں اور بیشتر حوالوں کے ساتھ ہیں۔ ان حاشیوں میں اگر کوئی عبارت وادین میں بغیر حوالے کے ہے تو اسے دیوانِ غالب نسخۂ عرشی سے ماخوذ سمجھا جائے۔

نسخۂ زیرِ نظر میں غالب کا آج تک کا دریافت شدہ پورا اُردو شعری کلام تاریخی ترتیب سے درج ہے یعنی سب سے پہلے وہ اشعار دیے گئے ہیں جو سب سے پہلے تخلیق ہوئے، اس کے بعد اس کی تخلیقات مابعد۔ چونکہ یہ ممکن نہ تھا کہ ہر نظم یا غزل کی تاریخ فکر معلوم ہو سکے۔ اس لیے 'تاریخی ترتیب' کو (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) عہد کے لحاظ سے بانٹ دیا گیا ہے۔ اسی بات کو دھیان میں رکھتے ہوئے مقدمے کے آخر

میں ایک باب "توقیتِ غالبؔ" کے عنوان سے بڑھا دیا گیا ہے، تاکہ اشعار کے زمانۂ فکر کے ساتھ اگر کوئی صاحب شاعر کی اُس عہد کی نجی سرگرمیوں کا بھی موازنہ کرنا چاہیں تو انہیں کوئی دقّت نہ ہو۔

غالبؔ کے دیوان اُردو کا پہلا ایڈیشن اکتوبر ۱۸۴۱ء میں چھپا لیکن اسے کم از کم ساڑھے آٹھ سال پہلے مرتّب کیا جاچکا تھا۔ یہ دیباچے سے ظاہر ہے جو غالبؔ نے ۱۶ اپریل ۱۸۳۳ء کو تمام کیا تھا۔ اس کی تقریظ جو دیوان کے آخر میں شامل ہے نواب ضیاء الدّین احمد خاں نیّر و رخشاں نے ۱۸۳۸ء / ۱۸۳۹ء میں لکھّی تھی۔ لہٰذا دیباچۂ غالبؔ اور تقریظِ نواب ضیاء الدّین احمد خاں کے درمیانی پانچ سالہ وقفے میں پہلے ایڈیشن کے لیے ترتیب دیے ہوئے دیوان میں اضافے ہوتے رہے جنھیں بآسانی دیوانِ زیرِ مطالعہ میں اپنے مقام پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ دیوانِ غالبؔ کے دوسرے ایڈیشنوں میں بھی غالبؔ کا لکھا ہوا دیباچہ اور نواب ضیاء الدّین احمد خاں کی تقریظ دونوں شامل ہیں۔ صرف چوتھے ایڈیشن مطبعِ نظامی میں تقریظ شامل نہیں۔ اعداد و شمار کے علاوہ تقریظ میں معمولی ترمیم ہوئی ہے مگر دیباچۂ غالبؔ میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی۔ قاری کی دلچسپی کے لیے دیباچہ اور تقریظ پر الگ سے ایک باب قائم کردیا گیا ہے کیونکہ صرف دیباچہ اور تقریظ درج کردینے سے بات پوری نہیں ہوتی تھی۔

اگرچہ اب غالبؔ کا مرتّب کردہ کلامِ اُردو (دیوانِ غالبؔ) اس نسخے میں ضم ہوکر، کتابی شکل میں اپنی علاحدہ حیثیت نہیں رکھتا تا وقتیکہ 'م' کے نشان والے کلام کو از سرِ نو یکجا نہ کیا جائے، پھر بھی اُمیّد ہے کہ غالبؔ کی زندگی میں شائع شدہ دیوانِ غالبؔ کے ایڈیشنوں کے متعلّق معلومات حاصل کرنے میں 'غالبؔ کی زندگی میں دیوانِ غالبؔ کی اشاعت (دیباچہ، تقریظ، خاتمۃ الطبع اور تعدادِ اشعار)' والا باب معاون ثابت ہوگا۔

غالبؔ کا اوّلین اُردو منظوم کلام

۱۸۹۷ء حالیؔ[1] لکھتے ہیں:

"منشی بہاری لال مشتاقؔ[2] کا بیان ہے کہ لالہ کنھیّا لالؔ[3] ایک صاحب آگرے کے رہنے والے جو مرزا صاحب کے ہم عصر تھے، ایک بار دلّی میں آئے اور جب مرزا سے ملے تو اثنائے کلام میں ان کو یاد دلایا کہ جو مثنوی آپ نے پتنگ بازی کے زمانے میں لکھّی تھی، وہ بھی آپ کو یاد ہے؟ انھوں نے انکار کیا۔ لالہ صاحب نے کہا وہ اُردو مثنوی میرے پاس موجود ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے وہ مثنوی مرزا کو لاکر دی اور وہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس کے آخر میں یہ فارسی شعر کسی استاد کا پتنگ کی زبان سے لاحق کردیا تھا ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست ؛ مے کشد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

---

[1] 'یادگارِ غالبؔ' ص ۱۰۷۔ فٹ نوٹ (حالیؔ ۱۸۳۷ء تا یکم جنوری ۱۹۱۵ء)
[2] تلمیذِ غالبؔ۔ (۱۸۳۵ء تا ستمبر ۱۹۰۸ء)
[3] یہ شیو نرائن آرام (۱۰ ستمبر ۱۸۳۳ء تا ۴ ستمبر ۱۸۹۸ء) شاگردِ غالبؔ کے دادا کے چھوٹے بھائی تھے

لالہ صاحب کا بیان تھا کہ مرزا صاحب کی عمر جب کہ یہ مثنوی لکھی تھی آٹھ نو برس کی تھی "۔

قیاس ہے کہ حالیؔ نے غالبؔ کے انتقال کے بعد، شاید اس زمانے سے جب وہ ۱۸۷۵ء میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں فارسی اور عربی کے مدرّسِ اوّل مقرر ہوئے۔ "یادگارِ غالبؔ" کا ڈول ڈالا ہوگا اور انھی ایّام میں بہاری لال مشتاقؔ نے یہ واقعہ انھیں بتایا ہوگا۔ مثنوی یا مشتاقؔ کو یاد نہ رہی ہوگی یا حالیؔ بھول گئے ہوں گے اور آخری فارسی شعر یاد رہ گیا ہوگا۔

۱۹۳۱ء میں بالآخر اڈیٹر سہ ماہی 'اُردو' (اورنگ آباد) کے لوٹ کے ساتھ یہ مثنوی شائع ہوئی[۱] جس میں درج ہے کہ صفدرؔ مرزا پوری مرحوم نے (یہ مثنوی) بھیجی تھی" جو کاغذوں میں پڑی رہ گئی اور اب شائع کی جاتی ہے ......" صفدرؔ مرزا پوری مرحوم نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ اس مثنوی کو "ہمارے محترم بزرگ زاہدؔ (سہارنپوری) مدظلہٗ نے ہماری جدید تالیف 'حسنِ خیال' کے لیے نقل فرما کر" بھیجا .... قیاس ہے کہ "حسنِ خیال[۲]" ۱۹۳۱ء کے بعد چھپی۔ اس لیے یہ بیان وہیں سے لے کر یہاں درج کیا جاتا ہے :

مرزا غالبؔ کو بچپن میں پتنگ اڑانے کا بہت شوق تھا۔ اکبرآباد میں اُن کی پتنگ بازی کا شہرہ تھا۔ اسی زمانے میں مرزا نے پتنگ کے تلازمے میں کسی کے فارسی شعر مندرجۂ ذیل پر بطور ترکیب بند شعر لکھے تھے۔ شعر

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

لیکن وہ ترکیب بند کسی نے نقل نہیں کیا۔ نہ غالباً کسی کو ملا۔ حضرت زاہدؔ کے

---

[۱] سہ ماہی 'اردو' اورنگ آباد۔ شمارہ جولائی ۱۹۳۱ء ص ۵۱۵

[۲] مطبوعہ گیلانی الیکٹرک پریس بک ڈپو اسپتال روڈ لاہور (سنہ اشاعت درج نہیں) ص ۱۰۶

جدّ مرحوم حاجی و زائر سیّد اکبر علی صاحب بلیغ ابوظفر شاہِ آخر دہلی کے معتمد و وکیل تھے اور شاہ کی پنشن کا مقدّمہ جو کمپنی سے لڑا اُس میں اوّل سے آخر تک وکیلِ شاہی کی حیثیت سے اس زمانے میں برابر اکبرآباد میں عدالت العالیہ ہونے کی وجہ سے آتے جاتے رہتے تھے۔ خود بھی ذی علم اور اچھّے شاعر تھے۔ اُن کی بیاض میں یہ ترکیب بند لکھا ہوا ملا۔ جو دلدادگانِ کلامِ غالبؔ کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہے، اگرچہ بچپن کی زبان ہے۔

ترکیب بند

ایک دن مثلِ پتنگِ کاغذی — لے کے دل سر رشتۂ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا — اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
میں کہا اے دل ہوائے دلبراں — بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں
پیچ میں ان کے نہ آنا زینہار — یہ نہیں ہیں گے کسو کے یارِ غار
گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر — کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائے گی تیری ان سے سانٹھ — لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہوگا سلجھانا تجھے — قہر ہے دل ان سے الجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے — بھول مت اس پر اڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں — مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں
دل نے سُن کر کانپ کر کھا پیچ و تاب — غوطے میں جا کر دیا کٹ کر جواب

"رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست"

صفدرؔ مرحوم نے زاہدؔ سہارنپوری مرحوم کی ایک مثنوی بھی نقل کی ہے جس میں اسی فارسی شعر کو تضمین کیا ہے :

جب مدینے میں نہ پایا کچھ بھی چین — گھر کو چھوڑا آئے مکّے میں حسینؑ

دھاں بھی پہنچے گھات میں اہلِ نفاق — تب کیا قصد آپ نے سوے عراق
یہ خیال آیا کہ ہو کر قتلِ عام — ہو نہ ضائع حرمتِ بیت الحرام
الغرض گزرے سفر میں پانچ ماہ — بستیوں میں تھی نہ جنگل میں پناہ
یوں رہے کوہ و بیاباں میں رواں — آج اس منزل پہ ٹھہرے کل وہاں
پوچھتا رستے میں زاہد جب کوئی — ہے کدھر کا قصد اے سبطِ نبیؐ
آپ فرماتے تھے جاتا ہوں اُدھر — حق تعالےٰ کی مشیّت ہے جدھر

"رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست"

صفدرؔ مرحوم کے بیان اور دیوانِ غنیؔ سے معلوم ہوا کہ مُلّا طاہر غنیؔ کشمیری نے بھی اس فارسی بیت کو تضمین کیا ہے[1] :

ہندوے دیدم کہ مستِ عشق بود — گفتمش زین جستجویت چیست سود
در جوابم گفت آن زنّار دار — نیست در دستم عنانِ اختیار

"رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست"

مندرجۂ بالا سے دو باتوں کی تحقیق لازم ہوئی اوّل یہ کہ مثنوی کا عہدِ فکر کیا ہے، دُوم یہ کہ اس فارسی شعر کا جسے تضمین کیا گیا ہے، خالق کون ہے۔

اوّل حالیؔ، بہاری لال مشتاقؔ شاگردِ غالبؔ کی زبانی روایت بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ مثنوی، غالبؔ نے آٹھ نو سال کی عمر میں کہی تھی۔ صفدرؔ مرزاپوری بتاتے ہیں کہ یہ کلام مرزاؔ کے بچپن میں پتنگ اُڑانے کے زمانے کا ہے اور "کہ بچپن کی زبان ہے" اور مثنوی کے مطالعے کے بعد یہ تسلیم کیے ہی

[1] دیوانِ غنیؔ ــ جموّں اینڈ کشمیر اکیڈمی ــــ ۱۹۶۲ء ص ۲۴۸

بنتی ہے۔ مرزاؔ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء[1] کو پیدا ہوئے۔ اب اگر آٹھ نو سال کو دس سال تسلیم کر لیا جائے تو اس کلام کا زمانۂ فکر ۱۸۰۷ء ہوا۔ گویا غالبؔ کا اوّلین اُردو منظوم کلام جو ہم تک پہنچا وہ یہی ہے اور دس سال کی عمر میں یعنی ۱۸۰۷ء کا کہا ہوا ہے۔ مگر یہ درست نہیں معلوم ہوتا۔ آٹھ، نو یا دس سال کی عمر میں

گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر
کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر

کی طرح کے عریاں اشعار فکر کرنا ممکن نہیں۔ غالبؔ کی شادی ۷ رجب ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۹ اگست ۱۸۱۰ء کو ہوئی تھی۔ اس کے بعد بھی وہ دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرنے سے پہلے، آگرے ہی میں رہے تھے۔ شیو نرائن آرامؔ کو لکھتے ہیں (۱۹ اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"ایک کٹرہ "کشمیرن والا" کہلاتا تھا۔ اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اُڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔"[2]

راجا بلوان سنگھ (جن سے پتنگ لڑا کرتے تھے) اپنے والد مہاراجا جیت سنگھ کے گوالیار میں ۲۹ مارچ ۱۸۱۰ء کو فوت ہو جانے کے بعد ہی آگرے آئے تھے۔ اس لیے اس مثنوی کو، شادی کے بعد، ۱۸۱۰ء تا ۱۸۱۲ء کی فکر کردہ کہنا زیادہ قرینِ قیاس ہوگا۔

دُوم ــ رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

حالیؔ (۱۸۹۷ء) اور بہاری لال مشتاقؔ (اس سے بھی کئی برس پہلے) اسے کسی استاد کا شعر بتاتے ہیں۔ صفدرؔ مرزاپوری مرحوم بھی اسے "کسی کا فارسی شعر" کہتے

[1] ولادت ۱۷۹۹ء خُمخانۂ جاوید

[2] غالبؔ ۔ احوال و آثار ــ ڈاکٹر حنیف نقوی ص ۴۱

ہیں۔ غلام رسول مہر[1] اور مولانا عرشی مرحوم بھی شعر کے خالق کے بارے میں خاموش ہیں۔

فرہنگ آنند راج[2] میں رشتہ کے تحت درج ہے۔

"..... وآنکہ درویشاں برمیاں بندند وعیاراں ببام افگنند۔ چنانچہ گفتہ اند

رشتۂ درگردنم افگندہ دوست

می کشد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست"

فرہنگ آنند راج میں یہ حوالہ فرہنگ انجمن آرائے ناصری سے لیا گیا ہے۔ جو ۱۲۸۸ھ (۷۲-۱۸۷۱ء) میں تالیف ہوئی تھی۔ ان دونوں میں بھی شعر کے خالق کا ذکر نہیں۔

اس شعر کا قدیم ترین اندراج جو ابھی تک ہماری نظر سے گزرا ہے وہ یہی غنی کشمیری کے کلام میں ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ غنی کشمیری کا انتقال ۱۶۶۹ء میں ہوا تھا[3]

کئی برس ہوئے جناب مشفق خواجہ (کراچی پاکستان) نے از راہ کرم "ن م۔ راشد ایک مطالعہ" مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی بھجوائی۔ اس کے ص ۲۸۸ پر ن۔ م۔ راشد مرحوم نے اپنے خط، بنام ڈاکٹر جمیل جالبی، مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۷۵ء میں لکھا ہے۔

" درگلویم[4] رشتہ اے افگندہ دوست

می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

یہ رومی کا شعر ہے۔ آج کل نئے سرے سے مثنوی (مولوی معنوی) پڑھ رہا ہوں"۔

---

[1] 'غالب' از مہر۔ چوتھا ایڈیشن مطبوعہ دسمبر ۱۹۴۶ء ص ۵۰۴ حاشیہ

[2] جلد دوم ص ۱۹۶ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۸۹۴ء

[3] پارسی سرایان کشمیر ص ۳۶، تذکرۂ شمع انجمن ص ۳۴۰

[4] ۔ حالی نے مصرع ثانی میں می برد کی جگہ می کشد لکھا ہے۔ فرہنگ آنند راج (انجمن آرائے ناصری) میں بھی می کشد ہی ہے۔ مگر صفدر مرزا پوری مرحوم نے تینوں جگہ می برد لکھا ہے۔ راشد صاحب کا لکھا ہوا " درگلویم رشتہ اے..... " کسی اور جگہ دیکھنے میں نہیں آیا

چلیے، یہ مسئلہ حل ہوگیا۔ تاہم میں نے اپنی تسلی کے لیے مثنوی مولوی معنوی دیکھی اور اس کے چھیوں دفتر راتوں رات چھان مارے مگر یہ شعر کہیں نہ ملا۔ اس قسم کے قوافی تو بہت سے ملے۔ شعر بھی مثنوی مولانا ئے روم[1] ہی کے وزن میں ہے اور اسلوب سے بھی مثنویت ٹپکتی ہے مگر شعر عنقا کی طرح غائب پایا۔ غنی کشمیری کے کلام سے واضح ہے کہ شعر ساڑھے تین سو سال پرانا ضرور ہے۔ تو پھر یہ شعر کس کا ہے؟

مولانا غلام رسول مہر[2] نے اس مثنوی کا ذکر کرتے ہوئے یادگار غالب[3] (ص ۹۷) کا حوالہ دیا ہے اور پوری مثنوی درج کی ہے جبکہ یادگار غالب میں صرف وہ فارسی شعر درج ہے جو مثنوی میں تضمین کیا گیا ہے، مثنوی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مہر مرحوم نے یہ مثنوی، یا رسالہ سہ ماہی اردو اورنگ آباد (جولائی ۱۹۳۱ء ص ۵۱۵) سے لی ہے یا پھر 'حسنِ خیال' (ص ۱۰۶) سے، مگر حوالہ یادگار غالب کا دے دیا ہے اور پھر یہ بھی لکھا ہے کہ

" ایک صاحب حاجی سید اکبر بلیغ سہارنپوری تھے .... انھوں نے ایک بیاض یادگار چھوڑی تھی جس میں یہ مثنوی بھی مرقوم تھی۔ میں اسے تبرکاً یہاں نقل کرتا ہوں ______________"

یہ عبارت تاثر دیتی ہے کہ وہ بیاض جس میں یہ مثنوی مرقوم تھی، مہر مرحوم نے دیکھی تھی اور مثنوی وہاں سے لے کر انھوں نے درج کتاب کی ہے مگر یہ سراسر غلط ہے۔ رسالہ اردو، حسنِ خیال، اور غالب از مہر کی تحریروں سے بخوبی روشن ہے کہ مثنوی اور اس کے دستیاب ہونے کے کوائف مہر مرحوم نے رسالہ اردو یا حسنِ خیال سے نقل کیے ہیں

---

[1] مولانا ئے روم کا انتقال ۷۳-۱۲۷۲ء میں ہونا تسلیم کیا جاتا ہے

[2] 'غالب' طبع چہارم۔ دسمبر ۱۹۴۶ء ص ۹-۵۰۴ حاشیہ

[3] نہ جانے یہ یادگار غالب کے کون سے ایڈیشن کا حوالہ ہے۔ پہلے ایڈیشن میں اسے ص ۷۰ پر دیکھا جا سکتا ہے

نہ کہ اصل بیاض سے۔ اس کے علاوہ مہرؔ مرحوم نے مندرجۂ ذیل تصرفات بھی کیے ہیں جو بغیر حوالے کے ہیں۔

رسالہ اُردو	حُسنِ خیال	غالبؔ از مہرؔ
بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں	بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں	بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں
گو سے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر	ـ ـ ـ ـ ایضاً ـ ـ ـ ـ	ـ ـ ـ ـ نہ ان کے کر نظر
اب تو مل جائے گی ان سے تیری سانٹھ	ـ ـ ـ تیری ان سے سانٹھ ـ ـ ـ	ـ ـ ـ ـ ان سے تیری سانٹھ
ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں	ـ ـ ـ ایضاً ـ ـ ـ	ـ ـ ـ ـ اُڑا دیں گے کہیں

جنابِ عرشیؔ مرحوم نے، مہرؔ مرحوم کی پیروی کرتے ہوئے "بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں" کی جگہ "بس کہ تیرے حق میں رکھتی ہے زباں" لکھا ہے۔ میرے خیال میں چونکہ زاہدؔ سہارنپوری مرحوم نے مثنوی اصل بیاض سے نقل کر کے صفدرؔ مرزاپوری کو بھیجی تھی جو سب سے آخر میں صفدرؔ مرزاپوری کی زیرِ نگرانی ان کی مؤلفہ کتاب 'حُسنِ خیال' میں چھپی، اس لیے تمام متنوں پر 'حُسنِ خیال' ہی کے متن کو ترجیح دینی چاہیے۔ میں نے 'دیوانِ غالبؔ (کامل)' میں اسی متن کو جائز رکھا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ دونوں متنوں میں سے اچھا کون سا لگتا ہے تو اس کا حق ہمیں نہیں پہنچتا۔ مثنوی بچپن میں کہی گئی تھی اس لیے اس میں کھوٹا کھرا چھانٹنا عبث ہے۔

عُمدۂ مُنتخبہ[1] میں ذکرِ غالبؔ

تذکرۂ شعرا موسوم بہ عمدۂ منتخبہ از اعظم الدّولہ میر محمد خاں سرورؔ، غالبؔ کی ابتدائی شاعری کا عہد متعین کرنے کے لیے اہم ترین ماخذ ہے خصوصاً نسخۂ مملوکہ قومی عجائب گھر، کراچی۔ اس کا زمانۂ تصنیف ۱۲۱۵ھ، (۱-۱۸۰۰ء) تا ۱۲۴۷ھ، (۳۲-۱۸۳۱ء) ہے جس میں متن کے علاوہ حاشیوں پر اضافے بھی شامل ہیں۔ متن میں غالبؔ کا ترجمہ اسدؔ کے تحت ہے اور وہ یہ ہے:

> اسدؔ تخلص، میرزا نوشہ۔ اصلش از سمرقند، مولدش مستقر الخلافہ اکبرآباد۔ جوانِ قابل یارباش۔ ہمیشہ بہ خوشش معاشی بسر بُردہ۔ ذوقِ ریختہ گوئی در خاطر متمکن۔ اکثر اشعارش در زمینِ سنگلاخ بہ مضامینِ موزوں گشتہ۔ ردیۂ خیال بندی بیش از بیش پیشِ نہادِ خاطر دارد، از نتائجِ طبع اوست

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے جائزہ مخطوطاتِ اُردو۔ جلد اوّل، ص ۱۰۴۵ تا ۱۰۵۸ از مشفق خواجہ مطبوعہ فروری ۱۹۷۹ء مرکزی اُردو بورڈ لاہور

نہ کہ اصل بیاض سے۔ اس کے علاوہ مہرؔ مرحوم نے مندرجۂ ذیل تصرّفات بھی کیے ہیں جو بغیر حوالے کے ہیں۔

رسالہ اُردو	حُسنِ خیال	غالبؔ از مہرؔ
بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں	بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں	بس کہ تیرے حق میں کھتی ہے زیاں
گو رہے پنڈے پہ نہ کر ان کے نظر	...... ایضاً	...... نہ ان کے کر نظر
اب تو مل جائے گی ان سے تیری سانٹھ	...... تیری ان سے سانٹھ	...... ان سے تیری سانٹھ
ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں	...... ایضاً	...... اُڑا دیں گے کہیں

جنابِ عرشیؔ مرحوم نے، مہرؔ مرحوم کی پیروی کرتے ہوئے "بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں" کی جگہ "بس کہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں" لکھّا ہے۔ میرے خیال میں چونکہ زاہدؔ سہارنپوری مرحوم نے مثنوی اصل بیاض سے نقل کر کے صفدرؔ مرزاپوری کو بھیجی تھی جو سب سے آخر میں صفدرؔ مرزاپوری کی زیرِ نگرانی ان کی مؤلّفہ کتاب 'حُسنِ خیال' میں چھپی، اس لیے تمام متنوں پر 'حُسنِ خیال' ہی کے متن کو ترجیح دینی چاہیے۔ مَیں نے دیوانِ غالبؔ (کامل)، میں اِسی متن کو جائز رکھّا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ دونوں متنوں میں سے اچھّا کون سا لگتا ہے تو اس کا حق ہمیں نہیں پہنچتا۔ مثنوی بچپن میں کہی گئی تھی اس لیے اس میں کھوٹا کھرا چھانٹنا عبث ہے۔

عُمدۂ منتخبہ[1] میں ذکرِ غالبؔ

تذکرۂ شعرا موسوم بہ عمدۂ منتخبہ از اعظم الدّولہ میر محمد خاں سرورؔ، غالبؔ کی ابتدائی شاعری کا عہد متعیّن کرنے کے لیے اہم ترین ماخذ ہے خصوصاً نسخۂ مملوکہ قومی عجائب گھر، کراچی۔ اس کا زمانۂ تصنیف ۱۲۱۵ھ، (۱۔۱۸۰۰ء) تا ۱۲۴۷ھ، (۳۲-۱۸۳۱ء) ہے جس میں متن کے علاوہ حاشیوں پر اضافے بھی شامل ہیں۔ متن میں غالبؔ کا ترجمہ اسدؔ کے تحت ہے اور وہ یہ ہے:

اسدؔ تخلص، میرزا نوشہ۔ اصلش از سمرقند، مولدش مستقر الخلافہ اکبرآباد۔ جوانِ قابل و یارباش۔ ہمیشہ بہ خوشش معاشی بسر بُردہ۔ ذوقِ ریختہ گوئی در خاطرِ متمکن۔ اکثر اشعارش در زمینِ سنگلاخ بہ مضامینِ موزوں گشتہ۔ رتبۂ خیال بندی بیش از بیش نہادِ خاطر دارد، از نتائجِ طبع اوست

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے جائزہ مخطوطاتِ اُردو۔ جلد اوّل، ص ۱۰۴۵ تا ۱۰۵۸ از مشفق خواجہ مطبوعہ فروری ۱۹۷۹ء مرکزی اُردو بورڈ لاہور

۱۔ شمشیرِ صافِ یار جو زہراب دادہ ہو
وہ خطِ سبز ہوکہ بہ رخسارِ سادہ ہو

۲۔ دیکھتا ہوں اسے، تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو

۳۔ آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیانِ اشک
لایا ہے لعلِ بیش بہا، کاروانِ اشک

۴۔ آنسو کہوں کہ، آہ، سوارِ ہوا کہوں
ایسا عناں گسیختہ آیا کہ کیا کہوں

۵ ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
یہ رنگِ زرد ہے چمنِ زعفراں مجھے

۶۔ دیکھ وہ برقِ تبسم، بس کہ دل بےتاب ہے
دیدۂ گریاں مرا، فوارۂ سیماب ہے

۷۔ کھول کر دروازۂ میخانہ بولا مے فروش
اب شکستِ توبہ مے خواروں کو فتح الباب ہے

۸ مجلسِ شعلہ عذاراں میں جو آ جاتا ہوں
شمع ساں میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں

۹۔ ہووے ہے جادۂ رہ، رشتۂ گوہر ہر گام
جس گزرگاہ سے میں آبلہ پا جاتا ہوں

۱۰۔ سرگراں مجھ سے سبک روکئے نہ رہنے سے رہو
کہ بہ یک جنبشِ لب مثلِ صدا جاتا ہوں

اس نسخے کی کتابت کی تکمیل ۲۶ رمضان ۱۲۳۵ھ مطابق ۷ جولائی ۱۸۲۰ء کو ہوئی، گویا اس سے پہلے غالب کا ترجمہ لکھّا جا چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب یہ ترجمہ تحریر ہوا تھا

اس وقت تک سرور، غالب سے ذاتی طور پر واقف نہ تھے گویا غالب دلّی میں ابھی نئے ہوں گے۔ وہ ۱۳-۱۸۱۲ء میں آگرہ سے دلّی آکر مستقل طور پر سکونت پذیر ہوئے تھے۔ سال دو سال اِدھر اُدھر علمی ادبی حلقوں میں جان پہچان میں لگ گئے ہوں گے اور اس طرح شاید ۱۸۱۴ء کے آخر میں اس نسخے کی زینت بنے ہوں گے۔ چنانچہ اوپر کے ان دس اشعار کو ۱۸۱۲ء تک کے فکر کردہ اشعار کہا جا سکتا ہے جب کہ غالب کی عمر ۱۵ سال کی تھی۔

یہ دس اشعار سات غزلوں سے لیے گئے ہیں۔ پانچ غزلوں سے ایک ایک شعر، ایک غزل سے دو شعر اور ایک غزل سے تین شعر۔ پانچ غزلوں میں سے، جن کا صرف ایک ایک شعر ہم تک عمدۂ منتخبہ کے ذریعے سے پہنچا تھا، دو غزلیں مکمل دستیاب ہوگئی ہیں۔ دونوں غزلیں نسخۂ بخطّ غالب (رخ) ۱۸۱۶ء، نسخۂ بھوپال (حمیدیہ۔ق) ۱۸۲۱ء اور نسخۂ شیرانی (فا) ۱۸۲۶ء میں موجود ہیں۔ ہوسکتا ہے ان کے کچھ اشعار بعد میں فکر کیے گئے ہوں تاہم ان کی اساس ۱۸۱۲ء تک پڑ چکی تھی اس لیے غزلوں کی تخلیق کا عہد یہی مانا جائے گا۔ ترمیم و تنسیخ کا عمل فن کار کے یہاں عمر بھر جاری رہ سکتا ہے۔ دونوں غزلوں کے باقی ماندہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔ ایک غزل کے مقطع میں غالب تخلص آیا ہے۔ تب تخلص اسد ہی تھا۔ غالب تخلص کا استعمال ۱۸۱۶ء میں شروع ہوا ۔؎

ظاہر کرے ہے جنبشِ مژگاں سے مدعا
طفلانہ ہاتھ کا ہے اشارہ، زبانِ اشک

میں وادیٔ طلب میں ہوا جملہ تن عرق
از بس کہ صرفِ قطرہ زنی تھا بسانِ اشک

رونے نے طاقت اتنی نہ چھوڑی کہ ایکبار
مژگان کو دوں فشارِ پئے امتحانِ اشک

دل خستگاں کو ہے طربِ صد چمن بہار
باغِ بجوں تپیدن و آبِ روانِ اشک

سیل بنائے ہستیٔ شبنم ہے آفتاب
چھوڑے نہ چشم میں تپشِ دل نشانِ اشک

ہنگامِ انتظارِ قدومِ بتاں، اسد
ہے بر سرِ مژہ نگراں، دیدبانِ اشک

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا
گر اک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں

حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوے دل
ہر تارِ زُلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں

مَیں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے! خدا نہ کردہ، تجھے بے وفا کہوں

اقبالِ کلفتِ دلِ بے مدّعا رسا
اختر کو داغِ سایۂ بالِ ہما کہوں

مضمونِ وصل ہاتھ نہ آیا، مگر اُسے
اب طائرِ پریدۂ رنگِ حنا کہوں

دزدیدنِ دلِ ستم آمادہ ہے محال
مژگاں کہوں کہ جوہرِ تیغِ قضا کہوں

طرز آفرینِ نکتہ سرائیِ طبع ہے
آئینۂ خیال کو طوطی نما کہوں

غالب ہے رتبہ فہم تصوّر سے کچھ پرے
ہے عجزِ بندگی کہ علی کو خدا کہوں

جیسا کہ کہا جا چکا ہے، ۷ جولائی ۱۸۲۰ء کے بعد تذکرے کے حاشیوں میں کثرت سے اضافے کیے گئے اور یہ عمل ۳۲-۱۸۳۱ء تک جاری رہا۔ اس طرح غالب کے ترجمے اور اشعار دونوں میں خاصا اضافہ ہوا۔ اس کی وجہ صرف غالب کی شہرت ہی نہیں تھی بلکہ سرور کی ان سے ذاتی شناسائی بھی تھی[۱]۔ ترجمے میں یہ اضافہ ہوا۔

تخلّص کے بعد: "اسد اللہ خاں عرف"

"یارباش" کے بعد: "و دردمند"

"متمکّن" کے بعد: "تو کردۂ غم ہائے عشقِ مجاز، تربیت یافتۂ غمکدۂ نیاز، درفنِ سخن سنجی متبع محاوراتِ میرزا عبدالقادر بیدل

---

[۱] قاضی عبدالودود مرحوم نے نواب الٰہی بخش معروف کے دیوانِ دوّم (ہنوز غیر مطبوعہ) سے لے کر یہ شعر درج کیا ہے ؎ "لکھ غزل اک اور بھی معروف! سرور کے لیے
آج اسی پر نکتہ فہمی، نکتہ دانی ختم ہے" (معیار۔ پٹنہ، جولائی ۱۹۳۶ء۔ ص ۳۲۵)۔ ممکن ہے سرور سے معروف کی یہ دوستی بھی غالب کے کام آئی ہو۔

علیہ الرحمہ و ریختہ در محاوراتِ فارسی موزوں می کند، بالجملہ موجدِ طرزِ خود ست و باراقم رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد۔"

اشعار میں ۲۲ شعر اور ایک رباعی کا اضافہ ہوا۔ وہ یہ ہیں ؎

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے

پروانے کا یہ غم ہو تو پھر کس لیے اسدؔ
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

جگر سے ٹوٹی ہوئی ہو گئی سناں پیدا
دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

خوباں کے چاہنے کے مَیں قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

نیازِ عشق خرمن سوزِ اسبابِ ہوس بہتر
جو ہو جاوے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط
کی تصوّر نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط

گلشن میں بند و بست بہ ضبطِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسدؔ
خونِ زاہد کو مباح اور مالِ صوفی کو حلال

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بہ سوزِ دل
دردِ جدائیِ اسد اللہ خاں نہ پوچھ

اسدؔ کو بوریے میں دھر کے پھونکا موجِ ہستی نے
فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی

شکلِ طاؤس گرفتار بنایا ہے مجھے
ہوں مَیں وہ دام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے

ماہِ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سُلاتا ہے مجھے

پھر کچھ اس دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

[اس کے بعد اس غزل کے ۱۲ مزید شعر، پھر یہ مقطع]

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

کب سنے ہے وہ کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ خونابہ فشانی میری

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے لوگ
مگر آشفتہ بیانی میری

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

تا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

۳۳
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
ہوتے ہوں ملول اس کو سن کر جاہل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اِن ۳۳ اشعار اور ایک رباعی میں سہ اشعار ایسے ہیں جو سوائے "عمدۂ منتخبہ" کے

کسی اور مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نُسخے میں نہیں پائے جاتے۔ وہ ہیں شعر نمبر (۱) اک گرم آہ کی...... (۲) پروانے کا نہ غم...... (۵) نیازِ عشق خرمن سوز...... (۶) یاد آیا جو وہ کہنا......۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ وہ غزلیں ہیں جو نسخۂ بھوپال بخطِ غالبؔ (۱۸۱۶ء) مرتّب کرتے ہوئے غالبؔ نے خارج کر دیں۔ لہٰذا ان کا زمانۂ فکر بھی ۱۸۱۲ء ہی کے آس پاس ہو گا۔

شعر ۳۔ ۴۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲، نُسخۂ بھوپال بخطِ غالبؔ (۱۸۱۶ء) کے متن میں موجود ہیں اس لیے ان کا زمانۂ فکر زیادہ سے زیادہ ۱۸۱۶ء قرار پایا۔
؎ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا، اس غزل کے چار شعر نُسخۂ بھوپال (حمیدیہ) (۱۸۲۱ء) کے حاشیے پر اور نُسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے متن میں موجود ہیں۔ اس لیے بیش از بیش ۱۸۲۲ء تا ۱۸۲۶ء کی کہی ہوئی ہے۔ ؎ پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے، اس غزل کے تمام شعر (۱۴) نُسخۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) کے آخر میں درج ہیں۔ اس لیے اس کا زمانۂ فکر بھی ۱۸۲۲ء تا ۱۸۲۶ء ہی ہوا۔ ؎ کب سنے ہے وہ کہانی میری، یہ مصرع جو بعد میں ؎ کب وہ سنتا ہے کہانی میری، میں تبدیل ہو گیا، ایک ایسی غزل سے ہے جو نُسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کی لچھمن ریکھا کو پار کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے کل شعر ۹ ہیں جن میں سے ۳ عمدۂ منتخبہ میں لیے گئے۔ یہ غزل نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے حاشیے پر ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ اگرچہ نُسخۂ شیرانی کی کتابت کے بعد کی ہے مگر ۱۸۲۶ء ہی میں کہی گئی ہو گی کیونکہ میری دانست میں عمدۂ منتخبہ میں غالبؔ کے ترجمے کے حواشی اور اشعار کے اضافے نومبر ۱۸۲۶ء تک مکمّل ہو چکے تھے[1]۔ گو اس بات کا امکان ہے کہ تذکرے کے اوراق مزید شاعروں کے تراجم کے اندراج کے لیے چندے اور بھی

---

[1] بہر حال مَیں نے اس غزل کو نُسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے حاشیے پر ہونے کی وجہ سے، ۱۸۲۷ تا ۱۸۲۸ء کے دَور ہی میں رکھّا ہے

کھلے رکھے گئے ہوں۔ ۱۸۲۶ء میں غالبؔ کو دِلّی آئے اور مستقل سکونت اختیار کیے ہوئے ۱۳، ۱۴ برس ہو گئے تھے۔ اس مدت میں سرورؔ مؤلفِ تذکرہ سے (جیسا کہ ترجمے میں بعد کے اضافے سے ثابت ہے) "رابطۂ یک جہتی" بھی مستحکم ہو چکا تھا۔ ایسی حالت میں یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ دسمبر ۱۸۲۶ء میں جب غالبؔ کلکتہ کے دُور دراز سفر پر روانہ ہوئے تو وہ اپنے ترجمے میں کوئی کور کسر چھوڑ گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ ۱۸۲۶ء کے بعد تو دوسرے شاعر اپنا کلام انھیں دیتے تھے تاکہ وہ اپنے دوست نواب سرورؔ سے سفارش کر کے ان کا کلام داخلِ تذکرہ کرا دیں اور یہ بات غالبؔ کے خط بنامِ شیفتہ (مطبوعۂ پنج آہنگ) سے ظاہر ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ قیامِ کلکتہ کے دوران مرزا احمد بیگ خاں تپاںؔ نے انھیں اپنا کلام دیا تھا تاکہ جب وہ دِلّی لوٹیں اور اعظم الدّولہ (نواب سرورؔ مؤلفِ تذکرہ) ان سے ملنے آئیں تو انھیں وہ تپاںؔ کا کلام تذکرے میں درج کرنے کے لیے دیں۔ ایسی حالت میں، اور غالبؔ کے مزاج کو جانتے ہوئے، یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت (۱۸۲۶ء) تک تذکرۂ سرورؔ یعنی عمدۂ منتخبہ میں ان کا ترجمہ کسی طرح بھی ادھورا رہا ہو بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آخری تین غزلیں۔ ؎

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے ۔۔۔ سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
کب سُنتے ہے وہ کہانی میری ۔۔۔ اور پھر وہ بھی زبانی میری
عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ۔۔۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

غالبؔ کی بہترین غزلوں میں سے ہیں اور یقیناً خود غالبؔ کی فراہم کردہ ہیں۔

عمدۂ منتخبہ کے تعلّق سے یہاں تذکرۂ عیار الشّعراء کا کچھ حال بیان کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ تذکرہ عمدۂ منتخبہ سے دو سال پہلے شروع ہوا اور ایک سال بعد تک اس میں مسلسل اضافے ہوتے رہے۔ اس کا زمانۂ تصنیف ۱۲۱۳ھ / ۹۹-۱۷۹۸ء تا ۱۲۴۸ھ / ۳۳-۱۸۳۲ء

تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر اس کا ذکر عمدۂ منتخبہ کے بعد اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اس میں غالبؔ کا ترجمہ اسدؔ کے تحت نہیں بلکہ غالبؔ کے تحت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس میں ترجمۂ غالبؔ، ۱۸۱۶ء یا اس کے بعد داخل کیا گیا کیونکہ غالبؔ تخلّص ۱۸۱۶ء ہی سے استعمال میں آیا۔ ترجمے کے شروع کے الفاظ یہ ہیں: "مرزا اسد اللہ عُرف مرزا نوشہ المتخلّص بہ غالبؔ ......" کل شعر دس ہیں جن میں دو شعر ایسے ہیں جو اور کہیں نہیں پائے جاتے۔ حتّٰی کہ نسخۂ بھوپال بخطِ غالبؔ (۱۸۱۶ء) میں بھی نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شعر غالبؔ کی کسی ابتدائی بیاض کے ہیں جو نسخۂ بھوپال بخطِ غالبؔ میں جگہ نہ پا سکے اور خارج کر دیے گئے۔ لہٰذا انہیں بھی ۱۸۱۲ء ہی کا فکر کردہ کہنا چاہیئے۔ وہ شعر یہ ہیں ؎

زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے ۔۔۔ ایسے ہنستے کو رُلایا ہے کہ جی جانے ہے
صبا، لگا وہ طپانچے طرف سے بلبل کی ۔۔۔ کہ روئے غنچۂ گُل سُوئے آشیاں پھر جائے

مجھے بتایا گیا ہے کہ غیر مطبوعہ تذکرۂ طبقاتِ سُخن میں لکھا ہے کہ خوب چند ذکاؔ مؤلفِ تذکرۂ عیار الشّعرا، نواب سرورؔ مؤلفِ تذکرۂ عمدۂ منتخبہ کے وہاں منشی گیری پر ملازم تھا اور کہ جو کچھ وہ عمدۂ منتخبہ میں درج کرتا تھا وہی گھر جا کر اپنے تذکرے عیار الشّعرا میں شامل کر لیا کرتا تھا۔ یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی اس لیے کہ:

(ا) تذکرہ عیار الشّعرا کی بنیاد عمدۂ منتخبہ سے دو سال پہلے پڑ چکی تھی

(ب) دونوں کے یہاں ترجمۂ اسدؔ (غالبؔ) میں بہت فرق ہے اور دونوں ترجموں میں اشعار اور تعدادِ اشعار بھی ایک سے نہیں

(ج) صاحبِ تذکرۂ عمدۂ منتخبہ نے اپنے یہاں ذکاؔ کا ترجمہ دیا ہے اور لکھا ہے "...... جوانے سلیم الطّبع، مزاجش بہ صلاحیت راغب، کلامش نمکین ...... مشار الیہ ہم تذکرۃ الشّعرا تالیف کردہ۔ در علم اخلاص و دوستی راسخ دریافت گردیدہ ...... (۵۷ شعر)"

یعنی خود صاحبِ تذکرہ (نواب سرورؔ) ذکاؔ کے تذکرے کا ذکر کرتے ہیں اور ذکاؔ کو بہ تحقیق

مخلص اور دوست جانتے ہیں اور کہیں اشارہ تک نہیں کرتے کہ ذکاؔ ان کے پاس ملازم تھا۔

اب ۱۹۹۱ء میں ڈاکٹر نسیم اقتدار علی نے تذکرۂ طبقاتِ سخن (از غلام محی الدّین مبتلاؔ و عشقؔ میرٹھی) شائع کر دیا ہے۔ اس میں ذکاؔ کے ترجمے میں لکھّا ہے :

"از سرکارِ اعظم الدّولہ بہادر است۔ چنانچہ حسب الفرمایشِ نواب موصوف تذکرۂ ہندی ہم تالیف کردہ است۔ . . . ." ص ۱۳۹

یعنی ذکاؔ، اعظم الدّولہ نواب سرورؔ کی ڈیوڑھی سے وابستہ ہیں اور انھوں نے نواب صاحب کی فرمایش پر ایک "تذکرۂ ہندی" بھی تالیف کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ نواب سرورؔ کا اپنا بیان جو اوپر (ج) کے تحت درج ہے زیادہ معتبر ہے۔

استدراک

معیار۔ پٹنہ مئی ۱۹۳۷ء کے شمارے میں قاضی عبدالودود مرحوم نے پہلی بار غالبؔ کے ۱۳ اشعار، جو اس وقت غیر مطبوعہ تھے، "دفترِ ہند لندن" کے نسخۂ تذکرۂ عمدۂ منتخبہ سے لے کر شائع کیے تھے۔ پھر جولائی ۱۹۳۷ء میں ایک مختصر مضمون بھی لکھّا تھا مگر اس وقت قاضی صاحب کے پیشِ نظر دوسرے ماخذ نہ تھے۔ اس لیے یہ ابتدائی مضمون اس قابل نہ تھا کہ اس سے استفادہ کیا جا سکتا ۔ ایک معترض کا جواب دیتے ہوئے پروفیسر عطا الرحمٰن عطاؔ کاکوی میرے مضمون کے بارے میں لکھتے ہیں (ایوانِ اردو۔ دہلی ص ۵۵۔ شمارہ ستمبر ۱۹۸۷ء)

"قاضی صاحب نے لندن والے نسخے کو اس وقت دیکھا جب وہ میدانِ تحقیق میں نئے نئے اُترے تھے۔ اس نسخے کے ترقیمے پر ان کی نظر نہ گئی کہ ۱۲۲۴ھ میں غالبؔ کے ایسے اشعار کس طرح درج ہوئے۔ گیان چند صاحب نے ایک دوسرے نسخے سے اس گتھّی کو بہ حسن و خوبی سلجھایا ہے جو قابلِ داد ہے - - - - - - - - "

حرفِ نامعتبر

"دیوانِ غالبؔ (کامل) تاریخی ترتیب سے" کے پہلے ایڈیشنوں میں بعض اشعار ایسے ہیں جنھیں حتمی طور پر غالبؔ کے فکر کردہ تسلیم کرنے میں مجھے جھجک محسوس ہوتی رہی ہے۔ اب میں نے اُن اشعار کو متن سے الگ کر لیا ہے۔ تاہم مقدّمے میں محفوظ رکھّا ہے تاکہ اگر قاری اُن پر مزید غور کرنا چاہے تو اشعار اس کی نظروں سے اوجھل نہ رہیں۔ روایتیں بیشتر وہی ہیں جو نسخۂ عرشیؔ میں بیان ہوئی ہیں :

(۱) دو رنگیاں یہ زمانے کی، جیتے جی ہیں سب
کہ مُردوں کو نہ بدلتے ہوئے کفن دیکھا

---

(۲) پیری میں بھی کمی نہ ہوئی تاک جھانک کی
روزن کی طرح دید کا آزار رہ گیا

---

(۳) وہ مرغ ہے خزاں کی صحبت سے بے خبر
آیندہ سال تک جو گرفتار رہ گیا

پہلے شعر میں جیتے اور مردوں کے آخری حروف بُری طرح دیتے ہیں۔ ایسے ناپختہ کلام کو غالبؔ سے منسوب کرنا درست نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے دونوں شعر صاف ہیں۔ دیوانِ غالبؔ (صدی ایڈیشن) مرتبہ مالک رام میں یہ اشعار بیاضِ علائی کے حوالے سے نقل کیے گئے ہیں مگر جناب عرشیؔ مرحوم فرماتے ہیں کہ "اس بیاض سے متعلق میری یادداشتوں میں ان شعروں کا حوالہ نہیں"۔

(۴) اُٹھا اک دن بگولا سا جو کچھ میں جوشِ وحشت میں
پھرا آسیمہ سر، گھبرا گیا تھا جی بیاباں سے

(۵) نظر آیا، مجھے اک طائرِ مجروحِ پربستہ
ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے

(۶) کہا میں نے کہ او گمنام، آخر ماجرا کیا ہے ؟
پڑا ہے کام تجھ کو کس ستمگر آفتِ جاں سے

(۷) ہنسا کچھ کھل کھلا کر پہلے، پھر مجھ کو جو پہچانا
تو یہ رویا کہ جُوئے خون بہی پلکوں کے داماں سے

(۸) کہا: "میں صید ہوں اُس کا کہ جس کے دامِ گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائر روز آ کر باغِ رضواں سے

(۹) اُسی کے زُلف و رُخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھ کو
نہ مطلب کُفر سے ہے، اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے"

(۱۰) بچشمِ غور جو دیکھا، مرا ہی طائرِ دل تھا
کہ جل کر، ہو گیا یوں خاک میری آہِ سوزاں سے[۱]

(۱۱) ایک[۲] اہلِ درد نے سُنسان جو دیکھا قفس
یوں کہا "آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب"

(۱۲) بال و پر دو چار دکھلا کر، کہا صیّاد نے
"یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب"

[۱] یہ قطعہ رسالہ مخزن اپریل ۱۹۰۷ء میں اس تمہید کے ساتھ شائع ہوا تھا:
"تھوڑے دن ہوئے میجر سیّد حسن صاحب بلگرامی سے تذکرۂ شعراء ہو رہا تھا جس میں اُنھوں نے غالبؔ کا ایک قطعہ سُنایا۔ قطعے کے عمدہ ہونے میں کیا شک ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ان کے اس بیان نے کہ یہ قطعہ اُن کے والدِ مرحوم سے اُن کو پہنچا اور اب تک غالبؔ کے کسی کلام میں شائع نہیں ہوا، اس کی خوبی زیادہ کر دی۔ میں نے اُن سے لکھ لیا اور اُن کی اجازت سے مخزن کو بھیجتا ہوں۔ شیدا از کیمبرج ...."

مولانا نظامی بدایونی مرحوم نے اپنی شرح دیوانِ غالب ص ۲۴۸ میں اس قطعے اور قطعہ نمبر ۲ کے متعلق لکھا ہے کہ سب سے پہلے ان قطعات کا اضافہ طبع سوم میں اس ریمارک کے ساتھ ہُوا تھا کہ بعض نقّادانِ سخن ان قطعات کے طرزِ بیان کو حضرتِ غالب کے رنگ سے جُداگانہ سمجھتے ہیں۔ اس پر طبع سوم کے ناظرین میں سے بعض اہل الرّائے حضرات نے شکایت کی کہ ان قطعات کو دیوانِ غالب میں جگہ دینا غالب کے کلام کی توہین کرنا ہے۔ ہم نے نواب عماد الملک (میجر سیّد حسن بلگرامی کے بھائی) سے اُن کے متعلق دریافت کیا۔ وہ فرمانے لگے کہ وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ غالب کے مصنّفہ ہیں۔ اُنھوں نے اپنے ایک بزرگ سے سُنے تھے جو اُن کو غالب سے منسوب کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ غالب کا ابتدائی کلام ہو۔

یعنی (۱) شیدا نے ان اشعار کو میجر سیّد حسن بلگرامی سے لیا اور سیّد حسن صاحب کو یہ اُن کے والد صاحب سے پہنچے اور (۲) نظامی بدایونی صاحب کے دریافت کرنے پر سیّد حسن صاحب کے بھائی نے تصدیق کی کہ اُنھوں نے اپنے ایک بزرگ سے (اپنے والدِ مرحوم سے نہیں) سُنا تھا اور اس لیے وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ غالب کے مصنفہ ہیں۔ یہ روایت خاصی ضعیف ہے۔

جناب قاضی عبدالودود نے اپنے مضمون "کتب خانۂ خدابخش اور غالب" مشمولۂ اُردوے معلّٰی، دہلی، 'غالب نمبر' حصّہ دوم، ص ۸۷ میں لکھا ہے کہ

"دیوانِ غالب اُردو کے ان نسخوں میں سے جو غالب کے دورانِ حیات میں طبع ہو چکے تھے یہاں موجود ہیں: نسخۂ مطبع احمدی، مطبعِ نظامی —— مقدّم الذّکر کے یہاں دو نسخے تھے، جن میں سے ایک کا باوجودِ تلاش اس وقت پتا نہ ملا۔ اس کے آخر میں جناب قاسم حسن خان و برادر زادۂ خدابخش خاں مُنتظمِ کُتب خانہ کے قول کے مطابق غالب کا ایک قطعہ ہے جو محمد بخش خاں پدرِ خدابخش خاں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ قطعہ وہی

ہے جو عماد الملک بلگرامی کی روایت پر غالب سے منسوب کیا گیا ہے۔ نیز مخزن میں اس قطعے کو شائع کرنے والے صاحب کا نام شیدا لکھا گیا ہے۔ یہ عبدالحمید خواجہ ہیں۔ جو اُن دنوں کیمبرج میں مقیم تھے ...."

[اب مَیں نے معلوم کر لیا ہے کہ قطعہ ۲ "صداے عندلیب" غالب کے شاگرد مرزا عبدالصمد بیگ فیؔ اکبرآبادی کا ہے (دیکھو دیوانِ اکبر[۱]، ص ۲۱)]

(۱۳) جو حدِ تقویٰ ادا نہ ہووے تو اپنا مذہب یہی ہے غالبؔ
ہوس نہ رہ جائے کوئی باقی، گناہ کیجے تو خوب کیجے

رضا لائبریری، رام پور کے نسخۂ تذکرۂ گلزارِ سخن مؤلّفہ جگن ناتھ فیضؔ کے، جو ۱۹۰۸ء میں نول کشور پریس میں طبع ہُوا ہے، صفحہ ۲۹۷ پر غالب کا تذکرہ ہے۔ اس صفحے کے زیریں حاشیے میں چُنّی لال عاصی نے مطالعہ کرتے وقت غالب کے تحت یہ شعر لکھا ہے۔

(۱۴) اگر ہوتا تو کیا ہوتا، یہ کہیے
نہ ہونے پر ہیں یہ باتیں دہن کی

یہ شعر ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب نے رسالہ اُردوے معلّٰی، دہلی کے غالب نمبر حصّہ دوم ۱۹۶۰ء میں چھاپا ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ میرے ایک بزرگ تھے سیّد عنایت حُسین صاحب جو بھوپال میں ملازم تھے۔ نواب صدیق حسن خاں سے اُن کے خصوصی تعلّقات تھے۔ نواب صاحب کے بھائی سیّد احمد حسن (متوفی ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۱ء) غالب کے شاگرد تھے اور عرشی تخلّص کرتے تھے۔ سیّد عنایت حُسین صاحب نے اپنے منتخب اشعار کی ایک بیاض چھوڑی ہے۔ اس میں پہلے عرشی کا یہ شعر لکھا ہے:

کہیں کچھ ہے، دُعا دو گالیوں کو
بنا لی بات باتوں میں دہن کی

اس کے بعد غالبؔ کا یہ شعر درج کیا ہے "اگر ہوتا..... الخ

(۱۵) نسخۂ سوزشِ دل درخورِ عتاب نہیں
سرِ سودا زدہ، آتش کدۂ تاب نہیں

---

(۱۶) ہمّت و حوصلۂ شورشِ شبنم معلوم
قلزمِ اشک، نمِ دیدۂ خوناب نہیں

---

(۱۷) پُرسشِ عشق سے ہے اُن کو فراغت مقصود
ہدیۂ پارۂ دل، نازشِ جلباب نہیں

---

(۱۸) ہمّت و شوقِ طلب گاریٔ مقصود کہاں
برقِ خرمن زنِ بےتابیٔ سیماب نہیں

---

(۱۹) گلشنِ ہستیٔ عالم ہے دبستانِ نشاط
نقشِ گُل، رونقِ بےمشقِ طلّاب نہیں

اس غزل کا پہلا اور تیسرا شعر سب سے پہلے رسالۂ "الناظر" لکھنؤ بابت مارچ ۱۹۲۹ء میں اس تمہید کے ساتھ شائع ہوا تھا:

"مولوی عبدالرزّاق صاحب ایڈیٹر رسالۂ تحفہ، حیدرآباد دکن، مؤلف کلیاتِ اقبال نے عرصہ ہوا ازراہِ کرم الناظر میں شائع ہونے کے لیے اشعارِ بالا ارسال فرمائے تھے اور ان کے متعلق اپنے گرامی نامے میں تحریر فرمایا تھا کہ یہ شعر بھوپال کے مطبوعہ نسخے

میں نہیں ہیں اور نہ کہیں چھپے ہیں۔ میرے کتب خانے میں دیوانِ غالبؔ کے مختلف نسخے ہیں، ایک نسخہ نول کشور کا مطبوعہ ہے۔ اس کے حاشیے پر اشعارِ بالا اس تقریب کے ساتھ کسی صاحب نے لکھے ہیں کہ مرزا غالبؔ کے قلمی دیوان سے یہ غزل نقل کی گئی۔ دو شعروں کے علاوہ غزل کے اور شعر بھی ہیں، لیکن بےدرد جلدساز نے حاشیہ کاٹ دیا ہے، جس کے سبب سے بعض مصرعے بالکل کٹ گئے ہیں اور بعض پڑھے نہیں جاتے کہیں اور پتا چلے، تو بقیہ اشعار بھی ارسال کر دوں گا۔

بعد ازاں یہ شعر 'ماہِ نو' فروری ۱۹۵۳ء میں مع چند اضافوں کے اس تمہید کے ساتھ چھپے۔

"پچھلے صفحے پر غالبؔ کی جو مبینہ غزل درج ہے، ہمیں جناب ناظر عالم نے حیدرآباد دکن سے ارسال کی ہے۔ موصوف نے اس سلسلے میں ایک خط بھی لکھا ہے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کس حد تک مستند ہے۔ خط میں ناظر عالم صاحب نے اس غزل کی دریافت اور ضائع شدہ حصّوں کے بارے میں عبدالرزّاق راشدؔ صاحب کا یہ بیان نقل کیا ہے۔

موصوف نے کہا کہ "میاں داد سیّاح شاگردِ مرزا غالبؔ کے ایک رشتے دار ظفریاب خاں ریاستِ حیدرآباد کے صیغۂ تعمیرات میں ملازم تھے۔ آج سے ۴۰، ۴۲ سال پہلے 'رسالۂ ادیب' نکالتے تھے۔ خان موصوف کے کتب خانے میں ایک مجلّد کتاب ملی، جس کے اندر 'دیوانِ غالبؔ' اور 'دیوانِ ذوقؔ' کے علاوہ ناسخؔ، آتشؔ، آبادؔ کا کلام تھا۔ 'دیوانِ غالبؔ' کے ایک حاشیے پر "غزلِ غیر مطبوعۂ غالبؔ دہلوی" عنوان سے ۹ شعر لکھے تھے مگر کسی بےدرد جلدساز نے جلد بناتے وقت حاشیے کا ایک حصّہ اس بُری طرح کتر دیا تھا کہ چار مصرعے کٹ گئے جو اشعار اور مصرعے باقی تھے، اُن کی نقل کر لی گئی۔ اس تحقیق کے لیے کہ یہ کلام میرزا غالبؔ ہی کا ہے، ظفریاب خاں ایڈیٹر "ادیب" سے رجوع کیا گیا، خاں صاحب موصوف نے اثبات میں جواب دیا اور کہا کہ 'غالبؔ کے سوا ایسے شعر اور کون تصنیف کر سکتا ہے......'

تحقیق کا دوسرا ذریعہ یہ تھا کہ حضرت استاذی علّامہ نظم طباطبائی شارحِ غالبؔ

سے رجوع کیا جائے۔ موصوف نے غزل دیکھ کر فرمایا کہ یہ یقینی مرزا غالبؔ کا کلام معلوم ہوتا ہے"۔
جو چار شعر جلد ساز کی غلطی سے کٹ گئے تھے، اُن کے مصرعِ ہائے ثانی یہ ہیں ؎

شبِ تاریک، خیالِ دلِ مہتاب نہیں

شمع یہ، زیب دہِ مجلسِ احباب نہیں

تارِ تمکین، حریفِ سرِ مضراب نہیں

غم ہی ایک چیز ہے دنیا میں جو کمیاب نہیں

جب تک پہلے مصرعے نہ مل جائیں ان مصرعوں کو متن سے خارج کر دینا ہی مناسب ہوگا۔
لیکن اس کلام کو معتبر سمجھنے سے پہلے جناب عرشیؔ مرحوم کا یہ بیان مطالعہ کر لینا ضروری ہے جو اُنھوں نے دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشیؔ، اشاعتِ دوّم کے ص ۵۲۲ پر درج کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"تمکینؔ کاظمی مرحوم نے مجھے لکھّا تھا کہ ناظرِ عالم نام کی کسی ہستی کا خارج میں وجود نہیں اور اس پردے میں خود عبدالرزاق حیدرآبادی جلوہ فرما ہیں۔ اس اطّلاع نے غزل اور اس سے متعلق روایت کو ناقابلِ اعتبار بنا دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

(۲۰) اس قدر ضبط کہاں ہے کبھی آ بھی نہ سکوں
ستم اتنا تو نہ کیجے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں

(۲۱) لگ گئی آگ اگر گھر کو تو اندیشہ کیا
شعلۂ دل تو نہیں ہے کہ بُجھا بھی نہ سکوں

(۲۲) تم نہ آؤ گے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں
موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بُلا بھی نہ سکوں

(۲۳) ہنس کے بُلوائیے مٹ جائے گا سب دل کا گلہ
کیا تصوّر ہے تمھارا کہ مٹا بھی نہ سکوں

اس غزل کے سلسلے میں مولانا حامد حسن قادری مرحوم نے بہت دلچسپ اطّلاع بہم پہنچائی ہے۔ اپنے مکتوب بنامِ حیرت شملوی مرحوم میں رقم طراز ہیں: "میرے پاس بزرگوں کے وقت کا 'دیوانِ غالبؔ' ہے، مطبوعہ ۱۸۶۳ء جو مطبعِ مفیدِ خلائق، آگرہ میں منشی شیو نراین کے اہتمام سے چھپا تھا۔ اس میں میرے والدِ مرحوم کے قلم سے (نیرنگ میں لکھّا ہے کہ ان اشعار کے کاتب و ناقل دونوں صادق علی صاحب ہیں۔ عرشی) دو شعر یہ لکھّے ہوئے ہیں، جو کسی مطبوعہ دیوان میں نہیں ملتے: لگ گئی آگ ۔۔۔ الخ، تم نہ آؤ گے تو ۔۔۔ الخ۔ غزل کے تین مطبوعہ شعر ہر دیوان میں موجود ہیں۔ میں نے غالباً ۱۹۳۰ء (صحیح خاص نمبر جنوری ۱۹۲۸ء ہے۔ عرشی) میں عزیز اللہ خاں رام پوری مرحوم کے رسالہ نیرنگ میں ان اشعار کے متعلق ایک مختصر مضمون چھپوایا تھا۔ اس میں لکھّا تھا:

"ان اشعار کے ناقل مولوی صادق علی تاباںؔ، ساکن گڑھ مکتیشر ضلع میرٹھ، انسپکٹر محکمۂ نمک ہیں۔ مولوی صاحب غالبؔ کے زمانے کے بزرگ تھے۔ غالبؔ سے چند بار ملے تھے۔ خود اچھّے شاعر اور عُمدہ سُخن سنج تھے۔ گورنمنٹ سے سالہا سال پنشن لے کر ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔ میری تحقیق کے مطابق اس بات کا قوی قرینہ ہے کہ مولوی صاحب نے خود غالبؔ سے یا اُسی زمانے کے کسی شخص نے یہ اشعار نقل کیے ہیں۔ ممکن ہے کہ غالبؔ نے دیوان کی طباعتِ آخری کے بعد یہ شعر کہے ہوں۔ دونوں شعر بالکل اُسی رنبے کے ہیں

جیسے پہلے تین شعر ہیں، اَور ایسے نہیں ہیں کہ پانچوں شعر ایک ساتھ کہنے کے بعد
غالبؔ کاٹ دیتے اور پہلے تین شعر باقی رکھتے۔ اب نقّادانِ غالبؔ فیصلہ کریں
اَور اس اضافے سے لطف اندوز ہوں۔"

اس کے ایک عرصے کے بعد مَیں نے یہی مضمون دوسری طرح لکھ کر "رسالۂ سب رس" حیدرآباد دکن، بابت مارچ ۱۹۴۲ء میں چھپوایا تھا۔ 'سب رس' والا مضمون مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی کی نظر سے گذرا، تو اُنھوں نے مجھے لکھا:

"ان میں سے ایک شعر کوئی تیس سال قبل سُنا ہُوا، میرے حافظے میں ان الفاظ میں ہے :

تم نہ آؤ گے، تو مرنے کی سَو راہیں ہیں
موت کچھ تُم تو نہیں ہو کہ بُلا بھی نہ سکوں

ایک یہ بھی اچھّی طرح یاد ہے کہ اُس وقت یہ شعر مَیں نے جالبؔ کی جانب منسوب سُنا تھا۔ سیّد جالبؔ دہلوی سے تو آپ واقف ہوں گے۔ 'ہمدم' لکھنؤ، کے ایڈیٹر، حالیؔ کے شاگرد اور اس طرح غالبؔ کے شاگرد در شاگرد۔
آپ کی اطلاع اَور تحقیقِ مزید کے لیے لکھ رہا ہوں - - - - - - - -"

اس کے بعد مجھے مزید تحقیق کا موقع نہیں ملا کہ سیّد جالبؔ کے کلام میں تلاش کرتا، یا اُن کے دوستوں سے پوچھتا۔ اب یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرا شعر بھی جالبؔ ہی کا ہو۔ عبدالماجد صاحب نے ایک سُنا، ایک نہ سُنا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شعر میں غالبؔ وجالبؔ کو توارد ہو گیا ہو۔ اس لیے یہ قافیہ سوچتے وقت جب "بُلا بھی نہ سکوں" ذہن میں آئے گا، تو ایسی دو ہی چیزیں ہیں موت اور دوست، اس لیے یہ مصرع تو بنا رکھا ہے: "موت کچھ تُم تو نہیں ہو کہ بُلا بھی نہ سکوں"۔ اب پہلے مصرع میں وہی بات کہنے کی تھی جو دونوں نے کہی لیکن اپنے اپنے الفاظ میں کہی۔ میرے خیال میں غالبؔ کی یہ زبان نہیں ہے، "مرنے کی سَو راہیں ہیں"۔
بہرحال اب آپ جانیں اور عرشیؔ صاحب جانیں۔ میرا سلام کہیے گا۔"

مولانا حامد حسن قادری کے اس بیان کے علاوہ ایک اَور شہادت بھی ہمارے سامنے ہے۔ اس سے جہاں اس خیال کو تقویّت پہنچتی ہے کہ زیرِ بحث اشعار غالبؔ ہی کے ہیں، وہاں مطلع اَور شعر "ہنس کے بلوایئے۔۔" الخ مزید دریافت ہوئے ہیں۔

کلیاتِ اقبال کے مرتّب عبدالرزّاق راشدؔ حیدرآبادی مرحوم نے رسالۂ "تحفۂ حیدرآباد" کی جلد ۶ شمارہ ۸، ۹ بابت شعبان، رمضان ۱۳۴۴ھ میں ایک نوٹ کے ساتھ یہ مکمّل غزل شایع فرمائی تھی۔ اُنھوں نے اس کے متعلّق جو معلومات "کلامِ غالبؔ غیر مطبوعہ" کے زیرِ عنوان درج کی تھیں، اُنھیں یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"میرزا غالبؔ کا یہ کلام جسے ہم ذیل میں تبرکاً درج کرتے ہیں ہمیں اُن کے ایک شاگرد قاضی عنایت حُسین مرحوم کی بیاض سے دستیاب ہُوا ہے۔ مولانا حسرتؔ موہانی اپنے مرتبہ دیوان میں غالبؔ کے شاگردوں کا ذکر کرتے ہیں، لیکن قاضی مرحوم کا نام نہیں لیتے۔ شعراء کے تذکروں میں بھی جو ہماری نظر سے گذرے ہیں اُن کے حالات کا پتہ نہیں چلتا۔ ہم اپنی معلومات کی بنیاد پر چند باتیں یہاں بیان کرتے ہیں۔

خاندان بنی حمُید کے ایک بزرگ علی نقی الدّین کے بیٹے قاضی عنایت حُسین مرحوم بدایوں کے رہنے والے تھے۔ رشکیؔ تخلّص کرتے تھے۔ اچھّے خاصے شعر کہتے تھے۔ ملازمت کے تعلّق سے ہندوستان کے مختلف شہروں میں قیام کیا۔ کُچھ عرصے تک ریاست ٹونک میں ملازم رہے۔ اسی مقام پر مرزا غالبؔ سے تلمّذ اختیار کیا۔ (مرزا صاحب کا سفرِ ٹونک محلِّ نظر ہے۔ عرشیؔ) جبکہ والیِ ٹونک کی خواہش پر اُن سے ایک دو دفعہ ملنے گئے تھے۔ ۱۸۸۳ء میں حیدرآباد آئے اور ۱۹۰۸ء تک یہیں مقیم رہ کر رودِ موسیٰ کی مشہور طغیانی کے زمانے میں وطنِ مالوف چلے گئے، مگر وہاں ان کا جی نہ لگا۔ ۱۹۱۲ء میں پھر عازمِ دکن ہوئے، دکن پہنچ کر جام باغ کے محلّے میں سکونت اختیار کی۔ ۱۹۱۸ء میں قضا ان کو

ہندوستان کھینچ لے گئی۔ وہیں پیوندِ خاک ہوئے اور ایک اگلے وقتوں کی صورت مٹ گئی۔

اس امر کی نسبت کہ ذیل کے شعر غالبؔ کے ہیں، ہم نے علّامہ سیّد علی حیدر نظم طباطبائی نواب حیدر نواز جنگ سے (جن کی غالب شناسی بہت مشہور ہے اور جن کے دیوانِ غالبؔ کی شرح لکھنے کے بعد غالبؔ پر سے مہمل گوئی کا الزام اُٹھا) تحقیق چاہی، اور دیگر صاحبانِ ذوق سے بھی استفسار کیا۔

یہ سب اصحاب علّامہ طباطبائی کے اس جواب سے اتّفاق کرتے ہیں کہ "بیاضِ رشکیؔ میں سے تین شعر (صحیح: چار۔ عرشی) جو مرزا غالبؔ کے نام سے لکھّے ہوئے ہیں، یہ مجھے بھی بلاشبہ غالبؔ کا کلام معلوم ہوتا ہے۔" خود ہماری نظر جہاں تک کام دیتی ہے، ہم اس کو غالبؔ ہی کا کلام سمجھتے ہیں۔ اگر کسی صاحب کو اس میں شک و شبہ ہو تو اُمیّد ہے کہ وہ معقول وجوہ و دلائل کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار فرمائیں گے۔

رشکیؔ کی بیاض میں یہ غیر مطبوعہ کلام جس طرح لکھّا ہوا ہے ہم اس کو بجنسہٖ یہاں نقل کرتے ہیں۔"

اس نوٹ کے بعد یہ ایک سطر بھی رسالۂ "تحفہ" میں غزل سے پہلے درج ہے جو بیاضِ مذکورہ ہی سے نقل ہوئی ہے کہ :

"یہ غزل مرزا صاحب پوری، دیوان میں طبع نہیں ہوئی ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ "بیاض میں اندراج کرنے والے کو اس بات کا علم تھا کہ اس غزل کے تین شعر پہلے سے دیوانِ غالبؔ میں موجود ہیں اور یہ کہ ابھی تک یہ مکمّل شکل میں کہیں شائع نہیں ہوئی ہے۔

ان سارے بیانات کے پیشِ نظر یہ بات قابلِ تحقیق ہو جاتی ہے کہ نو دریافت شعر بھی غالبؔ ہی کے ہیں اور اُن کا انتساب غالبؔ یا کسی دوسرے شخص کی طرف صحیح ہے

یا غلط۔"

(۲۴) وصل میں ہجر کا ڈر یاد آیا
عینِ جنّت میں سقر یاد آیا

---

(۲۵) مزہ تو جب ہے کہ اے آہِ نارسا، ہم سے
وہ خود کہے کہ "بتا تیری آرزو کیا ہے؟"

---

(۲۶) حالت ترے عاشق کی یہ اب آن بنی ہے
اعضا شکنی ہو چکی، اب جاں شکنی ہے

---

(۲۷) گھر سے نکالنا ہے اگر، ہاں نکال لیے
ناحق کی حُجّتیں نہ مری جاں، نکال لیے

---

(۲۸) لیں بوسہ، یا مصیبتِ ہجراں بیاں کریں
اِک مُنہ ہے، کون کون سے ارماں نکال لیے

---

(۲۹) جو معشوق زلفِ دوتا باندھتے ہیں
مرے سر سے کالی بلا باندھتے ہیں

قاضی معراج دھولپوری مرحوم کے پاس 'باغِ مہر' نام کی ایک کتاب محفوظ تھی۔ جسے میر مہر علی اکبرآبادی نے ۷ صفر ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۵ اگست ۱۸۶۱ء روز پنجشنبہ کو تمام کیا تھا۔ اس میں اشعارِ متفرّق کے تحت "مرزا نوشہ" کے نام سے بھی شعر درج تھے۔ یہ

شعر (۲۴ تا ۲۹) اُنھی یں کے ہیں۔ یہ اشعار قاضی صاحب نے تبرکاتِ غالبؔ کے عنوان سے 'ہماری زبان' کے شمارہ ۸ اگست ۱۹۶۱ء میں شایع کرائے تھے۔

(۳۰) نتیجہ اپنی آہوں کا ہے تشکل مستوی پورا
ہیولیٰ صورتِ کابوس پھر خوابِ گراں کیوں ہو

یہ شعر فاضل زیدی صاحب نے رسالۂ طوفان، نواب شاہ کے شمارہ جولائی ۱۹۵۱ء میں اس تمہید کے ساتھ شائع کیا تھا:

"سید احمد حسین میکشؔ شاگردِ غالبؔ جو بعدِ غدر بے جرم و خطا انگریز کے عتاب کا نشانہ بنے، غدر سے قبل کچھ دنوں پاٹودی میں مقیم رہے ہیں۔ میر اُمید علی، رئیس شاہ پور (پاٹودی) اور اُن کے درمیان رشتۂ اخلاص و محبت تھا اور اُنھی کی کشش اُن کو پاٹودی کھینچ لائی تھی۔ میکشؔ نے اپنے استاد کی مشہور غزل (سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں) اور (کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو) میر صاحب کو بطورِ تحفہ نقل کر کے دی تھیں جو ان کے صاحبزادے حکیم حبیب حسین کی ملکیت رہیں اور اب حکیم مرحوم کے لواحقین کے پاس ہیں۔ آخر الذکر غزل میں مروّجہ غزل سے ایک شعر زائد ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ نے یہ شعر بعد میں غزل سے خارج کر دیا۔ میکشؔ کو یہ اتفاقاً زبانی یاد تھا۔ اس لیے انھوں نے لکھ دیا اور محفوظ رہ گیا۔"

غالبؔ کے بعض غیر مُتداول اُردو اَشعار کا زمانۂ فکر

جناب امتیاز علی خاں عرشیؔ مرحوم نے دیوانِ غالبؔ کچھ اس طرح مدوّن کیا ہے کہ اب اس کے مطالعے سے غالبؔ کے کلام کا عہدِ تخلیق بھی، ماخذوں کی مفصّل نشاندہی کے سبب سے، ایک حد تک متعیّن کیا جا سکتا ہے تاہم بعض اشعار ایسے ہیں جن کا عہد معلوم نہیں ہو سکا۔ میں نے ذیل میں ایسے ہی اشعار کا زمانۂ فکر متعیّن کرنے کی کوشش کی ہے۔ روایتیں بیشتر وہی ہیں جو نسخۂ عرشیؔ میں بیان ہوئی ہیں۔ مگر کوشش کی گئی ہے کہ اصل ماخذوں کو بنظرِ خود دیکھ لیا جائے اور اگر ہو سکے تو اپنے کتب خانے سے ان کو مزید تقویت پہنچائی جائے تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔ اس کے بعد نتائج کے لیے میں نے ماخذوں اور اپنے فہم ہی پر بھروسا کیا ہے۔ پہلے غالبؔ کے اشعار درج کیے گئے ہیں اور بعد میں اشعار کے زمانۂ فکر کے تعین کی کوشش میں اپنے معروضات۔

(۱) خوشی جینے کی کیا، مرنے کا غم کیا
ہماری زندگی کیا، اور ہم کیا

یہ شعر مکتوباتِ امیرؔ مینائی مرتّبۂ مولوی احسن اللہ خان ثاقبؔ صفحہ ۱۲۱ کے حاشیے سے ماخوذ ہے۔ ثاقبؔ نے نواب یوسف علی خاں بہادر ناظمؔ کے بارے میں متن میں لکھّا ہے "نواب ناظمؔ کا پہلا دیوان جو عرصہ ہوا چھپا تھا اور اب کمیاب ہے مرزا غالبؔ کا دیکھا ہوا ہے۔"
حاشیے میں لکھّا ہے " خاکسار کو جولائی ۱۹۰۸ء میں خوابیدگانِ تربت گاہِ تقدّس کی توجّہ اور (رباعی[1])

فرخندہ جہانِ بے مثالی — ممدوحِ ادانی واعالی
پیرایۂ صدق و مایۂ فضل — شمس العلماء جنابِ حالیؔ

کا اشتیاقِ زیارت پانی پت لے گیا۔ میں ایک روز یہ مسوّدہ اُن کو سُنا رہا تھا۔ جب اس مقام پر پہنچا تو مولانا نے فرمایا کہ نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہؔ فرماتے تھے کہ ایک روز مرزا غالبؔ نے مجھے یہ مطلع سُنایا۔ میں نے بہت تعریف کی، تو فرمایا کہ بھتیا، میں تو یہ شعر ناظمؔ کو دے چکا، مطلع خوشی[2] جینے کی... الخ"۔ اس کے قطعِ نظر کہ یہ شعر دیوانِ ناظمؔ (نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور) میں شامل نہیں یہ کوئی ایسی تخلیق نہیں جس پر شیفتہؔ یا غالبؔ سر دُھنتے۔ نواب رام پور (ناظمؔ) ۱۸۶۵ء میں فوت ہوئے۔ اس لیے شعر یقیناً اُس سے پہلے کا ہے۔
دیوانِ ناظمؔ مطبوعہ ۱۲۷۸ھ ص ۲۱۶ پر سلام کے مقطع کا پہلا مصرع دیکھیے ؎
"ہم کیا ہیں ناظمؔ اور ہمارا اسلام کیا"
شعر سے اس کا کوئی تعلّق نہیں لیکن اس مصرع کا اسلوب وہی ہے جو شعر کے مصرع ثانی کا ہے۔

---

[1] اگرچہ ثاقبؔ مرحوم نے رباعی لکھّا ہے تاہم وزن کی رُو سے قطعہ ہے۔
[2] دیوانِ حالیؔ مطبوعہ ۱۸۹۳ء کے حصّۂ مقدّمہ کے ص ۱۷ پر بھی حالیؔ نے اس شعر کو مرزا غالبؔ ہی سے منسوب کیا ہے

(۲) مسلمانوں کے میلوں کا ہوا قُل
سُنیے ہیں جوگ مایا اور دیبیؔ
نشان باقی نہیں ہے سلطنت کا
مگر ہاں، نام کو اورنگ زیبی

دیبیؔ سے مراد کالی دیوی ہے۔ جس کی پوجا ہزاروں برسوں سے ہو رہی ہے۔ دِلّی میں اس دیوی کا مندر ۹ میل دور تغلق آباد کی طرف ہے۔ جوگ مایا کا مندر مہرولی میں ہے جہاں ہفتہ وار میلہ لگتا ہے۔ مہرولی ہی میں ساون میں پھول والوں کی سیر کے نام سے حضرت خواجہ قطب الدّین بختیار کاکیؒ کے مزار پر میلا لگتا تھا اور اب بھی لگتا ہے۔ ظاہر ہے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جب مُغلیہ سلطنت کا نام و نشان مٹ گیا تو اس میلے کو شاہی سرپرستی حاصل نہ رہی۔ اس لیے یہ میلا اُس جوش سے جاری نہ رہا مگر اسے ہندوؤں نے سہارا دیا اور خواجہ صاحب کے مزار کے ساتھ اُنھوں نے اپنی توجّہ جوگ مایا کے مندر کی طرف مبذول کر لی چنانچہ سیّد احمد دہلوی (پھول والوں کی سیر، فرہنگِ آصفیہ جلد اوّل) لکھتے ہیں" غدر کے بعد سے اس میلے نے اور بھی ترقی کی یعنی خاصانِ ہنود کی طرف سے بُدھ کے روز جوگ مایا پر ایسے ہی دھوم دھڑّکے سے پنکھا چڑھنا شروع ہو گیا۔ سات سات اور نو نو پنکھے آگے پیچھے ہوتے ہیں..." یہ قطعہ اسی عہد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس لیے اس کا زمانۂ فکر ۱۸۵۹ء کے قریب یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد کبھی ہو سکتا ہے۔

(۳) ہم نشیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خاں
بزمِ شادی ہے فلک کاہکشاں ہے سہرا
ان کو لڑیاں نہ کہو، بحر کی موجیں سمجھو
ہے تو کشتی میں، و لے بحرِ رواں ہے سہرا

یہ شعر مولانا مہرؔ نے اُس قلمی نسخۂ دیوانِ غالبؔ سے نقل کیے ہیں، جو بیگم مرزا شجاع الدّین

احمد خاں تاباںؔ دہلوی کی ملکیت میں تھا۔ مالک رام صاحب نے لکھا ہے کہ اُنھوں نے بیاضِ علائیؔ میں بھی اِنھیں دیکھا ہے۔ بہ ظاہر یہ اس پورے سہرے کے دو شعر ہیں جو مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ شاگردِ غالبؔ (۱۸۴۰ء تا ۱۸۶۹ء) کی شادی پر کہا گیا۔ ثاقبؔ کے سب سے بڑے صاحبزادے مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ ۲۳ دسمبر ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے شادی مارچ ۱۸۶۱ء میں یا اس سے پہلے ہوئی ہوگی۔ غالبؔ کے ایک خط مورخہ دوشنبہ ۸ فروری ۱۸۵۸ء بنام شہاب الدین ثاقبؔ کے اس جملے "اپنے گھر میں اور اپنے بچوں کو میرے اور میرے گھر کی طرف سے دُعا کہہ دینا اور تم کو بھی تمہاری استانی دعا کہتی ہیں" سے شبہ ہوتا ہے کہ ثاقبؔ کی شادی ۸ فروری ۱۸۵۸ء سے پہلے ہو چکی تھی۔ "اپنے بچوں" سے مراد البتہ علائیؔ وغیرہ کے بچے ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو سہرے کا زمانۂ فکر بھی خط کی تاریخ ۸ فروری ۱۸۵۸ء کے پیشِ نظر ہی طے کرنا پڑے گا۔ شادی نواب شمس الدین احمد خاں والیِ فیروز پور جھرکا کی نواسی سکندر جہاں بیگم سے ہوئی تھی۔

(۴) آپ نے "مسّنی الضّر" کہا ہے تو سہی
یہ بھی، یا حضرتِ ایوبؔ گلا ہے تو سہی
رنج طاقت سے سوا ہو، تو نہ پیٹوں کیونکر؟
ذہن میں خوبیِ تسلیم و رضا ہے تو سہی
ہے غنیمت کہ بامّید گزر جائے گی عمر
نہ ملے داد، مگر روزِ جزا ہے تو سہی
دوست گر کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری
نہ سہی لیک تمنّائے دوا ہے تو سہی
غیر سے دیکھیے، کیا خوب نباہی اُس نے
نہ سہی ہم سے پر اُس بُت میں وفا ہے تو سہی

نقل کرتا ہوں اُسے نامۂ اعمال میں، مَیں
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی
کبھی آ جائے گی، کیوں کرتے ہو جلدی غالبؔ
شہرۂ تیزیِ شمشیرِ قضا ہے تو سہی

یہ غزل مولانا مہرؔ نے "غالبؔ" ص ۳۰۴ (طبعِ اوّل) میں دیوانِ غالبؔ کے مخطوطۂ بیگم تاباںؔ (حاشیہ ص ۱۰۷) سے نقل کی ہے۔ نیز یہ رسالہ 'آجکل' دہلی بابت ۱۵ جون ۱۹۴۳ء میں بھی شایع ہو چکی ہے۔

بقولِ مولانا مہرؔ مرحوم، غزل، مخطوطۂ بیگم تاباںؔ کے حاشیے پر درج تھی اور مخطوطۂ بیگم تاباںؔ "بہ ظاہر رام پور والے قلمی نسخہ کی نقل معلوم ہوتا تھا۔" نسخۂ رام پور ۱۸۵۵ء میں لکھا گیا تھا، لہٰذا مخطوطۂ بیگم تاباںؔ اُس کے بعد کتابت ہوا اور یہ غزل اُس کے بھی بعد حاشیے میں اضافہ کی گئی۔ 'ارمغانِ غالبؔ' میں اِسے ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء کی تصنیف کہا گیا ہے۔ مقطع سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ غزل ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد کہی گئی ہوگی۔

(۵) بُتو! توبہ کرو، تم کیا ہو؟ جب اِدبار آتا ہے
تو یوسفؑ سا حسیں بکنے سرِ بازار آتا ہے

یہ شعر مولوی احتشام الدین صاحب دہلوی کے مضمون (ماہ نو فروری ۱۹۵۰ء) سے نقل کیا گیا ہے۔ یہ مطلع اُنھیں ایک صاحب وجیہہ الدین خاں کی مملوکہ بیاض میں ملا تھا، اِس بیاض میں مرزا صاحب کی غزل "کہا ہے تو سہی، رہا ہے تو سہی" بھی درج تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اس کے ساتھ کوئی دوسرا شعر نہیں ہے۔ وجیہہ الدین خاں نے غزلِ مذکورہ کے ہاتھ آنے کی حکایت یہ بیان کی ہے کہ ان کے والدِ ماجد مرحوم نے مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کے کلام کی اپنی بیاض میں لکھنے کے لیے استدعا کی۔ مرزا نے فرمایا کہ یہ غزل دیوان میں طبع ہونے سے رہ گئی ہے تم لے جاؤ۔ غالباً اسی کے ساتھ یہ مطلع بھی عنایت ہوا ہوگا کیونکہ اس بیاض میں غالبؔ کے نام سے

درج ہے، کسی مطبوعہ دیوان میں نہیں پایا جاتا"۔

میں نے کہا ہے تو سہی، والی غزل کو بعد از ۱۸۵۷ء قیاس کیا ہے۔ لہٰذا غالب کے عنایت کردہ ایک ہی بیاض میں لکھّے ہوئے اشعار کو اُسی عہد میں شمار کرنا چاہیے۔ مگر میرا خیال ہے کہ غالب کم از کم اس بڑھاپے میں یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد تو "سر بازار برائے فروخت آتا ہے" یا "سر بازار بکنے کے لیے آتا ہے"، کو "بکنے سر بازار آتا ہے" نہ کہتے۔ مطلع یقیناً ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے کا ہے۔ اِسے ابتدائی کلام یعنی ۱۸۱۶ء سے بھی پہلے کا قرار دینا چاہیے۔

غالب کے کچھ ہنگامی مصرعے اور شعر

۱ ؎ گاتی تھیں شمرو[1] کی بیگم، تن نا ہا یا ہُو
دودھ میں پکّے تھے شلغم، تن نا ہا یا ہُو

مولوی احتشام الدّین مرحوم نے اپنے مضمون 'غالب کے بعض غیر مطبوعہ اشعار اور لطیفے' (ماہِ نو۔ فروری ۱۹۵۰ء) میں لکھّا ہے کہ یہ "مطلع" مرزا کی ایک مہمل غزل کا ہے جو بچّوں کے جھولے میں گانے کے لیے موزوں فرمائی تھی"۔ اندازہ ہے کہ شعر ۱۸۶۵ء کے ابتدائی مہینوں میں کہا گیا ہوگا (دیکھیے خط نمبر ۱۱۲ بنام ہرگوپال تفتہ آخر مئی ۱۸۶۵ء)

۲ ؎ تم سلامت رہو قیامت تک
دولت و عزّ و جاہ، روز افزوں

اس شعر کا پہلا مصرع مرزا نے نواب یوسف علی خاں ناظم کے نام کے

---

[1] زیب النّساء عرف بیگم شمرو ۱۷۴۶ء (تذکرۂ ماہ و سال۔ ۱۷۵۱ء) تا ۲۷ جنوری ۱۸۳۶ء

خط مورخہ ۱۵ فروری ۱۸۵۷ء میں اور پورا شعر انھیں کے نام کے خط مورخہ ۱۴ اگست ۱۸۶۳ء میں لکھّا ہے۔

۳ ؎ درم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

آبِ حیات میں درج ہے کہ حسین علی خاں (عارف کا چھوٹا لڑکا) ایک دن کھیلتا کھیلتا آیا کہ دادا جان (غالب) مٹھائی منگا دو۔ آپ نے فرمایا کہ پیسے نہیں۔ وہ صندوقچہ کھول کر اِدھر اُدھر ٹٹولنے لگا اور آپ نے یہ شعر فرمایا۔
حسین علی خاں (شاداں) کا سال ولادت ۱۸۵۰ء ہے۔ اندازہ ہے اس واقعے کے وقت (آغازِ ۱۸۵۷ء) وہ سات آٹھ برس کا ہوگا۔

۴ ؎ سات جِلدوں کا پارسل پہنچا
واہ کیا خوب برمحل پہنچا

یہ شعر میرزا حاتم علی مہر کے نام کے خط مورخہ ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء میں درج ہے۔

۵ ؎ یہ خبط نہیں تو اور کیا ہے

"برہانِ قاطع کا وہ نسخہ جس کے حاشیوں پر ابتداً مرزا صاحب نے اپنے اختلافی نوٹ لکھے اور جو بعد کو قاطع برہان کے نام سے مرتّب ہو کر چھپے ...... لفظ 'خسک' پر حاشیہ لکھتے ہوئے یہ مصرع بھی مرزا صاحب کے قلم سے نکل گیا ہے۔" ظاہر ہے کہ یہ ۱۸۵۸ء ہی میں لکھّا گیا ہوگا۔

۶ ؎ روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

غالب نے یہ شعر اپنے خط بنامِ مجروح مورخہ ۲ فروری ۱۸۵۹ء میں لکھّا ہے۔

۷ ؎ دیکھیے کیا جواب آتا ہے

مندرجہ خط بنامِ مجروح ۱۳ دسمبر ۱۸۵۹ء۔ یہ پورے جملے کا ایک ٹکڑا ہے جو

از خود موزوں ہو گیا ہے: "مَیں نے اس کا اپیل لفٹنٹ گورنر کے یہاں کیا ہے، دیکھیے کیا جواب آتا ہے۔"

۸ ؎ خدا سے مَیں بھی چاہوں از رہِ مہر
"فروغِ میرزا حاتم علی مہر"

مندرجہ خط بنام مہر۔ اپریل ۱۸۵۹ء۔ اس شعر کا دوسرا مصرع خود مہر کا ہے جو ان کی مثنوی 'شعاعِ مہر' میں درج ہے۔

۹ ؎ پیر و مرشد معاف کیجیے گا
میں نے جمنا کا کچھ نہ لکھّا حال

مندرجہ خط بنام نوّاب انورالدّولہ بہادر شفق۔ ۱۹ جولائی ۱۸۶۰ء۔ عودِ ہندی میں یہ اسی طرح درج ہے مگر اردوے معلّٰی میں اسے نثر کی شکل دے دی گئی ہے اگرچہ اسے منظوم بھی پڑھا جا سکتا ہے ؎

پیر و مرشد معاف کیجیے گا ❊ میں نے جمنا کا حال کچھ نہ لکھا

۱۰ ؎ خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام
یہی ہے مذہبِ حق، والسّلام والاکرام

مندرجہ خط بنامِ مجروح۔ مئی ۱۸۶۱ء

۱۱ ؎ تھا تو خط پر نہ تھا جواب طلب
کوئی اس کا جواب کیا لکھتا

یہ شعر چودھری عبدالغفور سرور کے نام کے خط میں لکھّا ہے۔ خط پر تاریخ درج نہیں مگر قرائن سے پتا چلتا ہے کہ ۱۸۶۲ء کا لکھّا ہوا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے 'غالب کے خطوط'، جلد دوم ص ۶۱۱۔

۱۲ ؎ مَیں بھولا نہیں تجھ کو، اے میری جاں
کروں کیا، کہ یاں گر رہے ہیں مکاں

مندرجہ خط بنام مجروح مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۸۶۲ء۔

۱۳ ؎ جو یاے حالِ دہلی و الور سلام لو

یہ مصرع خط مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۸۶۲ء بنام مجروح، کا سرنامہ ہے۔

۱۴ ؎ ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک
عنایاتِ الٰہی ہو مبارک

مندرجہ خط بنامِ علائی۔ اپریل، مئی ۱۸۶۳ء۔ (غالب کے خطوط حصہ اول ص ۳۰۲)۔

۱۵ ؎ معلوم ہوا خیر کہ ٹھینگا باجا

مندرجہ خط بنامِ علائی ۱۸ مئی ۱۸۶۴ء

۱۶ ؎ کوئی اس کا جواب دو صاحب
سائلوں کا ثواب لو صاحب

مندرجہ لطائف غیبی مطبوعہ ۱۸۶۴ء ص ۲۲۔ اب یہ عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ لطائفِ غیبی، سیاح کی نہیں بلکہ خود مرزا کی تصنیف ہے۔

۱۷ ؎ خوشنودیِ احباب کا طالب غالب

ظاہر ہے کہ یہ مصرع خط کے خاتمے کے الفاظ پر مبنی ہے۔ صحیح سالِ تحریر کا علم نہیں مگر یہ ایک خط بنامِ قدر بلگرامی کے آخر میں (تاریخ درج نہیں صرف دن اور وقت لکھا ہے "چہار شنبہ بارہ پر تین بجے") اور مثنوی "شعلۂ مہر" کی تقریظ کو تمام کرتے ہوئے لکھا ہے۔

۱۸ ؎ کھانا نہ انھیں کہ یہ پرائے ہیں آم

یہ غالب کی ایک رباعی کا چوتھا مصرع ہے جو جلوۂ 'خضر' میں درج ہے۔ اس کے تین مصرعے صفیر بلگرامی کو یاد نہیں رہے۔ صفیر ۱۸۶۵ء میں غالب سے ملنے دلی آئے تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے دیوانِ غالب نسخۂ عرشی طبع دوم ص ۱۴۱۔

۱۹ ؎ میں قائلِ خدا و نبی و امام ہوں
بندہ خدا کا اور علی کا غلام ہوں

مندرجہ خط بنامِ صفیر بلگرامی مورخہ ۳ مئی ۱۸۶۵ء

۲۰ ؎ ہاتفِ غیب سن کے یہ چیخا
ان کی تاریخ میرا تاریخا

جناب احسن مارہروی مرحوم نے اپنی کتاب مکاتیب الغالب (ص ۳۵) پر لکھا ہے۔

"راقم الحروف (احسن مارہروی) کے پردادا شاہ سید عالم صاحب (صاحب عالم مارہروی۔ ولادت ۶ ربیع الثانی ۱۲۱۱ھ مطابق ۸ اکتوبر ۱۷۹۶ء) سے مرزا کی اکثر خط و کتابت رہتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت صاحب نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ آپ کی ولادت کس سنہ میں ہوئی اور یہ بھی اطلاع دی کہ میری ولادت لفظ 'تاریخ' سے نکلتی ہے جس کے عدد ۱۲۱۱ ہوتے ہیں۔ مرزا نے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا، ہاتفِ غیب الخ۔ ـــــــ"

جناب صاحب عالم مارہروی، جن کی مرزا بہت عزت کرتے تھے، مرزا سے ایک سال پہلے پیدا ہوئے اور تین سال بعد فوت ہوئے یعنی اُن کی وفات ۲ محرم ۱۲۸۸ھ (۲۴ مارچ ۱۸۷۱ء) کو ہوئی۔ صاحبِ عالم، ان کے صاحبزادے شاہ عالم اور عبدالغفور سرور (جن کے خطوں میں صاحبِ عالم مارہروی کے کئی خط شامل ہیں) کے نام کے خطوط جو آج تک دستیاب ہوئے ہیں، وہ ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۶ء تک کے عرصے میں لکھے گئے ہیں۔ یہ شعر ان خطوں میں درج نہیں۔ ہو سکتا ہے اُنھی دنوں میں کبھی لکھا گیا ہو مگر خط محفوظ نہ رہا ہو۔ اس لیے اس شعر کو ۱۸۵۸ء کے بعد اور ۱۸۶۶ء سے پہلے کا کہا ہوا ہی کہا جا سکتا ہے۔

۲۱ ؎ تحریر ہے یہ غالبِ یزداں پرست کی
تاریخ اس کی آج نویں ہے اگست کی

مندرجہ خمخانۂ جاوید جلد اول ص ۸۲۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شعر کا زمانۂ فکر

۱۸۶۶ء کے لگ بھگ ہوگا۔

۲۲ ؎ سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

غالب کا سالِ ولادت ۱۷۹۷ء ہے۔ اس طرح یہ شعر ۱۸۶۷ء میں کہا گیا ہوگا۔ ہجری حساب سے ستر برس ۱۲۸۲ھ (۶۶-۱۸۶۵ء) میں پڑیں گے۔

۲۳ ؎ آج یک شنبے کا دن ہے آؤ گے؟
یا فقط رستا ہمیں بتلاؤ گے

خمخانۂ جاوید جلد اوّل ص ۸۱ میں لالہ سری رام نے لکھا ہے کہ پیارے لال آشوب دہلی میں ہوتے تھے تو کوئی ہفتہ مرزا صاحب کی ملاقات سے خالی نہ جاتا تھا۔ دیر ہو جاتی تو مرزا ایک نہ ایک شعر لکھ کر آشوب کے پاس بھیج دیتے" جس کا مضمون حسنِ طلب ہوتا" ان میں سے ایک شعر یہ ہے۔ غالب نے دسمبر ۱۸۶۷ء کو ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ دائر کیا تھا اس مقدمے میں پیارے لال آشوب (جو ابھی ۳۶ سال کے بھی نہ تھے) گواہوں میں سے ایک تھے۔ شاید یہ شعر انھی دنوں کا ہو۔

مندرجۂ بالا اشعار کی کوئی ادبی حیثیت نہیں۔ یہ غالب کی شوخیِ طبع اور حاضر دماغی کے آئینہ دار ہیں۔ ان کی قدر و قیمت اس پر منحصر ہے کہ یہ غالب کے کہے ہوئے ہیں۔ اور یہ کسی نہ کسی واقعے کی نشان دہی میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

دیوانِ غالب

طبعِ اوّل

غالب، میجر جان جاکوب بہادر (جان جیکب) کو، مطبع سیّد الاخبار کے بارے میں کچھ اطلاعات بہم پہنچاتے ہوئے، ایک خط[1] میں لکھتے ہیں:

"...... دیوانِ ریختہ کہ ورنا تمامی تمام است، عجب نیست کہ هم دریں ماہ بہ تمامی و آنگاہ بنظرگاہِ سامی رسد ...."

(ترجمہ: (میرا) دیوانِ اردو بھی جو باوجود ادھورا ہونے کے، مکمل ہے، عجب نہیں اسی مہینے میں (اسی مطبع سے) تمام ہو کر آپ کی نگاہِ عالی سے گزرے ....)

اس خط سے دو باتیں سامنے آتی ہیں: اوّل یہ کہ دیوان چھپ رہا ہے۔ دوّم یہ کہ دیوان اگرچہ ادھورا ہے تاہم مکمل ہے یعنی منتخب ہے۔ سرورق کے مطابق، بالآخر دیوان شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء میں چھپ گیا۔ دیوان کے ص ۱۰۴ پر ایک رباعی درج

---

[1] پنج آہنگ، طبع اوّل ۱۸۴۹ء، ص ۳۸۸

١٨٦٦ء کے لگ بھگ ہوگا۔

٢٢ ۔ سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

غالب کا سالِ ولادت ١٧٩٧ء ہے۔ اس طرح یہ شعر ١٨٦٧ء میں کہا گیا ہوگا۔ ہجری حساب سے ستر برس ١٢٨٢ھ (٦٦-١٨٦٥ء) میں پڑیں گے۔

٢٣ ۔ آج یک شنبے کا دن ہے، آؤ گے ؟
یا فقط رستا ہمیں بتلاؤ گے

خمخانۂ جاوید جلد اوّل ص ٨١ میں لالہ سری رام نے لکھّا ہے کہ پیارے لال آشوب دہلی میں ہوتے تھے تو کوئی ہفتہ مرزا صاحب کی ملاقات سے خالی نہ جاتا تھا۔ دیر ہو جاتی تو مرزا ایک نہ ایک شعر لکھ کر آشوب کے پاس بھیج دیتے" جس کا مضمون حسنِ طلب ہوتا۔" ان میں سے ایک شعر یہ ہے۔ غالب نے دسمبر ١٨٦٧ء کو ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدّمہ دائر کیا تھا اس مقدمے میں پیارے لال آشوب (جو ابھی ٣٦ سال کے بھی نہ تھے) گواہوں میں سے ایک تھے۔ شاید یہ شعر اُنھی دنوں کا ہو۔

مندرجۂ بالا اشعار کی کوئی ادبی حیثیت نہیں۔ یہ غالب کی شوخیِ طبع اور حاضر دماغی کے آئینہ دار ہیں۔ ان کی قدر و قیمت اس پر منحصر ہے کہ یہ غالب کے کہے ہوئے ہیں۔ اور یہ کسی نہ کسی واقعے کی نشان دہی میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

دیوانِ غالب

طبعِ اوّل

غالب، میجر جان جاکوب بہادر (جان جیکب) کو، مطبع سیّد الاخبار کے بارے میں کچھ اطلاعات بہم پہنچاتے ہوئے، ایک خط[1] میں لکھتے ہیں:

"...... دیوانِ ریختہ کہ ورنا تمامی تمام است، عجب نیست کہ ہم دریں ماہ بہ تمامی و آنگاہ بنظر گاہِ سامی رسد ...."

(ترجمہ: (میرا) دیوانِ اردو بھی جو باوجود ادھورا ہونے کے، مکمّل ہے، عجب نہیں اسی مہینے میں (اسی مطبع سے) تمام ہو کر آپ کی نگاہِ عالی سے گزرے ....)

اس خط سے دو باتیں سامنے آتی ہیں: اوّل یہ کہ دیوان چھپ رہا ہے۔ دوّم یہ کہ دیوان اگرچہ ادھورا ہے تاہم مکمّل ہے یعنی منتخب ہے۔ سرورق کے مطابق، بالآخر دیوان شعبان ١٢٥٧ھ مطابق اکتوبر ١٨٤١ء میں چھپ گیا۔ دیوان کے ص ١٠٤ پر ایک رباعی درج

---

[1] پنج آہنگ، طبع اوّل ١٨٤٩ء، ص ٣٨٨

ہے ہے

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم   آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں اسفل و عالی باہم   ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم

عرشی صاحب مرحوم اس رباعی کے پیشِ نظر لکھتے ہیں[۱] :

"......... شعبان ۱۲۵۷ھ (اکتوبر ۱۸۴۱ء) میں میرزا صاحب کا دیوان اس مطبع (سید الاخبار) میں چھپنا شروع ہوا، اور ۲۷ رمضان (۱۲ نومبر) تک زیرِ طبع رہا۔ تاریخِ آغاز سرورق پر مذکور ہے اور ۲۷ رمضان تک، اختتام نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں یہ رباعی بھی شامل ہے: ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم ــ اور از روئے حساب دوالی اور شبِ قدر کا اجتماع اسی تاریخ کو ہوا تھا ...."

مگر یہ دونوں دلیلیں ضعیف ہیں۔ دیوان کے سرورق پر یہ کہیں نہیں لکھا گیا کہ اکتوبر ۱۸۴۱ء طباعتِ دیوان کی تاریخِ آغاز ہے۔ اگر تاریخِ آغاز کی نشاندہی منظور ہوتی تو دن کا ذکر بھی ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح رباعی سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ شبِ قدر اور دیوالی کے اجتماع کی تاریخ گزر چکی ہے۔ اس میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ چھوٹے بڑے آپس میں اس لیے خوش ہو کر گلے مل رہے ہیں کہ اب کے شبِ قدر اور دیوالی بھی ایک ہی تاریخ کو باہم بغل گیر ہونے والی ہیں۔ رباعی یقیناً ۲۷ رمضان (۱۲ نومبر) سے پہلے کہی گئی ہوگی۔ ایسا ہونا اگر ناممکن نہیں تو دور از قیاس ضرور ہے کہ طباعت سے مہینوں پہلے مسودے کی کتابت کرائی گئی ہو اور طباعت کے دوران میں یکایک ایک رباعی کا اضافہ کر دیا گیا ہو۔ چھپے ہوئے دیوان میں یہ رباعی جس مقام پر ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ تمام مسودہ ایک ہی قلم سے سلسلہ وار لکھا گیا تھا۔

۱ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی اشاعتِ دوم مقدمہ ص ۱۲۷

دیوان میں درج شعروں کی تفصیل یہ ہے :

غزلیات کے اشعار	۹۹۸
۲ مصرعے جو غزل میں چھپنے سے رہ گئے مگر غلط نامہ میں موجود ہیں[۱]	۱
میزان (اشعارِ غزلیات)	۹۹۹
قصیدوں، قطعوں، رباعیوں کے اشعار	۹۷
میزان	۱۰۹۶

ص ۵۹ پر چھپے ہوئے ۳ شعر حقیقت میں قطعے[۲] کے ہیں جو ص ۱۰۰ پر درج ہے اور اس میں شامل ہیں۔ اس طرح مجموعی تعدادِ اشعار ۱۰۹۳ رہ جاتی ہے۔ اب اگر معلوم ہو کہ یہ ۱۰۹۳ اشعار، کم از کم، ۲۹۷۵ اشعار سے منتخب کیے گئے ہیں[۳] تو سمجھ میں آجاتا ہے کہ غالب نے اپنے "دیوانِ ریختہ" کو "در تا تمامی، تمام" کیوں کہا۔ ان کی مراد یہ ہے کہ دیوان صرف چھاپنے کی حد تک مکمل ہے حقیقت میں مکمل نہیں کیونکہ منتخب ہے۔

غالب کے دیوانِ ریختہ کے پانچوں ایڈیشنوں میں ان کا فارسی میں لکھا ہوا دیباچہ شامل ہے مگر اس پر تاریخِ تحریر درج نہیں ہے۔ دیوانِ غالب (نظامی[۴] بدایونی طبعِ ثانی)

۱ دیوانِ غالب طبعِ اوّل ص ۱۹ غزل کا پہلا مصرعہ یہ ہے "یک ذرۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا"
۲ "کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں" معلوم ہوتا ہے اس شعر کو قطعے سے الگ کر کے، باقی تین شعروں کو غالب نے عمداً غزلوں میں درج کیا تھا بعد میں مکمل قطعہ بھی شامل کر لیا۔ مگر غزلوں سے تین شعر خارج کرنا بھول گئے۔ بعد کے ایڈیشنوں میں یہ غلطی درست کر لی گئی ہے
۳ دیکھیے ۔ ۱۸۱۲ء سے ۱۸۳۳ء تک کے اشعار = ۲۹۴۸ + (۱۸۳۴ء سے ۱۸۴۱ء تک کے اشعار) ۲۷ = ۲۹۷۵
۴ اردو دیوانِ غالب مع شرحِ نظامی۔ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۔ ۱۹۲۳ء ص ۵، اور متنِ دیوانِ غالب سے ایک صفحہ پہلے

میں پہلی بار یہ تاریخ درج کی گئی ہے ۔ نظامی اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں ۔

"اس مرتبہ اس سے بھی زیادہ پرانا ایک قلمی نسخہ ہاتھ آیا جو اصل دیوان سے نقل کیا گیا ہے جس کو پہلی مرتبہ غالب نے ۱۲۴۸ھ میں مرتّب کیا تھا۔ یہ نقل جو ہمیں دستیاب ہوئی ہے اُسی زمانے کی لکھّی ہوئی ہے ۔ اس کے ساتھ ایک دیباچہ بزبانِ فارسی مصنّف نے لکھّا ہے کہ جس کو ناظرین کے مطالعے کے لیے اس دیوان کے شروع میں بجنسہٖ درج کیا گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس ایڈیشن میں غالب کے دیباچے کا عنوان اس طرح قائم کیا ہے ۔

" دیباچہ جو خود مصنّف نے وقتِ ترتیبِ دیوانِ ہذا بزبانِ فارسی لکھّا ۔ ۔ ۔"

آخر میں تاریخِ دیباچہ[1] اس طرح درج کی ہے :

"بست وچہارم شہر ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ"

جو مطابق ہے ۱۶ اپریل ۱۸۳۳ء کے[2]

نظامی مرحوم کو وہ دیوان جس میں یہ دیباچہ مع تاریخ تحریر درج ہے کہاں سے ملا تھا ؟ اس کی وضاحت ہمیں ڈاکٹر سیّد عبداللطیف کی کتاب میں شائع شدہ ایک خط کے ذریعے ملتی ہے جو نظامی مرحوم نے سر اکبر حیدری کے نام ۳ دسمبر ۱۹۲۷ء کو لکھّا تھا[3] نظامی فرماتے ہیں :

---

۱ اُردو دیوانِ غالب مع شرح نظامی ۔ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۔ ۱۹۲۳ء ص ۵۷ اور متنِ دیوانِ غالب سے ایک صفحہ پہلے

۲ گلِ رعنا کی تکمیل یکم ربیع الاوّل مطابق ۱۱ ستمبر ۱۸۲۸ء کو ہوئی تھی ۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ دیوانِ ریختہ کی تکمیل بھی اُنھی دنوں ہوئی تھی اور اس پر غالب نے دیباچہ فارسی میں لکھّا تو وہ یقیناً ۱۸۲۸ء ہی میں لکھّا گیا ہوگا بعد میں نظرِ ثانی کرکے "بست وچہارم شہر ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ" (۱۶ اپریل ۱۸۳۳ء) تاریخ ڈال دی ہوگی ۔

۳ غالب از ڈاکٹر سیّد عبداللطیف (انگریزی سے ترجمہ) مطبوعہ حیدرآباد ۔ ۱۹۳۲ء ص ۱۳۵

"قلمی دیوان جو ۱۲۴۸ھ کے قریب کا لکھّا ہوا مجھے ۱۹۱۸ء میں ملا تھا اور جس کا ذکر مَیں نے اپنے یہاں کے مطبوعہ دیوانِ غالب کے دوسرے ایڈیشن میں کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک مرحوم دوست (منشی احمد علی صاحب شوقؔ) کے ذریعے سے مجھے رام پور میں دستیاب ہوا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

چند لفظی ترامیم[1] سے قطعِ نظر نظامی بدایونی کا نقل کردہ دیباچہ وہی ہے جو آٹھ سال کے بعد (۱۸۴۱ء) سے شائع ہونے والے پانچوں ایڈیشنوں میں شامل ہے ۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ دیوانِ غالب لگ بھگ ۱۸۳۳ء کے پہلے سہ ماہے میں طباعت کے لیے تیّار ہوگیا تھا ۔ اب ۱۶ اپریل ۱۸۳۳ء کو اس کا دیباچہ لکھ کر اسے کاتب کے حوالے کرنا تھا ۔ مگر ایسا نہیں ہوا ۔ دیباچہ تو لکھّا گیا مگر مسودہ کاتب کے حوالے نہیں کیا گیا شاید اس لیے کہ ابھی نواب ضیاء الدّین احمد خان نیّرؔ و رخشاںؔ نے اس کی تقریظ مکمّل نہیں کی تھی ۔ یہ تقریظ ۱۲۵۴ھ[2] (۲۸ مارچ ۱۸۳۸ء تا ۱۷ مارچ ۱۸۳۹ء) میں مکمّل ہوئی ۔ اُس وقت اس میں غزل ، قصیدہ ، قطعہ ، رباعی ملا کر کل اشعار "ایک ہزار و ہفتاد واند" تھے[3] ۔ یعنی ۱۰۷۰ سے کچھ اوپر (۱، ۲، ۳ سے ۹ تک کچھ بھی) ۔ لیکن جب دیوان ، دیباچہ و تقریظ کے ساتھ چھپنے کے لیے دیا گیا تو اُس میں جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے ، ۱۰۹۶ شعر[4] چھپے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۳۳ء تک دیوان کے اشعار ۱۰۷۱ تھے[5] بعد میں ۲۵ اشعار کا اضافہ ہوا ۔ جو ۲۷ شعروں میں سے لیے گئے تھے[5] ۔

---

۱ مثلاً طباعت کے وقت 'درِ خاکسترِ خویش' کو 'بہ خاکسترِ خویش' ، 'کم مایہ' کو 'اندک مایہ' بنا دیا گیا ہے

۲ آثار الصنادید مطبوعہ نولکشور جون ۱۸۷۶ء باب چوتھا ص ۸۵ "سنہ مقدسہ ہجریہ نبویہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یک ہزار و دویست و پنجہ و چار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

۳ ایضاً   ایضاً   ایضاً ص ۸۶

۴ دیوانِ غالب (طبع اوّل) ۔ تقریظ میں تعدادِ اشعار "ہزار و نود و ہشت اند" لکھّا ہے ، جو غلط ہے

۵ دیکھیے ۱۸۱۲ء سے ۱۸۴۱ء تک کے م نشان والے اشعار

اس کے علاوہ تقریظ مشمولۂ دیوانِ مطبوعہ میں لفظی تغیّرہ و تبدّل بھی ہُوا اور مختلف اشاعتوں میں سنین اور تعدادِ اشعار میں ترامیم بھی ہوئیں۔

۱۸۳۳ء کے بعد جن ۲۵ اشعار کا اضافہ ہُوا وہ یہ ہیں

دیوانِ غالب ص ۵۳	دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو[۲]	۹ شعر نسخۂ بدایوں ۱۸۳۸ء
″ ۵۸	تاہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا	۲ شعر حاشیہ ایضاً بعد از ۱۸۳۸ء
″ ۶۵	زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ	۱ شعر گلشنِ بے خار
″ ۸۴	ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے	۳ شعر اپریل ۱۸۳۵ء نسخۂ بدایوں۔ حاشیہ بعد از ۱۸۳۸ء
″ ۸۶	لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے	۴ شعر۔ ایضاً
″ ۱۰۰	گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری	۲ شعر۔ ایضاً
″ ۱۰۴	بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جمجاہ نے دال	۲ شعر۔ ایضاً
″ ۱۰۴	ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم	۲ شعر "شبِ قدر و دوالی باہم"
		۲۵ شعر ۱۸۴۱ء

مندرجۂ بالا سے یہ نتائج برآمد ہوتے ہیں

۱؎ ایک شعری ترمیم دلچسپ ہے۔ تقریظ میں شامل مثنوی کا تیسرا شعر آثار الصنادید میں اس طرح ہے

نہیں فرزند و نہ آبائے علوی نہیں شاگردِ روح القدس عالی

اس کے مصرعِ ثانی کو دیوانِ غالب (طبع اوّل) میں یوں کر دیا ہے ؎ دمِ روح القدسِ در کشفِ معنی، پھر بعد کی اشاعتوں میں یہ شکل دے دی ہے ؎ نہیں شاگردِ عقلِ کلّ عالی

۲؎ بے چارہ کتنی دور سے آیا ہے شیخ جی کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پانو

یہ شعر بعد میں متداول دیوانِ غالب سے خارج کر دیا گیا تھا۔ اس طرح اب متداول دیوان میں اس غزل کے ۹ کے بجائے ۸ شعر شامل ہیں

۱۔ دیوانِ غالبؔ اوّلیں طباعت کے لیے لگ بھگ ۱۸۳۳ء کے پہلے سہ ماہے تک مکمّل ہو چکا تھا

۲۔ اس میں ۱۰۷۱ اشعار تھے[۱]

۱؎ اگر جدول میں، جو 'تعارف' میں دی جا چکی ہے، دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ۱۸۳۳ء تک متداول دیوان کے لیے منتخب اشعار کی تعداد ۱۰۷۱ نہیں بلکہ ۱۰۷۳ ہے۔ تاہم دیوانِ غالب کے پہلے ایڈیشن (۱۸۴۱ء) میں ۱۸۳۳ء تک ۱۰۷۱ اشعار ہی شامل کیے گئے تھے۔ یہ کیوں کر ہُوا۔ اس کے لیے "نگاہ" میں پورا "جمع خرچ" رکھنا پڑے گا۔ ملاحظہ کیجیے:

۱۸۳۳ء تک دیوان کے لیے منتخب اشعار کی تعداد	۱۰۷۳
متداول دیوان میں قصیدہ "یک ذرّہ....." کے ۲۸ شعر ہیں مگر پہلے ایڈیشن (ص ۹۵/۹۶) میں صرف ۲۵ شعر درج ہیں۔ اس طرح اشعار کم ہوگئے	۳ − / ۱۰۷۰
پہلا ایڈیشن ص ۲۹/۳۰ غزل "میرے بعد" کے ۸ شعر ہیں۔ متداول دیوان میں بعد ازاں یہ شعر اضافہ ہُوا ؎ خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد یعنی یہ شعر پہلے ایڈیشن میں نہیں	۱ − / ۱۰۶۹
یہ ۲ شعر بھی پہلے ایڈیشن میں نہیں ؎ سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی محابا کیا ہے؟ میں ضامن، اِدھر دیکھ شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا	۲ − / ۱۰۶۷
یہ شعر پہلے ایڈیشن (ص ۲۷) میں ہے مگر بعد میں حذف کر دیا گیا ؎ ہو کر شہیدِ عشق میں پائے ہزار جسم ہر موجِ گردِ راہ، مرے سر کو دوش ہے	۱ + / ۱۰۶۸
قطعے کے شعر جو پہلے ایڈیشن میں ص ۵۹ اور ص ۱۰۰ پر دو بار چھپ گئے "کلکتہ کا جو ذکر کیا ....."	۳ +
پہلے ایڈیشن میں ۱۸۳۳ء تک کے کل منتخب اشعار	۱۰۷۱

۳۔ یہ اشعار ۲۹۴۸ اشعار میں سے منتخب ہوئے تھے (بعد میں ۱۸۴۱ء تک کے فکر کردہ ۲۷ اشعار میں سے ۲۵ شعر مزید منتخب ہوئے۔ ان ۲۷ شعروں کے اضافے سے اس وقت تک کے کہے ہوئے اشعار کی تعداد ۲۹۷۵ ہو گئی)

۴۔ اس کا دیباچہ غالب نے ۱۶ اپریل ۱۸۳۳ء کو ختم کیا

۵۔ تقریظ نواب ضیاالدین احمد خاں نیر ورخشاں نے ۲۸ مارچ ۱۸۳۸ء اور ۱۷ مارچ ۱۸۳۹ء کے درمیان کسی وقت لکھی۔ قیاس غالب یہی ہے کہ ۱۸۳۸ء ہی میں لکھی

۶۔ طباعت دیوان کے وقت اس میں ۲۵ اشعار کا اضافہ ہوا اور کل شعر ۱۰۹۶ ہو گئے (کاتب نے ایک غزل کے دو مصرعے حذف کر دیئے تھے۔ جس کی وضاحت غلط نامہ میں موجود ہے۔ اس طرح اشعار جو متن میں درج ہیں، شمار میں ۱۰۹۵ ہیں مگر حقیقت میں ۱۰۹۶ ہیں۔ ۳ شعر دوبار درج ہو گئے۔ وہ کم کیے تو دیوان کا مواد ۱۰۹۳ اشعار پر مشتمل رہ گیا)

۷۔ دیوان اکتوبر ۱۸۴۱ء کو "دہلی میں سید محمد خاں بہادر کے چھاپہ خانہ" (مطبع سید الاخبار) میں چھپا۔

دیوانِ غالب (طبع اول) بہت کم یاب ہے۔ جناب مالک رام فرماتے ہیں[1]:

"ایک کرم خوردہ نسخہ منشی مہیش پرشاد مرحوم کے پاس تھا۔ خدا معلوم اب کہاں ہے۔ خان بہادر سید ابو محمد مرحوم کا نسخہ آزاد لائبریری، علی گڑھ میں آگیا ہے۔ ایک مکمل نسخہ صولت پبلک لائبریری، رامپور میں اور دوسرا جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) کے کتب خانے میں ہے - - - - - - -"

جناب عرشی مرحوم، صولت پبلک لائبریری، رام پور کے نسخے کے بارے میں لکھتے ہیں[2]:

لہ ذکرِ غالب۔ طبع پنجم ص ۱۶۶

ﻋﮧ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی ص ۱۲۸۔ مقدمہ

"سرورق کی پہلی سطر کے آخر میں لفظِ تخلص کے اوپر سید محمد خاں[1] کے دستخط ہیں - - - - - - - - - - - - - -"

میرے کتب خانے میں اس ایڈیشن کے دو نسخے ہیں اور صولت پبلک لائبریری، رام پور والے نسخے کا عکس بھی ہے۔ جب تک میں نے عرشی صاحب کا بیان نہیں پڑھا تھا اور صولت پبلک لائبریری والے نسخے کا عکس نہیں دیکھا تھا، مجھے معلوم نہ تھا کہ سرورق کے لفظ تخلص پر بے معنی سا نشان حقیقت میں سید محمد خاں کے دستخط ہیں۔ بہرحال میرے دو نسخوں میں سے ایک پر یہی دستخط بعینہٖ اسی جگہ موجود ہیں۔ وجہ نامعلوم۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے سب نسخوں پر دستخط کیے ہوں مگر ایک چھوٹ گیا ہو یا چند ہی نسخوں پر دستخط کیے ہوں جن میں سے ایک میرے کتب خانے میں ہے۔

دیوان ۱۰۹ صفحوں ہی کو محیط ہے۔ پہلا صفحہ سرورق کا ہے۔ دوسرا صفحہ خالی ہے۔ صفحات میں ۹۲ کا عدد دو دفعہ آگیا ہے مگر ص ۱۰۳ کے بعد ص ۱۰۴ چھوٹ گیا ہے۔ اس طرح پلڑے برابر ہو گئے ہیں۔

یہ ایڈیشن اتنا کم یاب ہے کہ مدتوں اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستی رہیں۔ اب اس سے پہلے کہ باقی دو چار نسخے بھی دیمک یا وقت کی بھینٹ چڑھ جاتے میں نے اس کا عکسی ایڈیشن شائع کر کے اسے عام کر دیا ہے۔

لہ سرسید احمد خاں کے برادرِ بزرگ سید محمد خاں۔ انتقال ۱۸۴۶ء (تلاشِ غالب ص ۱۱۶)

غالب کی زندگی میں دیوانِ غالب کی اشاعت

(دیباچہ، تقریظ، خاتمۃ الطبع اور تعدادِ اشعار)

(ا) غالب نے اپنے اُردو دیوان کے پہلے ایڈیشن کا دیباچہ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۸ھ[1] (۱۶ اپریل ۱۸۳۳ء) کو تمام کیا۔ تقریظ چھ سال بعد نواب ضیاالدّین احمد خاں نے ۱۲۵۴ھ (۳۹-۱۸۳۸ء) میں لکھی۔ دیوان اکتوبر ۱۸۴۱ء میں اس سرورق کے ساتھ چھپا۔

دیوان اسداللہ خانصاحب غالبؔ تخلّص
مرزا نوشہ صاحب مشہور کا دہلی میں سیّد محمد خاں بہادر کے چھاپہ خانے کے
لیتھوگرافک پریس میں شہر شعبان
۱۲۵۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۸۴۱ عیسوی کو سیّد عبدالغفور کے
اہتمام میں چھاپا ہوا

---

[1] یہ تاریخ سب سے پہلے مولانا نظامی بدایونی نے منشی احمد علی شوق قدوائی کے مملوکہ نسخے سے اخذ کر کے اپنے شائع کردہ دیوان کے دوسرے ایڈیشن میں درج کی تھی

(ب) دیباچۂ غالبؔ جو دیوانِ غالب طبعِ اوّل میں چھپا ہے، یہ ہے:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

دیباچہ

مشامِ شمیم آشنایان را صلاً، و بنہادِ انجمن نشینان را مژدہ کہ لختی از سامانِ مجمرہ گردانی آمادہ، و دامنی از عودِ ہندی دست بہم دادہ است۔ نہ چوب ہای سنگ ترسپ خوردہ بہ ہنجارِ ناطبیعی شکستۂ، بی اندام تراشیدہ، بلکہ بہ تبر شگافتہ، بکار در ریز ریز کردہ، بہ سوہان خراشیدہ۔

ایدون نفس گداختگی شوق بہ جستجوی آتش پارسی است۔ نہ آتشی کہ در گلخن ہای ہند افسردہ و خاموشش، و از کفِ خاکستر بمرگ خودش سیہ پوش بینی۔ چہ بردی مسلم است؟ از ناپاکی باستخوانِ مردہ ناہار شکستن، و از دیوانگی بر شتۂ شمعِ مزار کشتہ آدیختن ہر آینہ بدل گداختن نیرزد، و بزم افروختن را نشاید۔ رخِ آتش بہ صنع برافروزندہ، و آتش پرست را بیاد افراہ ہم در آتش سوزندہ نیک میداند کہ پژدہندہ در ہوای آن رخشندہ آذر نعل در آتش است کہ بچشم روشنی ہوشنگ از سنگ برون تافتہ، و در ایوان لہراسپ فروغ نمایافتہ، خس را فروغست، و لالہ را رنگ، و مغ را چشم، و کدہ را چراغ۔ بخشیدۂ [بخشندۂ] یزدان و درون سخن برافروز را سپاسم کہ شراری ازان آتش تابناک در خاکستر خویش یافتہ، بکاوکاوِ سینہ شتافتہ ام، و از نفس دمہ بر آن بر نہادہ۔ بو کہ در اندک مایہ روزگاران آن مایہ فراہم تواند آمد کہ مجمرہ را فر روشنائی چراغ و رائحۂ عود را بالِ شناسائی دماغ تواند بخشید۔

ہمانا نگارندۂ این نامہ را آن در سر است کہ پس از انتخاب دیوان ریختہ بہ گرد آوردن سرمایۂ دیوانِ فارسی برخیزد، و باستفاضۂ کمالِ این فر ایزدی فن پس زانوی خویشتن نشیند۔ امید کہ سخن سرایانِ سخنور ستای، پراگندہ ابیاتے را کہ خارج ازاین اوراق یابند،

ازآثارِ تراوشِ رگِ کلکِ این نامہ سیاہ لشنا سند و چامہ گرد آور را در ستایش نکوہشِ آن اشعار ممنون و ماخوذ لسگالند۔

یارب این بوی ہستی ناشنیدۂ پیشینی [زنبیتی] بہ پیدائی نارسیدہ یعنی [نقش] بہ ضمیر آمدۂ نقّاش کہ بہ اسداللہ خاں موسوم و بہ میرزا نوشہ معروف و بہ غالب متخلص است، چنانکہ اکبرآبادی مولد و دہلوی مسکن است، فرجامِ کار نجفی مدفن نیز باد۔

(ج) نواب ضیاالدین احمد خاں کی تقریظ یہ ہے۔

تقریظ[1]

"بنام ایزد سہی بالا ناظورہ ایست از قدسی خانوادۂ فکر سر برزدۂ گرمِ جلوہ گری دلا اُبالیِ خرام محبوبہ ایست، مقنعہ از رخ برداشتہ و دامن بہ کمر زدہ، در اندازِ پردہ دری۔ یوسفتانی است نورانژادانِ معانی در روی دوش بدوش۔ عبہر زاریست جلوہ گاہِ حیرتیانِ باختہ ہوش۔ پہنا ور پرندیست، مانندِ سپہرِ ثوابت، گوہر آگین۔ نورلق رونق شارسانیست، کارنامۂ شکن صد

---

[1] یہ تقریظ وہ ہے جو دیوانِ غالب طبع اوّل کے آخر میں شائع ہوئی تھی۔ بعد کی اشاعتوں میں سالِ تصنیف تقریظ اور تعدادِ اشعار کے علاوہ معمولی سا ردّ و بدل ہوا ہے۔ جیسے محجوبہ کی جگہ محبوبہ، بدوش کی جگہ بر دوش، کارنامہ کی جگہ بارنامہ، برگرسنہ چشمانِ سخن کی جگہ صرف گرسنہ چشمانِ سخن، بہزاد کی جگہ ارژنگ، ہم بمغز و ہم کی جگہ ہم بمغز پختہ و ہم، بہ سخنہ کی جگہ نسختہ، ہمدستانان کی جگہ ہمداستانان، اشعار سے پہلے لفظ مثنوی کا اضافہ، مصرع دمِ روح القدس در کشفِ معنی کی جگہ مہیں شاگردِ عقلِ کلِ عالی، فرخندہ کش کی جگہ فرد ہیدہ کنش، المتخلص بغالب کی جگہ غالب، پوزش آئین کی جگہ پوزش آئین نیاز گستر، محمد ضیاء الدین کی جگہ ضیاء الدین نیر، قطعہ و رباعی کی جگہ قطعہ و مثنوی و رباعی، ازما کی جگہ از من، بر دیگراں کی جگہ برائے دیگراں وغیرہ۔

نگار خانۂ چین۔ فروغانِ چراغیست پری پروانہ۔ سماوی ہیکلی ست حرزِ بازوے فرزانہ۔ گوئی میکائیل نوال موکلی فراخ سماطی نہادہ است، و برگرسنہ چشمانِ سخن راصلای عام درداده۔ بیت اللہ تقدس معبدیست کہ کلیدش بدستِ فہم درست دادہ اند، و درش بر احرام بندانِ مژدلفۂ دل کشادہ۔ سومناتیست یک صنمستان زنّار بندانِ خیال در روی جبین سای۔ ارتنگیست نمایشِ نقشہای بدیع پشتِ دستِ مانی و بہزاد بر زمین سای۔ ہر صفحہ ازین اوراق برہمنیست بید خوان۔ ہر ورق ازین کتاب موبدی است استادان۔ آئینہ خانہ ایست گیتی نما۔ صفوتکدہ ایست مصفّا۔ پردگیانند حجلہ نشین سرادقِ مریم کرداری۔ شوخ چشمانند بردہ در تراز شاہدانِ بازاری۔ تہی دستانند توانگر دل آزادگانند یادرگل۔ عشاق طینتانند بخویشتن مائل۔ سادہ پیکرانند نگارین دل۔ ہاروت پیشگانند زہرہ فن۔ بزمین گوہرانند بابل مسکن۔ سمندرانند قلزم کش۔ نہنگانند سینہ پُر آتش۔ برشتگانند پختہ مغز۔ ہم بمغز دہم بپوست نغز۔ بادہ آشامانند سیہ مست۔ از خود رفتگانند بایکدگر ہمدست۔ ہندی ضمانند پارسی گرد۔ دہلی نژادانند صفاہان پرورد۔

ہان و ہان، ترسم کہ آنچہ سرودم نسختہ باشی ہمانا، منتخب دیوانِ اردو زبان است ریختۂ کلکِ مسیحی فرتاب خدامِ قسطاسِ دانش۔ اسطرلابِ بینش، جوہر آئینۂ آفرینش، معیارِ نقدِ گرانمایگی، معراجِ سُلّم بلند پایگی، قہرمانِ قلمرو معنی پروری، فرمان فرمای گیہانِ سخنوری، گیتی خدایگانِ نوآئین نگاری، جہان سالارِ تازہ گفتاری، روان بخشِ کالبدِ سخن گستری، بینائی افزای چشمِ دیدہ وری، فرازندۂ لوای شوکتِ خامہ، فروزندۂ چراغِ دودۂ آمہ، آیۂ ناسخِ شہرتِ ہمداستانان، سرخیلِ انجمن نکتہ دانان ؎

سخن را از خیالش ارجمندی	معانی را ز فکرش سربلندی
صریرِ خامہ اش بس دلپذیر است	بہشتی عندلیبان راصفیر است
مہین فرزندِ نُہ آبای علوی	دمِ روح القدس در کشفِ معنی
جہاں را بیدریغ آموزگار است	گزین معنی شناسِ روزگار است

سرد سر دفترِ شیوا بیانان — درین فن، افتخارِ ہمزبانان
بجولانگاہِ معنی یکہ تازے — فلاطوں فطرتے، حکمت طرازے
زکلکش ریزشِ گنجِ معانی — چو ابرِ آذری، در دُر فشانی
زصہبای سخن سرشار گشتہ — ورق، از فکرِ او، گلزار گشتہ

موحّد کیش، صافی منش، ستودہ خوی و فرخندہ کیش، بُزرگ نہاد پاکیزہ گوہر، فرشتہ سرشت آزرم گستر، کین گذار، مہر پرور، خورشید فروغ کیوان فر، نکوہش نکوہِ ستایش ستای۔ کشورِ معنی را دہ خدای، سرتاسر وفا و فتوّت، دیدہ تا دل حیا و مروّت

دَرکِ مُصوّر، روحِ مجسّم — عالمِ جان، و جانِ عالم

والا حسب، عالی نسب۔ سمیّ و وصیّ والیسین و نخشور، آداشِ حضرت چاریں دستوراعظم، استادی، مرشدی، مولائی، اخی، میرزا اسد اللہ خان بہادر المتخلّص بہ غالب۔ اَللّٰہُمّ کَمِّلِ الْکَلَامَ بِدَیْمُوْمَۃِ بَقَائِہٖ، وَحَصِّلِ الْمَرَامَ بِحَیْنُوْنَۃِ لِقَائِہٖ!

پوزش آئین محمد ضیاء الدین، از دیر باز دالائی اندیشہ ایست درآن اندیشندے وگرانی قدرِ سنگ اندران سنجیدے، کہ این گرامی برادر زادہ ہارا، کہ یگان یگان خلف الصدق دومانِ ضمیرِ بل البوالآبا ے مضامینِ دلپذیر است بتعلیم نوآموزانِ نکو از بدنشناس برانگیزد، واین ارزندہ جواہر پارہ ہارا، کہ ہر ایک ازان سیمین ساعدِ شخص خرد را یارہ، و نازنین پیکرِ ہوش را گوشوارہ است، برشمسہ پیش طاقِ شناسا ے برآویزد۔

بارے، کارسازِ ایزدِ بزرگ راہزاران سپاس کہ درین زمان کہ سنہ مقدسہ ہجریہ بنویہ، عَلٰی صَاحِبِہَا اَفْضَلُ التَّحِیَّاتِ وَاَکْمَلُ الصَّلٰوۃ ـ بہ یک ہزار و دویست و پنجہ و چہار رسیدہ، آن دیرین بسیج و دل نشین آرزو بمساعدتِ روزگارِ راست ہنجار و فیلاوزیِ بختِ بیدار خوشتر ازان کہ میخواستم، روائی گرفت۔ شادکامی در دل جاگزید و اندوہ گرد آوری بدر رفت۔

چون بہ احصای افرادِ این ہمایون صحیفہ شتافتم، ہمگی اشعارِ شعری شعارِ غزل و

قصیدہ و قطعہ و رباعی ہزار و نود و ہشت و اند یافتم[۱]۔

الا، یا توانا ہوشان، ہوشے! و شنوا گوشان، گوشے! بر شاہراہِ شناختِ فراوانی نیکو معانی باید رفت، نہ در پیغولۂ پیغارہ زنی خوردہ بر قلّتِ ابیات گرفت چنانکہ خودآن والا آموزگار، در گزارشِ این ہنجار، بپارسی نامۂ خویشتن در پردۂ سازِ آن گفتار خود می سراید۔ آرے، راست میفرماید۔ بیت:

نگوییم، تا نباشد نغز، غالب — چہ غم، گر ہست اشعارِ من اندک؟

ازمایادگارے و بر دیگران تذکارے باد! فقط تم تم ”

دیوان کے آخری صفحے ۱۰۹ پر ’غلط نامہ‘ ہے۔

(د) دیوان میں کل اشعار ۱۰۹۶ ہیں۔ ۳ شعر دو بار چھپ گئے ہیں۔ اس طرح مواد کے لحاظ سے تعدادِ اشعار ۱۰۹۳ تسلیم کرنی چاہیے۔

(۲)

(ا) یہ ایڈیشن (دوسرا) مطبع دار السّلام دہلی واقع محلہ حوض قاضی سے مئی ۱۸۴۷ء میں چھپا تھا۔ دیباچہ پہلے ایڈیشن کے مطابق ہے۔

(ب) تقریظ میں تاریخِ تصنیفِ تقریظ ۱۲۵۴ھ ہی دی گئی ہے۔ مگر تعدادِ اشعار ”غزل و قصیدہ و قطعہ و رباعی یک ہزار و یک صد و اند“ بتائی گئی ہے۔ عموماً اند (بمعنی چند) سے مراد ۱، ۲، ۳، سے ۹ تک ہے جیسے الوری ے ہیچو تاریخ نہصد و چل و اند۔ تاہم دیوان کے کل اشعار ۱۱۵۸ ہیں۔

تقریظ کا لفظ ہٹا کر اس کی جگہ نثر رکھ دیا گیا ہے اور اس کے بعد بطورِ عنوان یہ عبارت (معلوم ہوتا ہے غالب کی طرف سے) بڑھادی گئی ہے۔

---

[۱] تعدادِ اشعار کی بحث کے لیے دیکھیے مقدّمے کا باب بعنوان ” دیوانِ غالب۔ طبع ۱۸۴۱ء “

"دمیدنِ سپیدۂ سحری از تیرہ شبِ سوادِ اوراق، بفرِ فروغ گستری
عبارتِ تقریظ کہ بیداتی آن اثریست از آثارِ خرام خامۂ دلربا برادر،
بدل نزدیک بجان برابر، عالی دودمان والاگہر
نواب ضیاالدین احمد خان بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ!

(ج) خاتمۃ الطبع کے طور پر یہ جملہ ہے "تمت تمام شد"۔

(د) جناب عرشی مرحوم دیوانِ غالب اُردو (پہلی بار۔ ۱۹۵۸ء ص ۹۷ دیباچہ) میں دوسرے ایڈیشن (۱۸۴۷ء) کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"نیر کی تقریظ میں تاریخ ۱۲۵۴ھ ہی ہے مگر اشعار کی تعداد، ایک ہزار و یک صد و اند، بنادی گئی ہے گویا چھ برس کے اندر میرزا صاحب نے اُردو کے کل چودہ شعر کہے تھے جو اس نسخے میں بڑھا دیے گئے۔ دونوں ایڈیشنوں (پہلے اور دوسرے) کے مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف نواب تجمل حسین خاں کی مدحیہ غزل کا اضافہ ہوا ہے جس کے ۱۴ شعر ہیں ------"

اس سے پہلے ص ۹۶ پر عرشی صاحب کہہ چکے ہیں کہ پہلے ایڈیشن میں کل ۱۰۹۸ یا (۳ شعر جو دوبارہ چھپ گئے ہیں کم کر کے) ۱۰۹۵ شعر ہیں۔ اسی طرح دوسرے ایڈیشن میں (۱۰۹۸+۱۴) ۱۱۱۲ یا (۱۰۹۵+۱۴) ۱۱۰۹ ہوئے۔

پھر اسی دیوان کی اشاعت دوم (۱۹۸۲ء۔ ص ۱۳۲ مقدمہ) میں وہی بات دہراتے ہیں۔ صرف یہ ترمیم کرتے ہیں کہ "چودہ شعر" کی جگہ "سولہ شعر" بنا دیتے ہیں۔ جس کا سبب بیسنی روٹی والا دو شعر کا قطعہ ہے جو پہلے ان سے گنتی میں چھوٹ گیا تھا۔ پہلے ایڈیشن کے اشعار کے شمار میں جو سہو ہو گیا تھا وہ بھی دیباچے کے ص ۱۳۱ پر درست کر لیا گیا ہے۔ اب شعر ۱۰۹۶ یا (۳ شعر کم کر کے) ۱۰۹۳ دیے گئے ہیں جو قطعی درست ہے۔ مگر عرشی صاحب کی اس ترمیم کے باوجود دوسرے ایڈیشن میں اب بھی تعدادِ اشعار وہی رہی یعنی (۱۰۹۶+۱۶) ۱۱۱۲ یا (۱۰۹۳+۱۶) ۱۱۰۹ اشعر۔

جناب مالک رام بھی دیوانِ غالب (تاریخِ اشاعت فروری ۱۹۶۹ء) کے ص ۷ پر 'تعارف' میں دوسرے ایڈیشن کی تعدادِ اشعار ۱۱۱۱ بتاتے ہیں۔ پھر دیوانِ غالب صدی ایڈیشن (جو ظاہر ہے ۱۹۶۹ء ہی کی تالیف ہے) کے ص ۱۹ پر رقمطراز ہیں۔

"اس نسخے میں (۱۱۱۱) شعر ہیں۔ یعنی طبعِ اوّل سے ۱۶ زیادہ: ایک تو وہی بیسنی روٹی والا دو شعروں کا قطعہ ہے۔ دوسری "جاں کے لیے" کی زمین کی آخری غزل، جس میں نواب تجمل حسین خاں کی مدح کا قطعہ ملتا ہے۔ اس میں چودہ شعر ہیں۔ ------"

اس سے پہلے ص ۱۶ پر جناب مالک رام بھی پہلے ایڈیشن میں (۱۰۹۸-۳) ۱۰۹۵ شعر ہی بتاتے ہیں۔ اس طرح اس تعداد میں ۱۶ اشعار کا اضافہ کر کے میزان (۱۱۱۱) ہو جاتی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں بھی جناب مالک رام "گفتارِ غالب" (ص ۱۶۷ اور ص ۱۶۹) میں یہی بات دہراتے ہیں۔

عرشی صاحب نے دیوانِ غالب کی دونوں اشاعتوں میں دعویٰ کیا ہے کہ وہ دیوانِ غالب کے ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء کے ایڈیشنوں کے مقابلے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دوسرے ایڈیشن (۱۸۴۷ء) کی تعدادِ اشعار ۱۱۱۲ یا ۱۱۰۹ ہے۔ یعنی پہلے ایڈیشن کے تمام کے تمام ۱۰۹۶ یا ۱۰۹۳ اشعار، اور ۱۶ مزید اشعار، مل کر دوسرے ایڈیشن کا کُل اثاثہ بنتے ہیں۔ وہ حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ "چھے برس کے اندر میرزا صاحب نے اُردو کے کل سولہ شعر کہے تھے"۔

عرشی صاحب معتبر ترین محققوں میں شمار کیے جاتے ہیں اس لیے جناب مالک رام نے عرشی صاحب کے دعوے کو من و عن تسلیم کر لیا مگر حیرت اس بات پر ہے کہ عرشی صاحب دونوں ایڈیشنوں کا مقابلہ کرنے میں اتنی بڑی چوک کیونکر کر گئے۔

اب حقیقتِ حال ملاحظہ فرمائیے۔

پہلے ایڈیشن کے کل شعر ۱۰۹۶

کلکتہ کا جو ذکر ... والے قطعے کے شعر جو سہوًا دوبار چھپ گئے ۳ − / ۱۰۹۳

یہ ۲ شعر پہلے ایڈیشن میں ہیں مگر دوسرے میں نہیں

ع دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
حال آنکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں (ص ۴۹)

ع بے چارہ کتنی دور سے آیا ہے شیخ جی
کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پانو (ص ۵۳) ۲ − / ۱۰۹۱

گویا دوسرے ایڈیشن میں پہلے ایڈیشن کے ۱۰۹۶ نہیں بلکہ ۱۰۹۱ اشعار ضم ہوئے۔

اب دیکھنا چاہیے کہ دوسرے ایڈیشن میں نئے شعر کتنے لیے گئے۔

- قطعہ ع نہ پوچھ اس کی حقیقت ... بیسن کی روغنی روٹی ۲
- غزل ع نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لیے ۱۴
- 〃 ع کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں ۹
- 〃 ع ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں ۱۲
- 〃 ع ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں ۱۳
- 〃 ع کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں ۱۱
- پہلا ایڈیشن ص ۲۵۔ غزل میں ایک شعر کا اضافہ ہوا

ع محابا کیا ہے، میں ضامن، ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا ۱

- پہلا ایڈیشن ص ۲۹۔ غزل میں ایک شعر کا اضافہ

ع خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد ۱

- یہ شعر دیوان میں بڑھایا گیا ع

سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی ۱

(دوسرے ایڈیشن میں سہوًا ہجراں کی جگہ ہیجاں چھپ گیا ہے)

- پہلا ایڈیشن ص ۹۵۔ "منتخب قصیدہ منقبت علی مرتضیٰ علیہ السلام"۔ اس سے ۳ شعر حذف کر دیئے گئے تھے اب وہ دوسرے ایڈیشن میں بحال کر دیے گئے ہیں۔ محذوف اشعار کے شروع کے لفظ یہ ہیں (۱) دہ شہنشاہ (۲) ملک العرش (۳) سبزۂ چمن ۳ / ۶۷

میزانِ اشعارِ نو جو داخلِ دیوان ہوئے ۶۷

میزانِ اشعار (پہلا ایڈیشن) ۱۰۹۱

دیوانِ غالب (دوسرا ایڈیشن) کے کل اشعار ۱۱۵۸

(۳)

(ا) یہ ایڈیشن (تیسرا) "در مطبع احمدی باہتمام امو جان طبع" ہوا تھا۔ دیباچے میں کوئی ترمیم نہیں۔

(ب) تقریظ میں سنہ ۱۲۷۱ھ کر دیا گیا ہے اور تعدادِ اشعار ۱۶۹۵ لکھی گئی ہے حالانکہ صحیح تعداد ۱۷۹۶ ہے۔ تفصیل آگے آئے گی۔

(ج) تقریظ کے بعد نواب ضیاالدین احمد خاں (جنھیں اس دیوان میں کم از کم دو بار نواب محمد ضیاالدین خاں لکھا ہے) کا "قطعۂ تاریخِ انطباعِ دیوان" ہے ع

ہوا ہے حضرتِ غالب کا منطبع دیوان صلائے فیض بگویندگانِ ریختہ ہے
یہی کتاب ہے جس میں کہ اوستادانہ بیانِ ریختہ ہے اور زبانِ ریختہ ہے
بنائے ریختہ استاد ہی نے ڈالی ہے اسی سے قایم اساسِ جہانِ ریختہ ہے

زمینِ شعر میں اترا ہے لشکرِ ابیات　　سو یہ رسالہ نامی نشانِ ریختہ ہے
بنائے ریختہ ۱۲۷۸ھ ایک اور دوسری تاریخ　　بذہنِ نیرِ درخشاں بیانِ ریختہ ۱۲۷۸ھ ہے

ایک اور قطعۂ تاریخ درج ہے جو مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ شاگردِ غالبؔ کا طبع زاد ہے ؎

سرورِ ریاضِ فضل محمد حسین خاں　　ہیں رونقِ بہارِ گلستانِ ریختہ
کہتے ہیں شعر خوب سمجھتے ہیں شعر خوب　　تحسینؔ تخلّص اور زباں دانِ ریختہ
چھاپا اُنھوں نے حضرتِ غالبؔ کا کُلّیات　　وہ کُلّیات جس سے بڑھے شانِ ریختہ
غالبؔ کا میرزا اسد اللہ خاں ہے نام　　ہے واقعی وہ شیرِ نیستانِ ریختہ
لکھی عزیزِؔ خستہ نے تاریخِ انطباع　　حاسدؔ کے سر کو کاٹ کے دیوانِ ریختہ

عبارتِ خاتمۂ دیوان : "داد کا طالب غالبؔ گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوانِ اُردو تیسری بار چھاپا گیا ہے۔ مخلص و داد آئین میر قمر الدّین کی کارفرمائی اور خان صاحبِ لطافت نشاں محمد حسین خاں کی دانائی مقتضی اس کی ہوئی کہ دس جزو کا رسالہ ساڑھے پانچ جزو میں منطبع ہوا۔ اگرچہ یہ انطباع میری خواہش سے نہیں، لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہی ہے اور اغلاط کی تصحیح ہوتی رہی ہے۔ یقین ہے کہ کسی جگہ حرفِ غلط نہ رہا ہو۔ مگر ہاں ایک لفظ میری منطق کے خلاف نہ ایک جگہ بلکہ سو جگہ چھاپا گیا ہے۔ کہاں تک بدلتا؟ ناچار جا بجا یونہی چھوڑ دیا۔ یعنی 'کسو' بکافِ مکسور و سینِ مضموم و واوِ معروف۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں۔ البتہ فصیح نہیں۔ قافیے کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو عیب نہیں، ورنہ فصیح بلکہ افصح 'کسی' ہے۔ واو کی جگہ یائے تحتانی۔ میرے دیوان میں ایک جگہ قافیہ 'کسو' بہ واو ہے اور سب جگہ 'کسی' بہ یائے تحتانی ہے۔ اس کا اظہار ضرور تھا۔ کوئی یہ نہ کہے کہ یہ کیا آشفتہ بیانی ہے؟ 'اللہ بس' ماسوائے ہوس۔"

آگے یہ عبارت درج ہے۔

"مطبع احمدی میں واقع دلہائی امو جان کے اہتمام سے بیسویں محرم الحرام سنہ ۱۲۷۸ ہجری کو مطبوع ہوا۔"

(د) معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۷۰ھ (۵۴-۱۸۵۳ء) میں جب غالبؔ نے اپنے دیوان کے تیسرے ایڈیشن کے لیے مسوّدہ تیّار کیا تو جیسا کہ تقریظ میں لکھّا گیا، مندرجہ اشعار کی تعداد ۱۶۹۰ اور چند تھی۔ پھر جب اُنھوں نے ۱۲۷۱ھ (۲۴ ستمبر ۱۸۵۴ء تا ۱۳ ستمبر ۱۸۵۵ء) میں یا اُس کے کچھ عرصے بعد اپنا دیوان نواب یوسف علی خاں ناظمؔ والیِ رام پور کو تحفے میں بھیجا تو اس میں ۱۷۹۵ شعر درج کیے گویا ۱۰۴ اشعار کا اضافہ کیا۔ (کیونکہ قرائن سے پتا چلتا ہے کہ "۱۶۹۰ اور چند" سے مُراد ۱۶۹۱ اشعار تھی)۔

جب اسی دیوان کی نقل لے کر اور اس میں ذیل کا شعر

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

اضافہ کر کے اسے آخرِ جولائی ۱۸۶۱ء کو مطبعِ احمدی دہلی سے چھپوایا تو اس میں تعدادِ اشعار ۱۷۹۶ ہو گئی۔ یہ تمام اشعار ۱۸۵۷ء سے پہلے کے کہے ہوئے ہیں اور جو اشعار "۱۶۹۰ اور چند" کی تعداد کی تحت میں آتے ہیں وہ تقریبًا ۱۸۵۴ء کے وسط تک کہے جا چکے تھے۔ لہٰذا اضافہ (جو میری دانست میں، مندرجۂ بالا ایک شعر کے علاوہ ۱۰۴ اشعار کا ہے) ذیل کے کلام پر مبنی ہے جو تمام کا تمام ۱۸۵۵ء کا کہا ہوا ہے :

قطعہ	اے شہنشاہِ آسماں	۳۰ شعر
"	نصرت الملک بہادر	۷ "
"	ہے چہار شنبہ	۵ "
"	سہل تھا مسہل	۲ "
"	سیہ گلیم ہوں	۲ "

قطعہ	گو ایک بادشاہ	۲	شعر
مثنوی	ہاں، دلِ دردمند	۳۳	"
رُباعی	اِن سیم کے بیجوں	۲	"
غزل	اعتقاد نہیں (قافیہ، ردیف)	۷	"
"	گذشت کو (" ")	۴	"
"	بہار آئی (" ")	۷	"
"	شہریار کی (" ")	۳	"
	میزان	۱۰۴	شعر

تقریظ میں سالِ تقریظ تو ۱۲۷۱ھ (۵۵/۱۸۵۴ء) کر دیا ہے مگر تعدادِ اشعار وہی "یک ہزار و ششش و دلو دو پنج واند" (پنج، اضافۂ کاتب ہے) لکھی رہ گئی جو حقیقت میں ۱۷۹۵ + ۱ = ۱۷۹۶ ہے۔

(۴)

(ا) یہ ایڈیشن (چوتھا) "مطبع نظامی واقع کانپور" میں چھپا۔ دیباچے میں کوئی ترمیم نہیں۔

(ب) اس میں نواب ضیاالدّین احمد خاں کی لکھی ہوئی تقریظ شامل نہیں۔

(ج) خاتمۃ الطّبع کی عبارت یہ ہے۔

"بخدمتِ اربابِ سخن عرض کرتا ہے۔ امیدوارِ رحمت و غفران محمد عبدالرحمٰن بن حاجی محمد روشن خان طیب اللہ ثراہ کہ اس سے پہلے دیوانِ بلاغت نشان جناب نواب اسداللہ خاں غالبؔ کا دہلی میں چھپا لیکن بسبب سہو و نسیان کے بعض مقام میں تغیّر و تبدّل ہوا۔ اس لیے جناب مجمع لطفِ بیکراں محمد حسین خاں صاحب دہلوی نے بعد نظرِ ثانی اور تصحیح جنابِ مُصنّف کی ایک نُسخہ میرے پاس بھیجا۔ مَیں نے بافضالِ ایزدی مطابق اس نسخہ کے شہر ذی حجہ ۱۲۷۸ھ ہجری مطبع نظامی واقع شہر کانپور میں صحتِ تمام اور درستیِ کمال سے چھاپا۔ اُمید کہ جب ناظرین اس کے مطالعہ سے

حلاوتِ سخن کی پائیں مہتمم کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔ فقط"

پھر خواجہ طالب حسین طالبؔ کے قطعۂ تاریخ اور مالکانِ مطبع کے دستخط اور مُہر پر دیوان ختم ہوتا ہے۔ قطعۂ تاریخ یہ ہے ؎

کیا ہی دیوان چھپا غالبؔ کا — دیکھ کر سب نے کہا خوب ہے یہ
بس کہ ہر ایک کو مرغوب ہوا — ٹھہری تاریخ کہ مرغوب ہے یہ
۱۲۷۸ھ

(د) اس ایڈیشن میں سب ایڈیشنوں سے زیادہ شعر ہیں یعنی ۱۸۰۲ اشعار۔ مَیں نے ابھی ۱۹۸۷ء میں اس کا عکسی ایڈیشن ایک وضاحتی پیش لفظ کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔

(۵)

(ا) اس ایڈیشن (پانچویں) کے سرورق کی عبارت یہ ہے۔

" العلم قوۃ
۱۸۶۳ء
دیوانِ غالبؔ
مطبع مفیدِ خلائق آگرہ میں اہتمام سے منشی شیونارائن کے چھپا"

(ب) دیباچہ مثلِ سابق ہے

(ج) تقریظ میں کوئی ردّ و بدل نہیں۔ تعدادِ اشعار "یک ہزار و ہفصد و نود و اند" بتائی گئی ہے۔ سالِ تصنیف تقریظ ۱۲۷۱ھ ہی ہے۔

(د) خاتمۃ الطبع ندارد۔

(ہ) صحیح تعدادِ اشعار ۱۷۹۵ ہے۔

غالبؔ کی زندگی میں شائع ہونے والے یہ پانچوں ایڈیشن میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان کی حالت اطمینان بخش ہے مگر بعض مقامات دیمک چاٹ گئی ہے اور بعض اوراق کے کچھ حصّے ضائع ہو چکے ہیں۔ اس لیے گزارش ہے کہ اگر کوئی صاحب میری دی ہوئی معلومات سے پورے طور پر مطمئن نہ ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مطلوبہ معلومات میری دسترس سے باہر ہیں۔

توقیتِ غالب

۱۷۳۰ء (قیاساً) غالب کے دادا میرزا قوقان بیگ خان کی سمرقند میں ولادت

۱۷۳۶ء غالب کی دادی کی ولادت ۔ مقامِ ولادت نامعلوم

۱۷۵۲-۵۳ء میرزا قوقان بیگ خان، غالب کے دادا، کی سمرقند سے ہندوستان میں آمد، احمد شاہ ابدالی کے تیسرے حملے (دسمبر ۱۷۵۱ء تا مارچ ۱۷۵۲ء) کے بعد اور معین الملک کی وفات ۳ نومبر ۱۷۵۳ء سے پہلے ۔ وسط ۱۷۵۴ء تک لاہور میں رہے ۔ عالمگیر ثانی کے عہد میں، جو ۲ جون ۱۷۵۴ء سے شروع ہوتا ہے، دہلی پہنچے ۔ چندے تلاشِ معاش میں سرگرداں رہے ۔ پھر شاہ عالم کی شہزادگی کے عہد میں جو ۲۴ اپریل ۱۷۵۶ء سے شروع ہوتا ہے، شاہی ملازم

ہوئے ۔ بعد از مئی ۱۷۷۱ء جب شاہ عالم نے دہلی کی طرف کوچ کیا تو نجف خاں کو بھی الہ آباد سے فوج کا سردار بنا کر اپنے ساتھ کر لیا یہیں سے عہدِ نجف خانی شروع ہوتا ہے اور اُنھی دنوں میں قوقان بیگ خاں نے نجف خاں کی ملازمت قبول کی ۔ بعد میں مستعفی ہو کر مہاراجہ جے پور کے یہاں نوکری ۔ آگرے میں قیام

۱۷۵۸-۵۹ء قتیلؔ کی ولادت شاہجہان آباد میں

۱۷۶۳ء (قیاساً) غالب کے دادا میرزا قوقان بیگ خاں کی شادی

۱۷۶۵ء (قیاساً) غالب کے والد عبداللہ بگ خان کی دلی میں ولادت

۱۷۶۷ء تا ۱۷۸۰ء غالب کے چچا نصراللہ بیگ خان، دو اور چچاؤں (نام نامعلوم) اور تین پھوپھیوں کی ولادت، اندازہ ہے کہ اِنھی بارہ تیرہ سالوں میں ہوئی ہوگی

۱۷۸۲ء (۶ اپریل) ذوالفقار الدولہ نجف خاں کا انتقال ۵۴ سال کی عمر میں

۱۷۸۸ء (قبل از ۳۰ جولائی) میرزا قوقان بیگ خان کا انتقال

۱۷۹۳ء (تقریباً) عبداللہ بیگ خان (غالب کے والد) کی شادی

۱۷۹۵ء (تقریباً) — غالبؔ کی بہن چھوٹی خانم کی ولادت

۱۷۹۷ء (۲۷ دسمبر) — (محمّد) اسداللہ (بیگ) خان (غالبؔ) کی آگرے میں ولادت (قوقان بیگ خان کے بڑے بیٹے عبداللہ بیگ خان کا نکاح آگرے کے ایک امیر فوجی افسر خواجہ غلام حسین خان کی بیٹی عزّت النّساء بیگم سے ہوا۔ عبداللہ بیگ خان اور عزّت النّساء بیگم، محمد اسداللہ بیگ خاں (غالبؔ) کے والدین تھے)

۱۷۹۹ء اواخر — یوسف علی بیگ خان (یعنی مرزا یوسف، غالبؔ کے چھوٹے بھائی) کی ولادت (۱۲۱۴ھ، ۵ جون ۱۷۹۹ء سے شروع ہوتا ہے)

۱۸۰۲ء — سالِ ولادت لاڈو بیگم زوجہ مرزا یوسف

۱۸۰۲ء — میرزا عبداللہ بیگ خان (غالبؔ کے والد) کا ریاست الور کی ملازمت میں انتقال ؎

کافی بود مشاہدہ، شاہد ضرور نیست
در خاکِ راج گڑھ پدرم را بود مزار (غالبؔ)

اسداللہ بیگ خان (غالبؔ) اور ان کے خاندان کا نصراللہ بیگ خان (عبداللہ بیگ خاں کے برادرِ خرد) کی سرپرستی میں آنا (نصراللہ بیگ خان مرہٹوں کی طرف سے آگرے کے قلعدار تھے۔ ۱۸۰۳ء میں انہوں نے قلعہ لارڈ لیک کے حوالے کر دیا۔

اس پر وہ انگریزی فوج میں سترہ سو روپے ماہوار مشاہرے پر چار سو سواروں کے رسالدار مقرر ہو گئے)

۱۸۰۳ء (۱۸ اکتوبر) — آگرے پر انگریزوں کا قبضہ

۱۸۰۶ء (؟ اپریل) — نصراللہ بیگ خان کا ہاتھی سے گر کر زخمی ہونا اور انتقال (نواب احمد بخش خان، والیِ فیروز پور جھرکا و لوہارو، کی ہمشیرہ نصراللہ بیگ خان کے عقدِ نکاح میں تھی)

۱۸۰۶ء (۴ مئی) — احمد بخش خان کی سفارش پر انگریزوں کی طرف سے نصراللہ بیگ خان کے پس ماندگان کا وظیفہ دس ہزار روپیہ (پہلا شقہ) (اس وظیفے میں نصراللہ بیگ خان کی والدہ، تین بہنیں، اسداللہ بیگ خان یعنی غالبؔ اور ان کے چھوٹے بھائی یوسف علی بیگ خان حصّہ دار تھے)

۱۸۰۶ء (۷ جون) — وظیفہ کی رقم دس ہزار سے گھٹا کر پانچ ہزار سالانہ کر دی گئی۔ (دوسرا شقہ) غالبؔ کا حصّہ ساڑھے سات سو روپے سالانہ (اس شقہ کی رُو سے ایک شخص خواجہ حاجی بھی اس وظیفے میں دو ہزار سالانہ کا حصّہ دار قرار دیا گیا تھا)

۱۸۰۶ء (۲۸ نومبر) — جلال الدین شاہ عالم ثانی کا انتقال، معین الدین اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی

۱۸۰۶ء تا ۱۸۲۵ء — غالبؔ کی دادی کا انتقال

(غالبؔ کے عرضی دعوے سے پتا چلتا ہے کہ ۱۸۰۶ء میں ان کی دادی زندہ تھی اور جب ۱۸۲۵ء میں خواجہ حاجی فوت ہوئے تو اس سے پہلے ان کی دادی کا انتقال ہو چکا تھا۔ غالباً ۱۸۲۵ء سے بہت پہلے)

۱۸۰۷-۸ء (تقریباً) — شعر گوئی کا آغاز۔ اسدؔ تخلّص

چونکہ لوگ ایک اور شاعر میر امانی اسدؔ تخلّص کا کلام غالبؔ (اسدؔ) سے منسوب کرنے لگے تھے اس لیے اسدؔ تخلّص ترک کر کے (لگ بھگ ۱۸۱۶ء میں) غالبؔ تخلّص رکھ لیا گیا۔ تاہم کبھی کبھی اسدؔ تخلّص بھی روا رکھّا

۱۸۱۰ء — قلندر بخش جرأتؔ کی لکھنؤ میں وفات (۱۲۲۵ھ، ۶ فروری ۱۸۱۰ء سے شروع ہوتا ہے اور ۲۵ جنوری ۱۸۱۱ء کو ختم ہوتا ہے)

۱۸۱۰ء (تقریباً) — اسداللہ بیگ خان (غالبؔ) کی مولوی محمد معظّم کے مکتب (آگرہ) میں تعلیم (بحوالہ عیار الشعرا از خوب چند ذکاؔ، گلستانِ بے خزاں از قطب الدّین باطنؔ۔ بعد میں حالیؔ وغیرہ)

۱۸۱۰ء (۱۹ اگست) — الٰہی بخش خان معروفؔ کی چھوٹی بیٹی امراؤ بیگم سے دِلّی میں نکاح ۷ رجب ۱۲۲۵ھ تاریخِ نکاح حقیقت میں ۱۷ رجب ۱۲۲۵ھ ہے (الٰہی بخش خان، نواب احمد بخش خان کے چھوٹے بھائی تھے۔ نکاح

کے وقت غالبؔ کی عمر تیرہ سال کی تھی اور امراؤ بیگم کی گیارہ سال کی۔ معروفؔ کا نامکمّل دیوان چھپ چکا ہے۔ دیوانِ مطبوعہ کے علاوہ ایک مخطوطہ مکتوبہ ۱۲۴۶ھ بھی میرے کتب خانے میں ہے)

۱۸۱۰ء (۲۰ ستمبر) — میر تقی میرؔ کی لکھنؤ میں وفات

۱۸۱۲-۱۳ء — غالبؔ کی دِلّی میں آمد اور مستقل سکونت

۱۸۱۴ء ۱۹ اگست تا ۱۸۱۷ء ۸ جولائی — کسی بھی سال میں مرزا یوسف کی شادی (یقینی دن، تاریخ اور مہینہ۔ دوشنبہ (سہ شنبہ؟) ۲۲ شعبان)

۱۸۱۵-۱۶ء — غالبؔ کی پہلی مُہر (۱۲۳۱ھ) غالبؔ کی عمر ۱۸-۱۹ برس کی تھی یعنی ان کے عیش و نشاط کا زمانہ تھا۔

اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ
۱۲۳۱ھ

غالبؔ کی دوسری مُہر

اسداللہ الغالب
۱۲۳۱ھ

(یہ دونوں مُہریں ایک ہی سال میں بنوائی گئیں)

اس مُہر کی بنا حضرت علی کا لقب ہے اور یہ بطورِ سجع ہے۔ شاید تبدیلِ تخلّص کے وقت یہی سجع کام آیا اور اسی سال اسدؔ کی جگہ غالبؔ تخلّص قرار پایا۔ (۱۲۳۱ھ، ۳ دسمبر ۱۸۱۵ء سے شروع ہوتا ہے)

۱۸۱۶ء	غالبؔ تخلّص کا باقاعدہ استعمال
۱۸۱۶ء (۱۱جون)	دیوانِ اُردو بخطِ غالبؔ کی کتابت کی تاریخ (۱۴ رجب سہ شنبہ سنہ ۱۲۳۱ھ ؟)
۱۸۱۷ء (۱۹مئی)	اِنشاء کی لکھنؤ میں وفات
۱۸۲۲-۲۳ء	غالبؔ کی تیسری مہر — محمد اسد اللہ خاں ۱۲۳۸ھ
۱۸۲۳ء (۳مئی)	نواب احمد بخش خاں پر قاتلانہ حملہ
۱۸۲۴-۲۵ء	مصحفی کی لکھنؤ میں وفات (۱۲۴۰ھ ۔ ۲۶ اگست ۱۸۲۴ء سے شروع ہوتا ہے)
۱۸۲۵ء	خواجہ حاجی کا انتقال (انتقال شاید ۱۸۲۵ء کے شروع میں ہوا ہوگا۔ ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء کی پنشن کی درخواست میں غالبؔ نے لکھا ہے کہ خواجہ حاجی کا انتقال تین برس ہوئے جذام کے مرض سے ہوا)
۱۸۲۵ء (تقریبًا جون)	فیروز پور جھرکا کا سفر۔ نواب احمد بخش خان کی خدمت میں بسلسلۂ حق پنشن۔ یہ بات جنرل اختر لونی کے انتقال (۱۵ جولائی ۱۸۲۵ء) سے کچھ پہلے کی ہے۔ ناکام واپس پلٹے

۱۸۲۵ء (شاید اکتوبر)	میرزا یوسف (علی بیگ خان) کی شدید بیماری، دیوانگی کا آغاز
۱۸۲۵ء (۲۸ نومبر؟)	نواب احمد بخش خان کی معیت میں سر چارلس مٹکاف اور ان کی فوجوں کے ساتھ بھرت پور کا سفر (اسے سفرِ کلکتہ کا آغاز کہہ سکتے ہیں کیوں کہ اب کے جو دہلی سے نکلے تو پھر ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء ہی کو سفرِ کلکتہ ختم کر کے واپس آسکے۔ مقصد سر چارلس مٹکاف سے ملنا تھا)
۱۸۲۵ء (بعد از ۱۸ دسمبر)	واپسی پر ایک لمبے عرصے تک فیروز پور جھرکا میں نواب احمد بخش خان کے ساتھ قیام
۱۸۲۶ء (آغازِ سال تا اواخرِ ستمبر)	فیروز پور ہی میں رُکے رہے کیوں کہ احمد بخش خاں یا الور میں یا اپنے بیٹے شمس الدّین خان کی جانشینی وغیرہ کے معاملات میں بیشتر فیروز پور سے باہر ہی رہے۔ غالبؔ مایوس ہو گئے
۱۸۲۶ء (اوائلِ اکتوبر)	غالبؔ کی فرخ آباد کے راستے کان پور کو روانگی۔ قرض خواہوں کے ڈر سے دہلی نہ گئے اس لیے فیروز پور ہی سے کلکتّے کے سفر پر نکل کھڑے ہوئے
۱۸۲۶ء	الٰہی بخش خان معروف (غالبؔ کے خُسر) کا انتقال (انتقال ۱۲۴۲ھ میں ہوا تھا جو ۶ اگست ۱۸۲۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ گویا ۶ اگست ۱۸۲۶ء اور ۳۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کے درمیان کسی وقت)

۱۸۲۶ء (۱۳ اکتوبر)	نواب احمد بخش خان کی فیروز پور جھرکا اور لوہارو کی حکومت سے دستبرداری (احمد بخش خاں کے اس خیال کی ایک وجہ شاید اپنے چھوٹے بھائی معروف کی وفات بھی ہو) نواب شمس الدین احمد خان والیِ ریاست
۱۸۲۶-۲۷ء	فارسی میں شعرگوئی کا باقاعدہ آغاز [اس سے پہلے کا سرمایۂ شعرِ فارسی ناقابلِ اعتناء اور مقدار میں بہت کم ہے۔ گلِ رعنا میں شامل فارسی انتخاب اس پر شاہد ہے کہ ۱۸۲۸ء (۱۲۴۴ھ) تک ان کے پاس ۲۷ غزلوں سے زیادہ فارسی کلام نہ تھا اور وہ بھی اسی سفرِ کلکتہ کے دوران کہا گیا تھا۔ غالب کے قدیم ترین خطی نسخے میں بھی اردو کا تو مکمل مرتّب دیوان ہے مگر فارسی کی صرف ۱۳ رباعیاں ہیں]
۱۸۲۷ء (۲۴ ستمبر تا ۲۲ اکتوبر)	نواب احمد بخش خان کا انتقال۔ غالب کو یہ خبر سفرِ کلکتہ کے دوران میں مرشد آباد میں ملی
۱۸۲۸ء (۱۹ فروری یا ۲۱ فروری)	کلکتہ میں ورود۔ اسی روز شملہ بازار (متصل چیت بازار) میں گول تالاب کے نزدیک مرزا علی سوداگر کی حویلی میں رہنے کو مکان مل گیا۔ [غالب نے سہ شنبہ چہارم شعبان (۱۲۴۳ھ) لکھا ہے۔ سہ شنبہ کو ۲ شعبان تھا جو ۱۹ فروری کے مطابق ہے۔ ۴ شعبان کو پنج شنبہ تھا جو مطابق ہے ۲۱ فروری کے]

۱۸۲۸ء (۲۸ اپریل)	پنشن کے مقدمے کا آغاز
ایضاً	پنشن کی درخواست میں مذکور ہے کہ "میرا نام محمد اسد اللہ خاں ہے"۔ (اس کے سامنے وہ خط بنام تفتہ بھی دیکھیے جس میں غالب نے لکھا ہے کہ وہ اب 'محمد' کا لفظِ مبارک اپنے نام کے ساتھ اس لیے نہیں لگاتے کہ لوگوں نے لکھنا ترک کر دیا تھا۔ لہٰذا انھوں نے بھی موقوف کیا)
ایضاً	غالب نے درخواست میں لکھا کہ آج ان پر بیس ہزار روپیہ قرض ہے
(۱۱ ستمبر)	گلِ رعنا کی ترتیب و تدوین مکمل۔ اردو اور فارسی کلام کا یہ انتخاب انھوں نے اپنے کلکتے کے ایک دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر خود اپنے قلم سے کیا تھا
۱۸۲۹ء (۱۶ فروری)	گورنر جنرل کے دربار میں شمولیت۔ نواب اکبر علی خاں کے ساتھ دسویں نشست
۱۸۲۹ء (یکم اگست)	پھر گورنر جنرل کے دربار میں شمولیت۔ معلوم ہوا کہ گورنر جنرل ہندوستان کے دورے پر نکلیں گے۔ غالب نے بھی واپس دہلی آنے کا ارادہ کر لیا

۱۸۲۹ء (۲۹ نومبر) چار برس کی غیر حاضری کے بعد دلّی واپس۔ سفرِ کلکتّہ ختم

۱۸۳۰ء (۱۶ اگست) نظیؔر اکبرآبادی کی وفات

۱۸۳۰ء (۱۹ نومبر) راجا رام موہن رائے کا سفرِ انگلستان ۔ کمپنی کے البیون (ALBION) نامی، بحری جہاز سے

۱۸۳۱ء (۲۷ جنوری) مقدّمۂ پنشن خارج
(اس کے بعد وہ اپیل کرتے رہے۔ جس کا سلسلہ ۱۸۴۴ء تک رہا۔ لیکن ابتدائی فیصلہ قائم رہا)

۱۸۳۲ء (تقریبًا) شیفتہؔ کی غالبؔ سے پہلے پہل جان پہچان

۱۸۳۳ء (۱۶ اپریل) دیوانِ متداول (اُردو) کی تاریخِ ترتیب

۱۸۳۴ء (۱۸ اکتوبر) شمس الدّین خان کے داروغۂ شکار کریم خاں کی انیا میواتی کے ساتھ انگریزوں کے ایجنٹ ولیمؔ فریزر کے قتل کے لیے دہلی میں آمد، تین مہینے دہلی میں رہا مگر ناکام لوٹا۔ پھر دہلی واپس آیا

۱۸۳۵ء (۲۲ مارچ) ولیم فریزر کا قتل ۔ نواب شمس الدّین احمد خاں کے داروغۂ شکار کریم خاں کی گرفتاری

۱۸۳۵ء (۱۸ اپریل) نواب شمس الدّین احمد خان کی الزامِ قتل میں گرفتاری

۱۸۳۵ء (۲۹ اپریل) دیوانِ غالبؔ فارسی، "میخانۂ آرزو سرانجام" کے نام سے مرتّب ۔
یہ ترتیب ۱۲۵۰ھ (مطابق ۱۰ مئی ۱۸۳۴ء تا ۲۹ اپریل ۱۸۳۵ء) میں مکمّل ہوئی

۱۸۳۵ء (۲۶ اگست) کریم خان کو بجرمِ قتل پھانسی کی سزا

۱۸۳۵ء (۸ اکتوبر) نواب شمس الدّین احمد خان کو بالزامِ اعانتِ مجرمانہ پھانسی
(اس پر فیروز پور جھرکا کا علاقہ انگریزوں نے واپس لے لیا۔ اس کے بعد غالبؔ کی پنشن، ساڑھے سات سو روپے سالانہ، ریاست لوہارو کی جگہ انگریزی خزانے سے ادا ہونے لگی)

۱۸۳۵ء (۲۰ مارچ) تا ۱۸۳۶ء (۴ مارچ) سر چارلس مٹکاف، ایکٹنگ گورنر جنرل

۱۸۳۷ء (مئی) جامِ جہاں نما کلکتّہ بابت، جون ۱۸۳۷ء میں درج ہے کہ میرزا اسد اللہ خاں، یوسف خاں کی ملاقات کو جا رہے تھے کہ اثنائے راہ میں عدالت کے چپراسی نے دو سو پچاس روپے کی نالش کی بابت جو میکفرسن صاحب نے کی تھی، اُنھیں گرفتار کر کے ناظر کے مکان میں قید کر دیا۔ چنانچہ (نواب) امین الدّین خاں نے چار سو روپیہ مع اصل و سود ادا کر کے رہا کرایا۔ میکفرسن مشہور شراب فروش انگریز تھے

۱۸۳۷ء (۲۸ ستمبر) (۶ بجے شام) — معین الدّین اکبر شاہ ثانی کا انتقال

۱۸۳۷ء (۲۹ ستمبر) (علی الصّباح تین بجے) — سراج الدّین بہادر شاہ ظفؔر کی تخت نشینی

۱۸۳۷ء (۲۰ نومبر) — راج دربار سے فارسی زبان خارج کرنے کا حکم

۱۸۳۸ء (۱۵ اگست) — ناؔسخ کا لکھنؤ میں انتقال

۱۸۳۸ء (۲۳ نومبر) — شاہ نصیؔر کا حیدرآباد میں انتقال (۲۵ شعبان ۱۲۵۴ھ — ولادت تقریباً ۱۱۷۴ھ مطابق ۶۱-۱۷۶۰ء)

۱۸۳۹ء (۲۷ جون) — مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انتقال

۱۸۴۰ء (؟) — غالبؔ کی والدہ کی علالت اور انتقال (ایک فارسی تحریر کے پیشِ نظر وہ ۳۰ جنوری ۱۸۴۰ء تک زندہ تھیں)

ایضاً — دلّی کالج میں مدرّسِ فارسی کے عہدے کی پیشکش اور غالبؔ کا انکار

۱۸۴۰ء فروری — "حکیم احسن اللہ خاں کو خلعت چھ پارچہ کا، تین رقم جواہر معہ خطاب عمدۃ الحکما معتمد الملک حاذق الزّماں حکیم احسن اللہ خان بہادر ثابت جنگ مرحمت ہوا۔ حکیم مذکور بجائے حکیم

شرف الدّین کے ۔ ۔ ۔ ۔ سرفراز ہوئے"۔ (دہلی اردو اخبار ۲۳ فروری ۱۸۴۰ء)

۱۸۴۱ء (قبل از ۱۵ اگست) — غالبؔ کی، گھر پر جُوا خانے کے قیام میں، گرفتاری (عدالت نے سو روپیہ جرمانہ کیا، عدمِ ادائیِ جرمانہ کی صورت میں چار مہینہ قید۔ جرمانہ ادا کر دیا گیا)

۱۸۴۱ء (اکتوبر) — دیوانِ اردو کا پہلا ایڈیشن (مطبع سیّد الاخبار، دہلی۔ اگرچہ دیوان ۱۸۳۳ء میں مرتّب ہو چکا تھا)

۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۴ء — بعہدِ لارڈ ڈالن برا گورنر جنرل، غالبؔ کو خلعت ہفت پارچہ اور سہ رقم جواہر کا اعزاز

۱۸۴۴ء — میر نظام الدّین ممنوؔن کا دہلی میں انتقال

۱۸۴۵ء — دیوان (کلیاتِ نظم) فارسی کا پہلا ایڈیشن (مطبع دارالسّلام دلّی) دیوان ۱۸۳۵ء میں مرتّب ہو چکا تھا

۱۸۴۷ء — زین العابدین خان عارؔف کے بڑے بیٹے، باقر علی خاں کا سالِ ولادت

۱۸۴۷ء (۱۳ جنوری) — آتشؔ کا لکھنؤ میں انتقال

۱۸۴۷ء (مئی)	دیوانِ اُردو کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت (مطبع دارالسلام دہلی)
۱۸۴۷ء (۲۵ مئی)	گھر پر جُوا خانہ قائم کرنے کے الزام میں غالبؔ کی دوبارہ گرفتاری (فیصلے میں چھ ماہ قیدِ بامشقّت اور دو سو روپیہ جرمانے کی سزا ہوئی۔ مشقّت غالباً پچاس روپئے ادا کرکے معاف ہوگئی۔ صرف تین مہینے قید میں رہنے کے بعد رہا)
۱۸۴۸ء (۹ مارچ)	غالبؔ کا پہلا اُردو خط (بنام نبی بخش حقیر۔ اب ایک خط بنام تفتہ کو غالبؔ کا پہلا اُردو خط تسلیم کیا جا رہا ہے۔ اس خط پر تاریخ درج نہیں مگر قیاس ہے کہ خط ۱۸۴۷ء کا لکھّا ہوا ہے)
۱۸۴۹ء (۴ اگست)	پنج آہنگ (فارسی) کا پہلا ایڈیشن (مطبعِ سُلطانی، لال قلعہ، دہلی)
۱۸۵۰ء	زین العابدین خان عارفؔ کے چھوٹے بیٹے، حسین علی خان کا سالِ ولادت
۱۸۵۰ء (۴ جولائی)	تیموری خاندان کی تاریخ (مہرِ نیمروز) لکھنے پر مقرّر، چھ پارچے اور تین رقم جواہر کا خلعت اور خطاب نجم الدّولہ، دبیر الملک نظام جنگ عطا ہوا (تاریخ نویسی کی تنخواہ چھ سو روپیہ سالانہ مقرّر ہوئی)

۱۸۵۰-۵۱ء	حافظ عبدالرحمٰن خان (حافظ جیو) احسانؔ دہلوی کا دہلی میں انتقال۔ (۱۲۶۷ھ، ۶ نومبر ۱۸۵۰ء سے شروع ہوتا ہے)
۱۸۵۰-۵۱ء	غالبؔ کی چوتھی مُہر (خطاب بہادر شاہ ظفرؔ نے ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو دیا، جو ۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ کے مطابق ہے۔ مُہر ۱۲۶۷ھ میں بنوائی گئی، جو ۶ نومبر ۱۸۵۰ء سے شروع ہوتا ہے)

۱۸۵۲ء (اپریل)	زین العابدین خان عارفؔ (امراؤ بیگم کے بھانجے) کی وفات (عارفؔ اور پھر عارفؔ کی والدہ بنیادی بیگم کی وفات کے بعد عارفؔ کے دونوں لڑکوں کو امراؤ بیگم نے پالا) قبر مزارِ غالبؔ کے قریب کونے میں ہے
۱۸۵۲ء (۴ امئی)	مومنؔ کا دِلّی میں انتقال
۱۸۵۲ء (اگست؟)	مثنوی شانِ نبوّت و ولایت کی اشاعت مولوی محمد سالم کی نثر کا غالبؔ کا کیا ہوا یہ منظوم ترجمہ بہادر شاہ ظفرؔ کے حکم سے (جو ۹ شوال ۱۲۶۸ھ مطابق ۲۷ جولائی ۱۸۵۲ء کو دیا گیا تھا) مطبع سلطانی سے چھپا تھا۔ اس کے کل صفحے ۱۱ ہیں۔ پہلے اس میں ۱۰۱ شعر تھے جب اسے کلیاتِ غالبؔ (فارسی) میں شامل

کیا گیا تو اس کے آخری تین شعر نکال کر ۳۰ مزید شعروں کا
اضافہ کر دیا گیا۔ اس طرح اب اس کے ۱۲۸ شعر ہیں

۱۸۵۲-۵۳ء — غالب کی پانچویں مہر
(غالب حضرت علی کو
مشکل کشا مانتے تھے

یا اسد اللہ الغالب
۱۲۶۹ھ

شاید یہ مہر ان کے سقیم حالات کی نشاندہی کرتی ہے۔ ۱۲۶۹ھ،
۱۵ اکتوبر ۱۸۵۲ء سے شروع ہوتا ہے)

۱۸۵۳ء (اپریل) — پنج آہنگ کا دوسرا ایڈیشن (مطبع دار السلام، دہلی)

۱۸۵۳ء (۲۰ دسمبر) — غالب کی بڑی اور آخری پھوپھی کا انتقال
(اس پھوپھی کی وفات کے ساتھ، قوقان بیگ خاں کی
صلبی اولاد (بیٹے، بیٹیوں) کا خاتمہ ہو گیا)

۱۸۵۴ء — حالی پہلی مرتبہ دہلی آئے بعمر ۱۷-۱۸ برس۔
ڈیڑھ برس کے بعد اواخر ۱۸۵۵ء میں واپس پانی پت۔
سال بھر حصار میں ملازمت کی

۱۸۵۴ء (اکتوبر) — غلام حسین خاں مسرور (زین العابدین خان عارف
کے والد اور غالب کے ہم زلف) کا انتقال

۱۸۵۴ء (۱۵ نومبر) — شیخ محمد ابراہیم ذوق (استادِ ظفر) کا انتقال
(بعد از انتقالِ ذوق، غالب استادِ ظفر مقرر ہوئے)

۱۸۵۴-۵۵ء — مہرِ نیم روز کی طباعت و اشاعت (فخر المطابع، دلی)۔ ۱۲۷۱ھ،
۲۴ ستمبر ۱۸۵۴ء سے شروع ہوتا ہے
(یہ اسی سال میں کم از کم تین بار چھپی۔ یہ سب ایڈیشن جو پہلا
ایڈیشن ہی کہلاتے ہیں۔ میرے کتب خانے میں موجود ہیں)

۱۸۵۵ء (۴ جون) — بنیادی بیگم (امراؤ بیگم کی بڑی بہن اور والدۂ عارف) کا انتقال

۱۸۵۶ء (از ۱۴ ستمبر تا ۳۱ دسمبر) — قادر نامہ کی اشاعت اوّل (مطبع سلطانی، لال قلعہ، دہلی)۔ ۱۲۷۲ھ
(یہ نظم غالب نے عارف کے دونوں بچوں کو فارسی اور اردو
پڑھانے کے لیے کہی تھی)

۱۸۵۶ء (۷ فروری) — الحاقِ اودھ (۳ مارچ ۱۸۵۶ء کو واجد علی شاہ لکھنؤ سے
کلکتہ چلے گئے)

۱۸۵۶ء (۱۰ جولائی) — غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو (ولی عہد بہادر شاہ ظفر)
کا انتقال

۱۸۵۷ء (۲۸ جنوری) — غالب نے مولانا فضل حق خیر آبادی کی تحریک پر والیِ رام پور
نواب محمد یوسف علی خاں کی خدمت میں قصیدہ بھیجا

۱۸۵۷ء (۵ فروری) غالب کا تقرّر بطورِ استادِ نواب یوسف علی خاں، ناظمؔ والیِ رام پور

۱۸۵۷ء (مارچ۔ اپریل) غالب کے رازدارانہ خطوط بنام والیِ رام پور
(قوی گمان ہے کہ یہ سیاسی امور پر مشتمل تھے۔ اس لیے
غالب کی ہدایت پر یہ خطوط ضائع کر دیے گئے)

۱۸۵۷ء (۱۰ مئی) سنہ اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامے (غدر) کا میرٹھ سے آغاز

۱۸۵۷ء (۱۱ مئی) دیسی فوج (تلنگوں) کا دہلی میں داخلہ: انگریزی تسلّط کا
خاتمہ، دیسی اقتدار کا قیام: غالب کی قلعہ کی تنخواہ اور
انگریزی پنشن بند

۱۸۵۷ء (۲۰ ستمبر) انگریزوں کی فتح اور دہلی پر دوبارہ قبضہ

۱۸۵۷ء (ستمبر) غدر کے بعد دہلی پر دوبارہ انگریزی قبضے کے دوران میں امام
بخش صہبائیؔ انگریزوں کی گولی کا نشانہ بنے

۱۸۵۷ء (۱۸-۱۹ اکتوبر) میرزا یوسف (علی بیگ خاں برادرِ غالب) کی وفات (وہ
انگریزی فوج کی گولی کا نشانہ بنے تھے، اگرچہ، غالب نے مصلحتاً
لکھّا ہے کہ وفات بخار سے ہوئی)

۱۸۵۸ء (نومبر) دستنبو کی اشاعتِ اوّل (مطبع مفیدِ خلائق، آگرہ)

۱۸۵۹ء سِکّہ کا الزام۔ خط بنام حسین مرزا۔ نوشتہ ۱۸ جون ۱۸۵۹ء
(گوری شنکر مخبر نے سکّے کی رپورٹ منسوب بہ غالب
۱۹ جولائی ۱۸۵۷ء ہی کو انگریزوں کو پہنچا دی تھی)

۱۸۵۹ء (۱۰ جولائی) والیِ رام پور سے مستقل وظیفے کی درخواست اور اسی مہینے سے
سو روپے ماہوار بطورِ وظیفہ مقرّر

۱۸۶۰ء (جنوری) گورنر جنرل یکم جنوری ۱۸۶۰ء کو دہلی آئے تھے۔ کچھ دنوں بعد
ہی غالب ان سے ملنے ان کی قیام گاہ پر گئے ہوں گے۔
جواب ملا کہ "فرصت نہیں" اور کہ "تم" باغیوں سے اخلاص رکھتے
تھے"۔ یہ سلوک سکّے کے الزام کی وجہ سے تھا۔ درحقیقت یہ سکّہ
حافظ ویرآن شاگردِ ذوقؔ کا کہا ہوا تھا جو صادق الاخبار کے
۱۳ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ (مطابق ۶ جولائی ۱۸۵۷ء) کے شمارے
میں شائع ہوا تھا۔ گوری شنکر مخبر کو ویرآن کی جگہ غالب کا
نام یاد رہ گیا

۱۸۶۰ء (۱۹ جنوری) رام پور کا پہلا سفر (۲۷ جنوری کو رام پور پہنچے)

۱۸۶۰ء (۲۴ مارچ) رام پور سے واپسی (۱۷ مارچ کو رام پور سے روانہ ہوئے تھے)

۱۸۶۰ء (مئی) انگریزی پنشن کا دوبارہ اجراء
(تین برس کا بقایا ساڑھے سات سو سالانہ کے حساب سے

۲۲۵۰ روپے وصول ہوا

۱۸۶۱ء (۲۹ جولائی) دیوان اُردو کا تیسرا ایڈیشن (مطبع احمدی، دہلی)

۱۸۶۱ء (۱۹ اگست) مولانا فضلِ حق خیرآبادی کا جزیرۂ انڈمان میں انتقال

۱۸۶۱-۶۲ء غالب کی چھٹی مہر

غالب
۱۲۷۸ھ

(یہاں سے غالب کی زندگی کا انتہائی شہرت کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ یہ مختصر علَم ان کی اَنا کا نقطۂ عروج ہے۔ سات سال بعد ان کا انتقال ہوا۔ یہ ان کی آخری مہر تھی گویا ان کی اَنا کا مظاہرہ ان کے انتقال تک پوری آب و تاب کے ساتھ جاری رہا۔ ۱۲۷۸ھ، ۱۰ جولائی ۱۸۶۱ء سے شروع ہوتا ہے)

۱۸۶۲ء قاطع برہان کی طبعِ اوّل (مطبع نولکشور، لکھنؤ)

۱۸۶۲ء (۲ مارچ) انگریزی درباروں میں کرسی نشینی اور خلعت کے اعزاز کا دوبارہ اجراء

۱۸۶۲ء (جون) دیوان اُردو کا چوتھا ایڈیشن (مطبع نظامی، کان پور)

۱۸۶۲ء (یکم اکتوبر) لاڈو بیگم بیوہ مرزا یوسف کی حکومت سے درخواست گزارے کے لیے

۱۸۶۳ء (مئی/جون) دیوانِ فارسی (کلیاتِ نظمِ فارسی) کا دوسرا ایڈیشن (مطبع نولکشور، لکھنؤ)

۱۸۶۳ء (بعد از جون) دیوانِ اُردو کی پانچویں اور آخری اشاعت (مطبع مفیدِ خلائق، آگرہ)

۱۸۶۳ء (جولائی) یکم اکتوبر ۱۸۶۲ء سے ۲۰ روپے مہینہ، خیراتی پنشن بنام لاڈو بیگم زوجہ مرزا یوسف مرحوم، جاری

۱۸۶۴ء مثنوی ابرِ گہربار کی اشاعت (اکمل المطابع، دلی)
(یہ مثنوی کلیاتِ نظم میں شامل تھی، لیکن اب الگ سے شائع ہوئی)

۱۸۶۴ء قاطعِ برہان کے جواب میں محرقِ قاطعِ برہان مصنفہ سید سعادت علی کی اشاعت (مطبع احمدی، دلی)

۱۸۶۴ء قادر نامہ کی دوسری اشاعت (محبس پریس، دلی)

۱۸۶۴ء سر جان لارنس، گورنر جنرل

۱۸۶۴ء لطائفِ غیبی (اگرچہ نام میاں داد خان سیّاح کا ہے مگر اس کے اصل مصنف غالب ہی ہیں)

۱۸۶۴ء انتخابِ غالب کی ترتیب (مزید کوائف ۱۸۶۶ء کے تحت دیکھیے)

۱۸۶۵ء	سوالاتِ عبدالکریم از عبدالکریم کی اشاعت ۔ اکمل المطابع، دِلّی ۔ (دوسرے کے نام سے شائع ہوئی لیکن یہ بھی غالبؔ کی اپنی تصنیف ہے)
۱۸۶۵ء	دافعِ ہذیان مصنفہ سیّد محمد نجف علی جھجری کی اشاعت
۱۸۶۵ء	ساطع برہان از مرزا رحیم بیگ رحیم میرٹھی کی اشاعت
۱۸۶۵ء	غالبؔ نے حکومت سے تین مطالبے کیے کہ اُنھیں شاعرِ دربار مقرّر کیا جائے، پہلے سے اونچی جگہ ملے اور دستنبو حکومت اپنے خرچ پر شائع کرے ۔ حکم ہوا کہ تحقیقات کی جائے کہ غدر میں غالبؔ کا رویّہ کیا تھا ۔ رپورٹ ہوئی کہ ان سے سکّہ منسوب ہے ۔ سب درخواستیں ردّ ہو گئیں ۔ غالبؔ پر سکّہ کا الزام ان کی زندگی میں غلط ثابت نہ ہو سکا ۔
۱۸۶۵ء (۲۱ اپریل)	نواب یوسف علی خان والیِ رام پور کا انتقال، نواب کلب علی خان کی جانشینی
۱۸۶۵ء (اگست)	غالبؔ کے رسالے نامۂ غالبؔ بجوابِ ساطعِ برہان کی اشاعت (مطبع محمدی، دِلّی)
۱۸۶۵ء (۷ اکتوبر)	مرزا غالبؔ کا رام پور کا دوسرا سفر ۔ ۱۲ اکتوبر کو رام پور پہنچے

۱۸۶۵ء	دستنبو کا دوسرا ایڈیشن (مطبع لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ، بریلی)
۱۸۶۵ء (دسمبر)	قاطع برہان کی طباعتِ ثانی بعنوان درفشِ کاویانی (اکمل المطابع، دِلّی)
۱۸۶۵ء (دسمبر)	رام پور کے دوسرے سفر سے واپسی ۔ (۲۸ دسمبر کو رام پور سے روانہ ہوئے اور ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو دِلّی پہنچے)
۱۸۶۶ء	قاطع برہان کے جواب میں مؤیدِ برہان مصنفہ مولوی احمد علی احمدؔ جہانگیر نگری کی اشاعت (مطبع مظہر العجائب، کلکتّہ)
۱۸۶۶ء	قاطع برہان کے جواب میں قاطع القاطع مصنفہ امین الدّین امینؔ دہلوی کی اشاعت (مطبع مصطفائی، دہلی)
۱۸۶۶ء	انتخابِ غالبؔ کی اشاعت ۔ پہلے حصّے میں دو دیباچے، ۱۲ خط، ۲ نقلیں اور ایک لطیفہ ہے ۔ دوسرے حصّے میں اُردو کے ۱۳۱ منتخب شعر ہیں ۔ مولوی ضیاءالدّین خاں نے اس کے خطوط معمولی ردّ و بدل کے بعد اپنی مرتبہ انشائے اُردو (حصّہ دوّم) میں شامل کر کے ۱۸۶۶ء میں مطبع فیضِ احمدی سے شائع کر دیے تھے ۔ نہیں معلوم کہ یہ مکمّل انتخابِ غالبؔ کی زندگی میں کبھی شائع ہوا تھا کہ نہیں مگر بیسویں صدی میں یہ انتخاب پہلے تین بار ناقص چھپ چکا ہے ۔ میں نے اسے اب (۱۹۹۲ء) میں اصل مخطوطے کے عکس اور

تعارفی پیش لفظ کے ساتھ "انتخاب رقعات و اشعارِ غالب" کے
نام سے شائع کر دیا ہے۔"

۱۸۶۷ء (؟) — دُعائے صباح۔ فارسی منظوم ترجمہ (مطبع نولکشور لکھنؤ)
(اس کا آج تک ایک ہی مطبوعہ نسخہ دریافت ہوا ہے جو میرے
کتب خانے میں ہے۔ اس کا ایک ہو بہو ایڈیشن میں نے
۷۷ء میں اپنے مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا تھا)

۱۸۶۷ء — تیغ تیز کی اشاعت (اکمل المطابع، دہلی)
(غالب نے یہ مختصر رسالہ مؤید برہان کے جواب میں لکھا تھا)

۱۸۶۷ء (فروری) — نکاتِ غالب و رقعاتِ غالب کی اشاعت مطبع سراجی، دہلی
(پنجاب کے محکمۂ تعلیم کے ڈائریکٹر میجر فُلر نے رائے بہادر ماسٹر
پیارے لال کو حکم دیا کہ غالب سے فارسی قواعد سے متعلق کتاب
لکھوائی جائے۔ ماسٹر صاحب موصوف کے کہنے پر میرزا نے یہ دو
مختصر رسالے قلمبند کیے)

۱۸۶۷ء (۱۱ اپریل) — ہنگامۂ دل آشوب (۱) کی اشاعت۔ مطبع منشی سنت پرشاد،
آرہ (قاطع برہان کے مناقشے کے سلسلے کی منظومات)

۱۸۶۷ء (اگست) — سبدِ چین کی اشاعت (مطبع محمدی، دہلی)

۱۸۶۷ء (۲۵ ستمبر) — ہنگامۂ دل آشوب (۲) کی اشاعت۔ مطبع منشی سنت پرشاد، آرہ

۱۸۶۷ء (۲ دسمبر) — مولوی امین الدین دہلوی مصنفِ قاطع القاطع کے خلاف مقدمۂ
ازالۂ حیثیت عرفی

۱۸۶۸ء (جنوری) — کلیاتِ نثر فارسی (غالب) کی اشاعت (مطبع نولکشور، لکھنؤ)
(اس میں فارسی نثر کی تین کتابیں پنج آہنگ، مہرِ نیمروز، دستنبو
شامل ہیں)

۱۸۶۸ء (۲۳ مارچ) — مولوی امین الدین دہلوی کے مقدمے سے دست برداری، راضی نامہ

۱۸۶۸ء (۱۶ جولائی) — مفتی محمد صدر الدین آزردہ کا دہلی میں انتقال

۱۸۶۸ء (۲۷ اکتوبر) — عودِ ہندی مجموعۂ مکاتیبِ غالب کی پہلی اشاعت (مطبع مجتبائی،
میرٹھ)

۱۸۶۹ء (۱۵ فروری) — غالب کی وفات (بستی نظام الدین، خاندانِ لوہارو کی ہڑواڑ
میں تدفین۔ اگرچہ بہت دنوں سے مختلف امراض کا شکار تھے،
لیکن موت سے چند دن پہلے غشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔
۱۴ فروری دوپہر کو بے ہوش ہو گئے۔ تشخیص ہوئی کہ دماغ پر
فالج گرا ہے۔ اسی حالت میں اگلے دن دوپہر ڈھلے انتقال کیا۔
آخری وظیفہ بابت جنوری ۱۸۶۹ء منجانب نواب رام پور غالب

کی وفات سے صرف ایک گھنٹہ پہلے موصول ہوا تھا)

۱۸۶۹ء (۶ مارچ) اُردوئے معلیٰ (مجموعۂ مکاتیبِ اُردو) کی پہلی اشاعت
(اکمل المطابع، دہلی)

۱۸۶۹ء (ستمبر، اکتوبر) نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا انتقال

۱۸۶۹ء شمشیر تیز تر از مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری کی اشاعت.
(مطبع نبوی، کلکتہ)
(یہ قاطع برہان کے سلسلے کی آخری کتاب غالب کی تصنیف. "تیغ تیز" کے جواب میں ہے جو مرزا کی وفات کے بعد شائع ہوئی، اگرچہ اس کی طباعت ان کی زندگی میں شروع ہو چکی تھی۔ اس پر تاریخ طباعت ۱۸۶۸ء چھپی ہے مگر اس میں چھپے امداد علی مضطر کے قطعۂ تاریخ سے ۱۲۸۶ھ برآمد ہوتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ غالب کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی۔ مادہ ہے "ترکی وادہ جواب ترکی")

۱۸۷۰ء (۴ فروری) غالب کی اہلیہ امراؤ بیگم کا انتقال
(مزارِ غالب کی مشرقی دیوار کے باہر کی طرف مدفون ہیں)

۱۸۷۴ء (۲۶ جون) حکیم آغا جان عیش کا دلی میں انتقال

۱۸۷۶ء (۲۵ مئی) باقر علی خاں (فرزند اکبر زین العابدین خان عارف) کا انتقال (فارسی میں تخلص باقر تھا اور اردو میں کامل۔ مدفن سلطان جی میں حضرت محبوبِ الٰہی کی پائنتی قاسم جانیوں کی ہڑواڑ میں ہے)

۱۸۸۰ء (۷ ستمبر) حسین علی خاں، زین العابدین خان عارف کے چھوٹے بیٹے کا انتقال، اردو میں شاداں تخلص کرتے تھے، فارسی میں خیالی

۱۸۸۴ء (۲۱ اکتوبر) علائی، نواب علاء الدین احمد خان (خلیفہ و جانشینِ غالب۔ ولادت ۲۵ اپریل ۱۸۳۳ء) کی وفات دہلی میں ے

علائی چو بر جائے غالب نشست
ورق بر درید و قلم در شکست (علائی)

۱۹۳۷ء (۱۹ جنوری) فرخ مرزا، نواب امیر الدین احمد خاں فرخی (ابن علائی۔ ولادت ۲۶ جنوری ۱۸۶۰ء) کی وفات۔ لوہارو میں دفن ہوئے
"میاں تمہارے دادا، امین الدین خاں بہادر ہیں۔ میں تمہارا 'دلدادہ' ہوں۔" غالب

۱۹۴۷ء (۱۰ مئی) معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم زوجہ باقر علی خاں کامل (فرزندِ اکبر زین العابدین خاں عارف) کا انتقال
(بگا بیگم ۱۲ سال کی عمر میں کامل کی دلہن بن کر مرزا غالب کے گھر میں آئیں۔ ۴۲ سال کی عمر میں بیوہ ہوگئیں اور ۶۹ سال بیوگی کے

عالم میں گزار کر بعمر ۹۳ سال فوت ہوئیں۔ فخر الدّین علی احمد مرحوم سابق صدر جمہوریۂ ہند اِن کے نواسے تھے)

۱۹۵۴ء (۲۹ مارچ) محمد سلطان بیگم عرف جندو بیگم کی وفات (یہ عارف کے بیٹے باقر علی خاں کامل اور بگا بیگم کی دوسری بیٹی تھیں ۱۲۸۱ھ مطابق ۶۵-۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئی تھیں۔ نواب ضیاء الدّین احمد خاں کے پوتے اور میرزا شہاب الدّین احمد خاں کے بیٹے میرزا شجاع الدّین احمد خاں تاباں سے بیاہی گئی تھیں۔ کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ مرزا غالب، انھیں پیار سے مرزا جیون بیگ کہتے تھے)
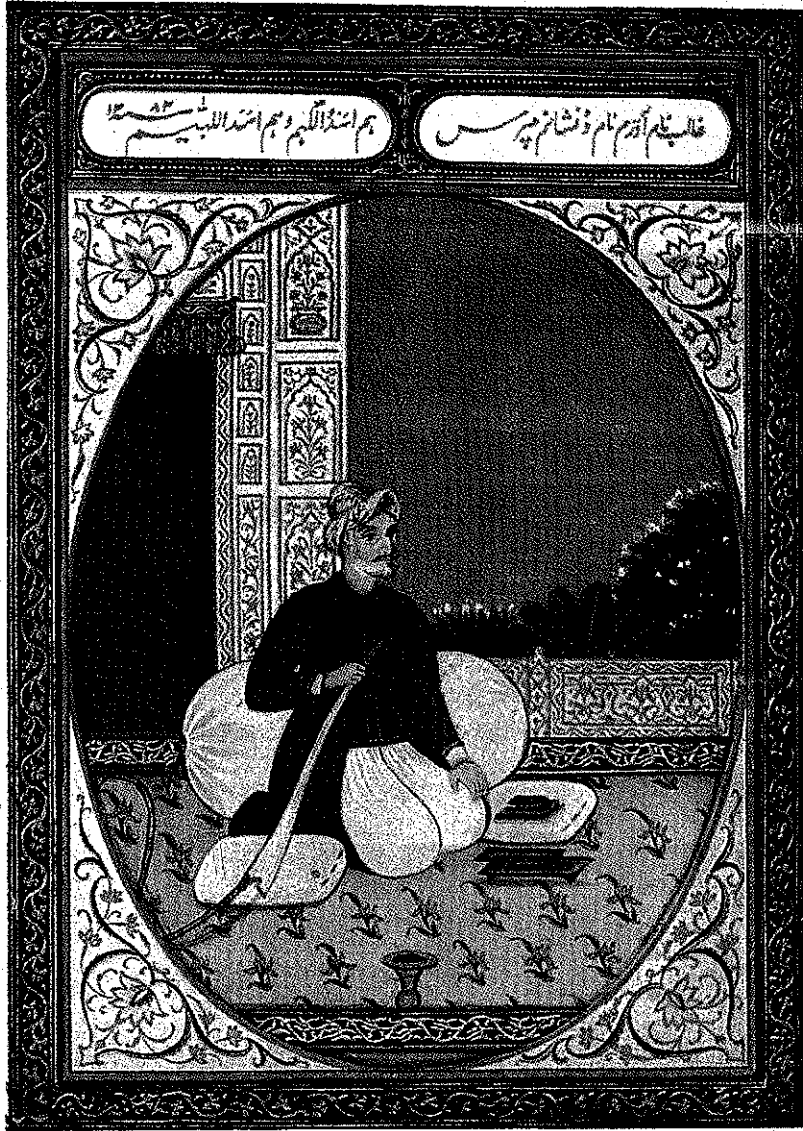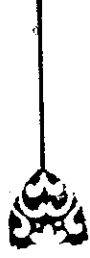
دیوانِ غالب کامل
(نسخۂ رضا)
تاریخی ترتیب سے

...... تا ۱۸۱۲ء

متفرّق

عمدۂ منتخبہ

(تذکرۂ سرؔور)

۱۸۰۰ء - ۱ تا ۱۸۳۱ء - ۳۲

عیار الشعراء

(تذکرۂ خوب چند ذکاؔ)

۱۷۹۸ء - ۹۹ تا ۱۸۳۲ء - ۳۳

○ ۱۸۱۲ء

مثنوی

ایک دن، مثلِ پتنگِ کاغذی — لے کے، دل، سر رشتۂ آزادگی[1]

خود بخود کچھ ہم سے کَنیانے لگا — اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا

میں کہا "اے دل! ہوائے دلبراں — بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں

پیچ میں ان کے نہ آنا زینہار — یہ نہیں ہیں گے کسو کے یارِ غار

گورے پنڈے پر، نہ کر، ان کے نظر — کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر

اب تو مِل جائے گی تیری ان سے سانٹھ — لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ

سخت مشکل ہوگا سُلجھانا تجھے — قہر ہے، دل ان سے اُلجھانا تجھے

یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے — بھول مت اس پر، اُڑاتے ہیں تجھے

ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں — مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں

دل نے سن کر، کانپ کر، کھا پیچ و تاب — غوطے میں جا کر، دیا کٹ کر جواب

"رشتہ در گردنم افگندہ دوست

می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست"

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے 'غالب کا اوّلیں منظوم کلام'، ص ۳۲

○ ۱۸۱۲ء

غزلیات

نیازِ عشق، خرمن سوزِ اسبابِ ہوس بہتر

جو، ہو جاوے نثارِ برق مُشتِ خار و خس، بہتر[1]

یاد آیا جو وہ کہنا کہ "نہیں، واہ غلط"

کی، تصوّر نے بہ صحرائے ہوس راہ، غلط[2]

✓ آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیانِ اشک

لایا ہے لعلِ بیش بہا، کاروانِ اشک[3]

✓ ظاہر کرے ہے جنبشِ مژگاں سے مُدّعا

طفلانہ ہاتھ کا ہے اشارہ، زبانِ اشک

✓ ہیں وادیِ طلب میں ہوا جملہ تن غرق

از بس کہ صرفِ قطرہ زنی تھا لسانِ اشک

✓ غزل کے مطلع مندرجۂ عمدۂ منتخبہ کے ساتھ اس نشان ✓ والے تمام اشعار پہلی بار متن نخ میں درج ہوئے

۱، ۲، ۳۔ تفصیل کے لیے دیکھیے 'عمدہ' منتخبہ، میں ذکرِ غالب، ص ۱۴۱

۴۔ نخ: ہر چند

○ ۱۸۱۲ء

رؔونے سے طاقت اتنی نہ چھوڑی کہ ایک بار[1] +

مژگاں کو دوں فشار، پئے امتحانِ اشک ✓

دلِ خستگاں[2] کو ہے طربِ صد چمن بہار

باغِ بخوں تپیدن، و آبِ روانِ اشک

سیلِ بنائے ہستیِ شبنم ہے، آفتاب +

چھوڑے نہ چشم میں، تپشِ دل، نشانِ اشک ✓

ہنگامِ[2] انتظارِ قدومِ بتاں، اسدؔ

ہے بر سرِ مژہ نگراں، دیدبانِ اشک ✓

آنسو کہوں کہ آہ، سوار ہوا کہوں؟

ایسا عناں گسیختہ آیا کہ کیا کہوں[3]

اقبالِ کلفتِ دلِ بے مدعا رسا ✓

اختر کو داغِ سایۂ بالِ ہما کہوں

۱۔ نخ = سے گل کرے ہے

۲۔ ” = درحال

۳۔ تفصیل کے لیے دیکھیے 'عمدہ' منتخبہ میں ذکرِ غالب' ص ۱۸

+ یہ اشعار پہلی بار حاشیہ ق میں بڑھائے گئے

✓ غزل کے مطلع مندرجۂ عمدۂ منتخبہ کے ساتھ اس نشان ✓ والے تمام اشعار پہلی بار متن نخ میں درج ہوئے۔

○ ۱۸۱۲ء

مضمونِ وصل ہاتھ نہ آیا، مگر اُسے

اب[1] طائرِ پریدۂ رنگِ حنا کہوں

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا +

گر ایک ادا ہو، تو اُسے اپنی قضا کہوں ✓

حلقے ہیں، چشم ہائے کشادہ بسوئے دل

ہر تارِ زلف کو، نگہِ سرمہ سا کہوں ✓

ظالم! مرے گماں سے، مجھے منفعل نہ چاہ +

ہے ہے! خدا نہ کردہ، تجھے بے وفا کہوں ✓

در زدیدنِ دلِ ستم آمادہ ہے محال

مژگاں کہوں کہ جوہرِ تیغِ قضا کہوں ✓

طرزِ آفرینِ نکتہ سرائیٔ طبع ہے

آئینۂ خیال کو طوطی نما کہوں ✓

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش +

تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں

۱۔ نخ = خیال کے

۲۔ ” = مرغِ فراپریدہ

✓ غزل کے مطلع مندرجۂ عمدۂ منتخبہ کے ساتھ اس نشان ✓ والے تمام اشعار پہلی بار متن نخ میں درج ہوئے۔

+ یہ اشعار پہلی بار حاشیہ ق میں بڑھائے گئے

○ ۱۸۱۲ء

غالبؔ! ہے رتبہ فہمِ تصوّر سے کچھ پرے
ہے عجزِ بندگی، کہ علی کو خدا کہوں[1]

مجلسِ شعلہ عذاراں میں جو آجاتا ہوں — شمع ساں، میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں[1]
ہو وے ہے، جادۂ رہ، رشتۂ گوہر ہر گام — جس گزرگاہ سے، میں آبلہ پا جاتا ہوں
سرگراں مجھ سے، سُبک روحی کے نہ رہنے سے رہو — کہ بہ یک جنبشِ لب، مثلِ صدا، جاتا ہوں

دیکھتا ہوں اُسے، تھی جس کی تمنّا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو[2]

شمشیرِ صافِ یار، جو زہراب دادہ ہو
وہ خطِ سبز ہے کہ بہ رُخسارِ سادہ ہو[ج]

ہنستے ہیں، دیکھ دیکھ کے، سب ناتواں مجھے
یہ رنگِ زرد، ہے چمنِ زعفراں مجھے[۲]

۱۔ نخ — جو
۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے 'عمدۂ منتخبہ میں ذکرِ غالبؔ'، ص ۴۴
۱۔ ب،ج۔ تفصیل کے لیے دیکھیے 'عمدۂ منتخبہ میں ذکرِ غالبؔ'، ص ۴۲
۲۔ یہ شعر پہلی بار متن نخ میں درج ہوا

○ ۱۸۱۲ء

دیکھ وہ برقِ تبسّم، بس کہ، دل بیتاب ہے
دیدۂ گریاں مرا، فوّارۂ سیماب ہے[1]

کھول کر دروازۂ میخانہ، بولا مے فروش
اب شکستِ توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے

اک گرم آہ کی، تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر، ہم جگر جلے[2]

پروانے کا نہ غم ہو، تو پھر کس لیے، اسدؔ
ہر رات، شمع، شام سے لے تا سحر جلے؟

زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے
ایسے ہنستے کو رُلایا ہے کہ جی جانے ہے[3]

۱،۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے 'عمدۂ منتخبہ میں ذکرِ غالبؔ'، ص ۴۱
۳۔ .... ص ۴۹ یہ ایک شعر تذکرۂ عیار الشعراء۔ خوب چند ذکاؔ کے سوا کسی مطبوعہ/غیر مطبوعہ دیوان یا بیاض میں نہیں پایا جاتا

○ ۱۸۱۲ء

صبا، لگا وہ طپانچے طرف سے بُلبُل کی
کہ روے غنچۂ گُل سوے آشیاں پھر جائے[1]

بتُو! توبہ کرو، تم کیا ہو؟ جب ادبار آتا ہے
تو یوسف ساحسیں بکنے سرِبازار آتا ہے[2]

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسداللہ خاں قیامت ہے[3]

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے 'عمدۂ منتخبہ میں ذکرِ غالب' ص ۴۹ یہ ایک شعر تذکرۂ عیار الشعراء۔ خوب چند ذکا کے سوائے کسی مطبوعہ / غیر مطبوعہ دیوان یا بیاض میں نہیں پایا جاتا

۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے 'غالب کے غیر متداول اشعار کا زمانۂ فکر' ص ۶۵

۳۔ خود غالب نے اس شعر کا زمانہ "ابتدائے فکرِ سخن" لکھا ہے۔ دیکھیے مکتوب بنام عبدالرزاق شاکر۔ عودِ ہندی ص ۱۵۹۔ میرا دیا ہوا عہد محض قیاس ہے

۱۸۱۳ء
تا
۱۸۱۶ء

نسخۂ بھوپال
(بخطِ غالب)

۱۸۱۶ء

○ ۱۸۱۲ء

صبا، لگا وہ طپانچے طرف سے بُلبُل کی
کہ روے غنچۂ گُل سوے آشیاں پھر جائے[1]

بتو! توبہ کرو، تم کیا ہو؟ جب ادبار آتا ہے
تو یوسف ساحسیں بکنے سرِ بازار آتا ہے[2]

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسداللہ خاں قیامت ہے[3]

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے 'عمدۂ منتخبہ میں ذکرِ غالب' ص ۴۹ یہ ایک شعر تذکرۂ عیارالشعراء۔ خوب چند ذکا کے سوائے کسی مطبوعہ/غیرمطبوعہ دیوان یابیاض میں نہیں پایا جاتا
۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے 'غالب کے غیرمتداول اشعار کا زمانۂ فکر' ص ۶۵
۳۔ خود غالب نے اس شعر کا زمانہ "ابتدائے فکرِ سخن" لکھا ہے۔ دیکھیے مکتوب بنام عبدالرزاق شاکر۔ عودِ ہندی ص ۱۵۹۔ میرا دیا ہوا عہد محض قیاس ہے

۱۸۱۳ء
تا
۱۸۱۶ء

نُسخۂ بھوپال
(بخطِ غالب)

۱۸۱۶ء

○ ۱۸۱۶ء

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا ؟ م کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاؤکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ م صبح کرنا شام کا، لانا ہے جُوئے شیر کا
+جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے م سینۂ شمشیر سے باہر ہے، دَم شمشیر کا
+آگہی، دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے م مُدّعا عنقا ہے، اپنے عالمِ تقریر کا
شوخیِ نیرنگ، صیدِ وحشتِ طاؤس ہے دام، سبزے میں ہے، پروازِ چمن تسخیر کا
لذتِ ایجادِ ناز، افسونِ عرضِ ذوقِ قتل نعل[1]، آتش میں ہے تیغِ یار سے، نخچیر کا
خشت پشتِ دستِ عجز و قالب آغوشِ وداع پُر ہوا ہے سیل سے، پیمانہ کس تعمیر کا ؟
وحشتِ خوابِ عدم، شورِ تماشا ہے اسدؔ جُز مژہ جوہر نہیں آئینۂ تعبیر کا
بس[2] کہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا م موئے آتش دیدہ ہے، حلقہ مری زنجیر کا

جنوں گرمِ انتظار و نالہ بیتابی کمند آیا سُوَیدا، تا بلب، زنجیریِ دودِ سپند آیا
مہِ[3] اختر فشاں کی، بہرِ استقبال، آنکھوں سے تماشا کشورِ آئینہ میں آئینہ بند آیا
تغافل[4]، بدگمانی، بلکہ میری سخت جانی سے نگاہِ بے حجابِ ناز کو بیمِ گزند آیا

۱۔ نخ = نعل، در آتش ....
۲۔ ″ = آتشیں پا ہوں گدازِ وحشتِ زنداں نہ پوچھ/..... ہر حلقہ یاں زنجیر کا
۳۔ ″ = بہ استقبال تمثالِ زماہ، اختر فشاں شوخی
۴۔ ″ = تغافل، بدگمانی ہا، نظر بر سخت جانی ہا
+ یہ اشعار پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھائے گئے

○ ۱۸۱۶ء

فضائے خندۂ گل تنگ و ذوقِ عیش بے پروا فراغت گاہِ آغوشِ وداعِ دل، پسند آیا
عدم ہے خیر خواہِ جلوہ کو زندانِ بیتابی خرامِ ناز، برقِ خرمنِ سعیِ سپند آیا
جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ[1] جگر ہدیہ م مبارک باد! اسدؔ، غمخوارِ جانِ دردمند آیا

شمارِ سبحہ، مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا م تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا
بہ فیضِ بیدلی، نومیدیِ جاوید آساں ہے[2] م کشائش کو، ہمارا عُقدۂ مشکل، پسند آیا
ہوائے[3] سیرِ گل، آئینۂ بے مہریِ قاتل م کہ اندازِ بہ خوں غلتیدنِ[4] بسمل پسند آیا
سوادِ چشمِ بسمل، انتخابِ نقطہ آرائی خرامِ نازِ بے پروائیِ قاتل پسند آیا
+روانی ہائے موجِ خونِ بسمل سے ٹپکتا ہے کہ لطفِ بے تحاشا رفتنِ قاتل پسند آیا
ہوئی جس کو بہارِ فرصتِ ہستی سے آگاہی برنگِ لالہ، جامِ بادہ بر محمل پسند آیا
اسدؔ، ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے مجھے رنگِ بہارِ ایجادیِ بیدل پسند آیا

خود آرا وحشتِ چشمِ پری سے شب وہ بدخو تھا کہ موم، آئینۂ تمثال کو تعویذِ بازو تھا
بشیریِ خوابِ آلودہ مژگاں، نشترِ زنبور خود آرائی سے، آئینہ، طلسمِ مومِ جادو تھا

۱۔ نخ = نادیدنی دعوت
۲۔ نخ = تر
۳۔ نخ = حجاب
۴۔ نخ = غلطیدن
+ یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھایا گیا

○ ۱۸۱۶ء

نہیں ہے بازگشتِ سیل[1] غیر از جانبِ دریا   ہمیشہ دیدۂ گریاں کو آبِ رفتہ در جو تھا
رہا نظّارہ وقتِ بے نقابی[2] آپ پر لرزاں   سرِ شک آگیں مژہ سے دست از جاں شستہ بر رو تھا
غمِ مجنوں، عزادارانِ لیلیٰ کا پرستش گر   خُمِ رنگِ سیہ[3]، پیمانۂ ہر چشمِ آہو تھا
رکھا غفلت نے دُور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ   اشارت فہم کو، ہر ناخنِ بُرّیدہ، ابرو تھا
اسدؔ[4]! خاکِ درِ میخانہ اب سر پر اُڑاتا ہوں   گئے وہ دن کہ پانی جامِ مے سے تا بزانو تھا

دو دیدن کے کمیں، جوں ریشۂ زیرِ زمیں پایا   بہ گردِ سرمۂ اندازِ نگاہِ شرمگیں پایا
اُگی اک پنبۂ روزن سے ہی چشمِ سفید آخر   حیا کو انتظارِ جلوہ ریزی کے کمیں پایا
بہ حسرت گاہِ نازِ کشتۂ جاں بخشیِ خوباں   خضر کو چشمۂ آبِ بقا سے تر جبیں پایا
پریشانی سے مغزِ سر، ہوا ہے پنبۂ بالش   خیالِ شوخیِ خوباں کو راحت آفریں پایا
نفس، حیرت پرستِ طرزِ ناگیرائیِ مژگاں   مگر یک[5] دست[6] دامانِ نگاہِ واپسیں پایا
اسدؔ کو، پیچ تابِ طبعِ برق آہنگ مسکن سے   حصارِ شعلۂ جوّالہ میں عزلت گزیں پایا

نزاکت، ہے فسونِ دعویِ طاقت شکستن ہا   شرارِ سنگ، اندازِ چراغ از چشم جستن ہا

۱۔ نخ = سیل با عجز   ۲۔ نخ = بے نقابی با جود   ۳۔ نخ = سیاہ از حلقہ ہاے
۴۔ ” = سے اسدؔ! خاکِ درِ مے خانہ ہا بر فرق پاشیدن
خوشا روزے کہ آب از ساغرِ مے تا بہ زانو تھا
۵۔ ” = دستے بہ   ۶۔ نخ = ہے

○ ۱۸۱۶ء

رسیہ مستیِ چشمِ شوخ سے ہیں، جوہرِ مژگاں   شرار آسا، زسنگِ سرمہ یکسر بار جستن ہا
ہوائے ابر سے کی موسمِ گُل میں نمد بافی   کہ تھا آئینۂ خود بے نقابِ ننگ بستن ہا
دل از اضطراب آسودہ، طاعت گاہِ داغ آیا   بہ رنگِ شعلہ ہے، مُہرِ نماز از پا نشستن ہا
تکلّف عاقبت میں ہے دلا، بندِ قبا واکر   نفس ہا بعدِ وصلِ دوست ناوانِ گُسستن ہا
اسدؔ، ہر اشک ہے یک حلقہ بر زنجیر افزودن   بہ بندِ گریہ ہے نقشِ بر آب، اُمیّد رستن ہا

بسانِ جوہرِ آئینہ، از ویرانیِ دل ہا   غبارِ کوچہ ہاے موج ہے، خاشاکِ ساحل ہا
نگہ کی ہم نے پیدا، رشتۂ ربطِ علائق سے   ہوئے ہیں پردہ ہاے چشمِ عبرت، جلوہ حائل ہا
نہیں ہے، با وجودِ ضعف، سیرِ بے خودی آساں   رہِ خوابیدہ میں افگندنی ہے، طرحِ منزل ہا
غریبی بہرِ تسکینِ ہوس درکار ہے ورنہ   بہ وہمِ زر گرہ میں باندھتے ہیں برقِ حاصل ہا
تماشا کردنی ہے، انتظار آبادِ حیرانی   نہیں غیر از نگہ، جوں نرگستاں، فرشِ محفل ہا
اسدؔ، تارِ نفس ہے ناگزیرِ عقدہ پیرائی   بہ نوکِ ناخنِ شمشیر کیجے حلِّ مشکل ہا

بہ شغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شب ہا   سرِ تارِ نظر ہے رشتۂ تسبیحِ کوکب ہا
کرے گر فکرِ تعمیرِ خرابی ہاے دل، گردوں   نہ نکلے خشت مثلِ استخواں، بیرون[1] قالب ہا

۱۔ نخ = بیروں ز

○ ۱۸۱۶ء

عبادت ہائے طعن آلودِ یاراں زہرِ قاتل ہے
رفوے زخم کرتی ہے بہ نوکِ نیشِ عقرب ہا
کرے ہے حسنِ خوباں پردے میں مشاطگی[1] اپنی
کہ ہے تہ بندیِ خط، سبزۂ خط در تہِ لب ہا
فنا کو عشق ہے بے مقصداں حیرت[2] پرستاراں
نہیں رفتارِ عمرِ تیز رو پابندِ مطلب ہا
اسد کو بت پرستی سے[3] غرضِ دردِ آشنائی ہے
نہاں ہیں نالۂ ناقوس میں در پردہ یارب ہا

بہ رہنِ شرم ہے، باوصفِ شوخی اہتمام اُس کا
نگیں میں جوں شرارِ سنگ[4] ناپیدا ہے نام اُس کا
سرو کارِ تواضع، تا خمِ گیسو رسانیدن
بسانِ شانہ زینت ریز ہے دستِ سلام اُس کا
مسی آلودہ ہے مُہرِ نوازش نامہ ظاہر[5] ہے
کہ داغِ آرزوے بوسہ دیتا[6] ہے پیام اُس کا
لڑاوے گر وہ بزمِ مے کشی میں قہر و شفقت کو
بھرے پیمانۂ صد زندگانی، ایک جام اُس کا
بہ اُمیدِ نگاہِ خاص ہوں محمل کشِ حسرت
مبادا! ہو عناں گیرِ تغافل لطفِ عام اُس کا
اسد، سودائے سرسبزی سے[7] ہے تسلیم رنگیں تر
کہ کشتِ خشک اُس کا، ابرِ بے پروا خرام اُس کا

یادِ روزے کہ نفس سلسلۂ یارب تھا
نالۂ دل، بہ کمر دامنِ قطعِ شب تھا
بہ تحیر کدۂ فرصتِ آرایشِ وصل
دلِ شب آئنہ دارِ تپشِ کوکب تھا

۱۔ نخ = نہیں در پردہ حسن از کوششِ مشاطگی غافل
۲۔ نخ = حسرت
۳۔ ‹ = عالم
۴۔ ‹ = شرر در
۵۔ ‹ = پیدا
۶۔ ‹ = دیوے گا
۷۔ ‹ = میں
۸۔ ‹ = درگرہ

○ ۱۸۱۶ء

بہ تمنا کدۂ حسرتِ ذوقِ دیدار
دیدہ گو خوں ہو، تماشائے چمن مطلب تھا
جوہرِ فکر، پر افشانیِ نیرنگِ خیال
حسن آئینہ و آئینہ چمن مشرب تھا
پردۂ دردِ دل، آئینۂ صد رنگِ نشاط
بخیۂ زخمِ جگر، خندۂ زیرِ لب تھا
نالہ ہا حاصلِ اندیشہ کہ جوں کشتِ سپند
دلِ ناسوختہ، آتش کدۂ صد تب تھا
+عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا
ورنہ جو چاہیے، اسبابِ تمنا سب تھا
+آخرِ کار گرفتارِ سرِ زلف ہوا
دلِ دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا
+شوقِ سامان، فضولی ہے وگرنہ غالبؔ
ہم میں سرمایۂ ایجادِ تمنا کب تھا
اسدؔ! افسردگیِ آوارۂ کفر و دیں ہے
یادِ روزے کہ نفس درگرہِ "یارب" تھا

شب کہ دل زخمیِ عرضِ دو جہاں تیر آیا
نالہ، بر خود غلطِ شوخیِ تاثیر آیا
وسعتِ جیبِ جنونِ تپشِ دل مت پوچھ
محملِ دشت بہ دوشِ رمِ نخچیر آیا
ہے گرفتاریِ نیرنگِ تماشا ہستی
پرِ طاؤس سے، دل، پاے بہ زنجیر آیا
دید حیرت کش، و خرشیدِ چراغانِ خیال
عرضِ شبنم سے، چمن، آئنہ تعمیر آیا
عشقِ ترسا بچہ و نازِ شہادت مت پوچھ
کہ کُلہ گوشہ، بہ پروازِ پرِ تیر آیا
اے خوشا! ذوقِ[2] تمناے شہادت کہ اسدؔ
بے تکلف بہ سجودِ خمِ شمشیر آیا

+ یہ اشعار پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھائے گئے
۱۔ نخ = بال
۲۔ نخ = شوقِ سبک تازِ

۱۸۱۶ء.....

سیرِ آں سوئے تماشا ہے طلب گاروں کا — خضر مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا

سر خطِ بند ہوا، نامہ گنہ گاروں کا — خونِ ہدہد سے لکھا نقش گرفتاروں کا

فردِ آئینہ میں بخشیں شکنِ خندۂ گل — دلِ آزردہ پسند، آئنہ رخساروں کا

دادِ خواہِ تپش و مُہرِ خموشی بر لب — کاغذِ سرمہ، ہے جامہ ترے بیماروں کا

وحشتِ نالہ، بہ واماندگیِ وحشت ہے — جرسِ قافلہ، یاں دل ہے گرانباروں کا

[*] پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے! — رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

جلوہ مایوس نہیں دل، نگرانی غافل — چشمِ اُمید ہے، روزن تری دیواروں کا

اسدؔ اے ہرزہ درا، نالہ بہ غوغا تا چند — حوصلہ تنگ نہ کر، بے سبب آزاروں کا

طاؤس در رکاب ہے، ہر ذرّہ آہ کا — یارب نفس غبار ہے کس جلوہ گاہ کا؟

عزلت گزینِ بزم ہیں، واماندگانِ دید — مینائے مے ہے، آبلہ پائے نگاہ کا

ہر گام، آبلے سے ہے، دل، در تہِ قدم — کیا بیم اہلِ درد کو سختیِ راہ کا

جیبِ نیازِ عشق، نشاں دارِ ناز ہے — آئینہ ہوں، شکستنِ طرفِ کلاہ کا

غافل بہ وہمِ ناز، خود آرا ہے ورنہ یاں — بے شانۂ صبا نہیں، طرّہ گیاہ کا

[*] بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ، کہ رنگ — صیدِ زِ دام جستہ ہے، اس دام گاہ کا

[+] رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے — شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

---

[*] یہ شعر پہلے پہل متن ق میں اضافہ کیے گئے
[+] یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھایا گیا

۱۸۱۶ء.....

[+] مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں، کہ ہے — پُر گُل، خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

جاں، در ہوائے یک نگہِ گرم ہے اسدؔ — پروانہ، ہے وکیل ترے دادخواہ کا

یک ذرّۂ زمیں نہیں بے کار، باغ کا — یاں جادہ بھی، فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

بے مے، کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی؟ — کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خط ایاغ کا

[+] بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل — کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا

تازہ نہیں ہے، نشۂ فکرِ سخن مجھے — تریاکیِ قدیم ہوں، دُودِ چراغ کا

[+] سَو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے — پر کیا کریں؟ کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار — یہ میکدہ، خراب ہے مے کے سراغ کا

باغِ شگفتہ، تیرا بساطِ نشاطِ دل — ابرِ بہار، خمکدہ کس کے دماغ کا؟

جوشِ بہار، کلفتِ نظّارہ ہے اسدؔ — ہے، ابر، پنبہ روزنِ دیوارِ باغ کا

نہ بھولا اضطرابِ دم شماری، انتظار اپنا — کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

زبس آتش نے فصلِ رنگ میں رنگِ دگر پایا — چراغِ گل سے ڈھونڈھے ہے چمن میں شمع خار اپنا

اسیرِ بے زباں ہوں، کاشکے! صیّادِ بے پروا — بدامِ جوہرِ آئینہ، ہو جاوے شکار اپنا

[+] یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھائے گئے
۱۔ نخ = چشمِ جنوں میں نگہ غبار — ۲۔ نخ = ہوا ہے
۳۔ 〃 = اسیرِ بے زبانی ہوں مگر

○ ۱۸۱۶ء

مگر ہو مانعِ دامن کشی، ذوقِ خود آرائی ہوا ہے نقش بندِ آئنہ، سنگِ مزار اپنا
دریغ! اے ناتوانی، ورنہ ہم ضبط آشنایاں نے طِلسمِ رنگ میں باندھا تھا عہدِ اُستوار اپنا
اگر آسودگی ہے مدّعائے رنجِ بیتابی[1] نیازِ گردشِ پیمانۂ مے روزگار اپنا
اسدؔ، ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں م کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو، پشت خار اپنا

بس کہ جوشِ گریہ سے زیر و زبر ویرانہ تھا چاکِ موجِ سیل، تا پیراہنِ دیوانہ تھا
داغِ مہرِ ضبطِ بے جا، مستیِ سعیِ سپند دودِ مجمر، لالہ ساں، دُردِ تہِ پیمانہ تھا
وصل میں بختِ سیہ نے سُنبلستاں گل کیا رنگِ شب، تہ بندیِ دودِ چراغِ خانہ تھا
شب، تری تاثیرِ سحرِ شعلۂ آواز سے تارِ شمع، آہنگِ مضرابِ پرِ پروانہ تھا
موسمِ گل میں مئے گلگوں حلالِ مے کشاں عقدِ وصلِ دخترِ رز، انگور کا ہر دانہ تھا
انتظارِ[2] جلوۂ کاکل میں ہر شمشادِ باغ صورتِ مژگانِ عاشق، صرفِ عرضِ شانہ تھا
حیرت، اپنے نالۂ بیدرد سے غفلت بنی راہِ خوابیدہ کو غوغائے جرس افسانہ تھا
کو بوقتِ قتل حقِ آشنائی، اے نگاہ! خنجرِ زہراب دادہ، سبزۂ بیگانہ تھا
جوشِ بے کیفیتی ہے اضطراب آرا[3]، اسدؔ ورنہ بسمل کا تڑپنا[4]، لغزشِ مستانہ تھا

۱۔ نخ = کوشش ہا
۲۔ نخ = انتظارِ زلف میں شمشاد ہم دستِ چنار
نقش بندِ شکلِ مژگاں، از نمودِ شانہ تھا
۳۔ نخ = اندیش ۴۔ نخ = طپیدن

○ ۱۸۱۶ء

رات، دل گرمِ خیالِ جلوۂ جانانہ تھا رنگِ روئے شمع، برقِ خرمنِ پروانہ تھا
شب کہ تھی کیفیّتِ محفل بیادِ روئے یار ہر نظر میں، داغِ مے، خالِ لبِ پیمانہ تھا
شب[1] کہ باندھا خواب میں آنے کا، قاتل نے حناح وہ فسونِ وعدہ میرے واسطے افسانہ تھا
دود کو آج اس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی وہ دلِ سوزاں کہ کل تک شمعِ ماتم خانہ تھا
ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہو گیا تو[2] کہے، صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا
دیکھ[3] اُس کے ساعدِ سیمین و دستِ پُرنگار شاخِ گل جلتی تھی مثلِ شمع، گُل پروانہ تھا
شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا غالبؔ، ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا
اے اسدؔ! رویا جو دشتِ غم میں، مَیں حیرت زدہ آئنہ خانہ زسیلِ اشک، ہر ویرانہ تھا

پئے نذرِ کرم، تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا م بہ خوں غلتیدۂ[4] صد رنگ دعویٰ پارسائی کا
جہاں مٹ[5] جائے سعیِ دید خضر آبادِ آسایش بہ جیبِ ہر نگہ پنہاں ہے حاصل رہنمائی کا
بہ عجز آبادِ وہمِ مدّعا تسلیمِ شوخی ہے تغافل کو نہ کر مغرورِ تمکیں آزمائی کا
زکوٰۃِ[6] حسن دے، اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا م چراغِ خانۂ درویش ہو، کاسہ گدائی کا

۱۔ نخ = ے شب کہ باندھا یار نے پیمانِ درخوابِ آمدن
وہ فسونِ وعدہ مجھ کو شوخیٔ افسانہ تھا
۲۔ " = گوئیا
۳۔ " = دیکھ اس کے ساعد و دستِ حنا آلود کو
ﻩ یہ شعر پہلے پہل گل میں درج ہوا
۴۔ " = غلطیدۂ ۵۔ نخ = رہ
۶۔ " = زکواتِ

○ ۱۸۱۶ء

نہ مارا جان کر بے جرم، غافل، تیری گردن پر م رہا، مانندِ خونِ بے گنہ، حق آشنائی کا
دہانِ ہرب بیغارہ جُو، زنجیرِ رسوائی م عدم تک بیوفا، چرچا ہے تیری بیوفائی کا
وہی[1] اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے م چمن کا جلوہ باعث ہے، مری رنگیں نوائی کا
نہ دے[1] نامے کو اتنا طول، غالب، مختصر لکھ دے م کہ حسرت سنج ہوں، عرضِ ستم ہائے جدائی کا

نہ ہو حسنِ تماشا دوست، رسوا بے وفائی کا م بہ مُہرِ صد نظر ثابت ہے، دعویٰ پارسائی کا
ہوس گستاخیِ آئینہ، تکلیفِ نظربازی بہ جیبِ آرزو پنہاں ہے، حاصل دل ربائی کا
نظربازی، طلسمِ وحشت آبادِ پرستاں ہے رہا بیگانۂ تاثیر، افسوں آشنائی کا
نہ پایا دردمندِ دوریِ یارانِ یک دل نے سوادِ خطِّ پیشانی سے، نسخہ مومیائی کا
تمنّائے زباں، محوِ سپاسِ بے زبانی ہے م مٹا[2] جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا
اسدؔ، یہ عجز و بے سامانیِ فرعون توأم ہے جسے تو بندگی کہتا ہے، دعوا ہے خدائی کا

کرے گر حیرتِ نظّارہ، طوفاں نکتہ گوئی کا حبابِ چشمۂ آئینہ ہووے بیضہ طوطی کا
بروے قیس، دستِ شرم ہے مژگانِ آہو سے مگر روزِ عروسی گم ہوا تھا شانہ لیلیٰ کا

۱۔ نخ = ے اسدؔ کا قصہ طولانی ہے لیکن مختصر یہ ہے
کہ حسرت کش رہا عرضِ ستم ہائے جدائی کا
۲۔ ؍؍ = گیا + یہ شعر پہلی بار حاشیہ ق میں بڑھایا گیا

○ ۱۸۱۶ء

فسانِ تیغِ نازک قاتلاں: سنگِ جراحت ہے دلِ گرمِ تپش، قاصد ہے پیغامِ تسلّی کا
نہیں گرداب جز سرگشتگی ہائے طلب ہرگز[1] حبابِ بحر کئے ہے، آبلوں میں خارِ ماہی کا
نیازِ جلوہ ریزی، طاقتِ بالیں شکستن ہا تکلّف کو خیال آیا ہو گر بیمار پُرسی کا
نہ بخشی[2] فرصتِ یک شبنمستاں جلوۂ خور نے تصوّر نے کیا ساماں ہزار آئینہ بندی کا
اسدؔ، تاثیرِ صافی ہائے حیرت جلوہ پرور ہو گر آبِ چشمۂ آئینہ دھووے عکس زنگی کا

زبس خوں گشتۂ رشکِ وفا تھا وہم[3] بسمل کا چرایا زخم ہائے دل نے پانی تیغِ قاتل کا
نگاہِ چشمِ حاسد وام لے، اے ذوقِ خود بینی تماشائی ہوں، وحدت خانۂ آئینۂ دل کا
شررِ فرصت نگہ، سامانِ یک عالم چراغاں ہے بہ قدرِ رنگ یاں گردش میں ہے پیمانہ محفل کا
سراسر تاختن کو شش جہت یک عرصہ جولاں تھا ہوا، واماندگی سے رہرواں کی، فرقِ منزل کا
سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی م عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
بہ قدرِ ظرف ہے ساقی، خمارِ تشنہ کامی بھی[4] م جو تو دریائے مے ہے تو میں[5] خمیازہ ہوں ساحل کا
مجھے[6] راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں، غالبؔ عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے، خامہ بیدل کا

۱۔ نخ = جوشی (یعنی طلب جوشی)
۲۔ ؍؍ = ے نہ دی خورشید نے فرصت بقدرِ شبنمستانی
۳۔ ؍؍ = ذوق ۴۔ نخ = ہا
۵۔ ؍؍ = میں ہوں خمیازہ
۶۔ ؍؍ = (اسدؔ) افسوس دردِ ناشناسی ہائے گمراہاں

○ ۱۸۱۶ء

فروِ پیچیدنی ہے فرشِ بزمِ عیش گستر کا
دریغا! گردش آموزِ فلک ہے دَورِ ساغر کا

خطِ نو خیز کی، آئینے میں دی کس نے آرائش؟
کہ ہے تہ بندی پر ہائے طوطی رنگ جوہر کا

گیا جو نامہ بر، واں سے برنگِ باختہ آیا
خطوطِ روئے قالیں، نقش ہے پشتِ کبوتر کا

شکستِ گوشہ گیراں ہے فلک کو حاصلِ گردش
صدف سے آسیائے آب میں ہے دانہ گوہر کا

فزوں ہوتا ہے ہر دم جوشِ خوں باری، تماشا ہے
نفس کرتا ہے رگ ہائے مژہ پر کام نشتر کا

خیالِ شربتِ عیسیٰ، گدازِ ترنجبینی ہے
اسدؔ، ہوں مست دریا بخشیِ ساقیِ کوثر کا

کیا کس شوخ نے ناز از سرِ تمکیں نشستن کا؟
کہ شاخِ گل کا خم، انداز ہے بالیں شکستن کا

نہاں ہے ہر دمک میں، شوقِ رخسارِ فروزاں سے
سپندِ شعلہ نادیدہ صفت، انداز جستن کا

گدازِ دل کو کرتی ہے، کشودِ چشم، شب پیما
نمک ہے شمع میں جوں مومِ جادو، خواب بستن کا

نفس در سینہ ہائے ہم دگر رہتا ہے پیوستہ
نہیں ہے رشتۂ الفت کو اندیشہ گسستن کا

+ہوائے ابر سے کی، موسمِ گل میں، نمد بافی
کہ تھا آئینۂ خور پر تصور زنگ بستن کا

+تکلف عافیت میں ہے، دلا! بندِ قبا وا کر
نفس بعد از وصالِ دوست تا واں ہے گسستن کا

+ہر اشکِ چشم سے یک حلقۂ زنجیر بڑھتا ہے
بہ بندِ گریہ ہے نقش برآب، اندیشہ رستن کا

عیادت سے اسدؔ، میں بیشتر بیمار ہوتا ہوں
سبب ہے ناخنِ دخلِ عزیزاں سینہ خستن کا

+ یہ اشعار پہلے پہل حاشیہ ق میں اضافہ کیے گئے

○ ۱۸۱۶ء

عیادت سے زبس ٹوٹا ہے، دل یارانِ غمگیں کا
نظر آتا ہے موئے شیشہ، رشتہ شمعِ بالیں کا

صدا ہے کوہ میں حشر آفریں، اے غفلت اندیشاں
پئے سنجیدنِ یاراں، ہوں حامل خوابِ سنگیں کا

بجائے غنچہ و گل، ہے ہجومِ خار و خس، یاں تک
کہ صرفِ بخیۂ دامن ہوا ہے خندہ گلچیں کا

نصیبِ آستیں ہے، حاصلِ روئے عرق آگیں
چُنے ہے کہکشاں خرمن[1] سے کے خوشہ پرویں کا

بوقتِ کعبہ جوئی ہا، جرس کرتا ہے ناقوسی
کہ صحرا فصلِ گل میں رشک ہے بت خانۂ چیں کا

تپیدن[2] دل کو سوزِ عشق میں خوابِ فراموش ہے
رکھا اسپند نے مجمر میں پہلو گرمِ تمکیں کا

اسدؔ[3] اربابِ فطرت قدر دانِ لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں، لیکن نہیں مشتاق تحسیں کا

بہارِ رنگِ خونِ گل ہے، ساماں اشکباری کا
جنونِ برق، نشتر ہے رگِ ابرِ بہاری کا

برائے حلِ مشکل، ہوں زِ پا افتادۂ حسرت
بندھا ہے عُقدۂ خاطر سے پیماں خاکساری کا

بہ وقتِ سرنگونی ہے، تصوّر، انتظارستاں
نگہ کو آبلوں سے شغل ہے اختر شماری کا

لطافت، بے کثافت، جلوہ پیدا کر نہیں سکتی م
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

حریفِ جوششِ دریا نہیں، خودداریِ ساحل م
جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

اسدؔ، ساغر کشِ تسلیم ہو گردش سے گردوں کی
کہ ننگِ فہمِ مستاں ہے، گلہ بد روزگاری کا

۱۔ نخ = از خرمن مہ
۲۔ ″ = طپیدن
۳۔ ″ = ہے اسدؔ طرز آشنایاں قدر دانِ نکتہ سنج ہیں

○ ۱۸۱۶ء

دِردِ اسمِ حق سے، دیدارِ صنم حاصل ہوا ‏ رشتۂ تسبیح، تارِ جادۂ منزل ہوا

محتسب سے تنگ ہے، ازبس کہ کارِ مے کشاں ‏ رَز میں جو انگور نکلا، عقدۂ مشکل ہوا

قیس نے ازبس کہ کی سیرِ گریبانِ نَفَس ‏ یک دو چیں دامانِ صحرا، پردۂ محمل ہوا

وقتِ شب اُس شمع رو کے شعلۂ آواز پر ‏ گوشِ نسرینِ عارضاں، پروانۂ محفل ہوا

خاکِ عاشق، بس کہ ہے فرسودۂ پروازِ شوق ‏ جادۂ ہر دشت، تارِ دامنِ قاتل ہوا

عیب کا دریافت کرنا ہے ہنرمندی اسدؔ ‏ نقص پر اپنے ہوا جو مطّلع، کامل ہوا

قطرۂ مے، بس کہ حیرت سے نَفَس پرور ہوا ‏ م ‏ خطِّ جامِ مے[1]، سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اعتبارِ[+] عشق کی خانہ خرابی دیکھنا ‏ م ‏ غیر نے کی آہ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

گرمیِ دولت ہوئی آتش زنِ نامِ نکو ‏ خانۂ ماتم میں، یاقوتِ نگیں، اخگر ہوا

نشّے میں گم کردہ رہ[2] آیا، وہ مستِ فتنہ خو[3] ‏ آج رنگِ رفتہ، دَورِ گردشِ ساغر ہوا

درد سے در پردہ دی مژگاں سیاہاں نے شکست ‏ ریزہ ریزہ اُستخواں کا، پوست میں نشتر ہوا

زُہد، گردیدن ہے گِردِ خانہ ہائے مُنعماں ‏ دانۂ تسبیح سے میں مُہرہ در ششدر ہوا

اے بہ ضبطِ حالِ خو نا کردگاں[4]، جوشِ جنوں ‏ نشّۂ مے ہے، اگر یک پردہ نازک تر ہوا

+ یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں درج ہوا
۱۔ نخ = بادہ یکسر ‏ ۲۔ نخ = راہ
۳۔ " = ریز ‏ ۴۔ " = نا افسردگاں

○ ۱۸۱۶ء

اس چمن میں ریشہ واری جس نے سر کھینچا، اسدؔ ‏ تر زبانِ شکرِ لطفِ[1] ساقیِ کوثر ہوا

وحشیِ بن صیّاد نے ہم رم خوردوں کو کیا رام کیا ‏ رشتۂ چاکِ جیبِ دریدہ، صرفِ قُماشِ دام کیا

عکسِ رُخِ افروختہ تھا تصویر بہ پشتِ آئینہ ‏ شوخ نے وقتِ حسن طرازی تمکیں سے آرام کیا

ساقی نے از بہرِ گریباں چاکیِ موجِ بادۂ ناب ‏ تارِ نگاہِ سُوزنِ مینا، رشتۂ خطِّ جام کیا

مُہر بجائے نامہ[2] لگائی بر لبِ پیکِ نامہ رساں ‏ قاتلِ تمکیں سنج نے یوں خاموشی کا پیغام کیا

شامِ فراقِ یار میں جوشِ خیرہ سری سے ہم نے اسدؔ ‏ ماہ کو، در تسبیحِ کواکب جائے نشینِ امام کیا

گر نہ اندوہِ[3] شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا ‏ م ‏ بے تکلّف، داغِ مہ، مُہرِ دہاں ہو جائے گا

زہرہ، گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب ‏ م ‏ پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا

لے[*] تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر ‏ م ‏ ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

دل[+] کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے، کیا معلوم تھا ‏ م ‏ یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

سب[=] کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تو راضی ہوا ‏ م ‏ مجھ پہ گویا، اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

۱۔ نخ = لطفِ عام ‏ ۲۔ نخ = بادہ (سہواً) ‏ ۳۔ نخ = احوال
* یہ شعر پہلے پہل متن ق میں درج ہوا۔ مصرعِ اوّل میں "پاؤں کا بوسہ" کی جگہ "بوسہ ہائے پا" تحریر ہے
+ یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں درج ہوا
= عین ممکن ہے کہ یہ شعر پہلے پہل حاشیہ یا متن ق میں درج ہوا ہو مگر ق کے بعض صفحات کے نقصان کے باعث یہ غزل نسخے میں دستیاب نہیں۔ تاہم گلؔ میں موجود ہے

○ ۱۸۱۶ء

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط　م　شعلہ[1] خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

باغ[+] میں مجھ کو نہ لے جا، ورنہ میرے حال پر　م　ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

دل[+] ہے اگر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو　م　اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

گر وہ[2] مستِ ناز دیوے گا صلائے عرضِ حال　خارِ گل بہرِ دہانِ گل، زباں ہو جائے گا

گر شہادت آرزو ہے نشے میں گستاخ ہو　بالِ شیشے کا، رگِ سنگِ فساں ہو جائے گا

فائدہ کیا؟ سوچ، آخر تو بھی[3] دانا ہے اسدؔ　م　دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

تنگ ظرفوں کا رتبہ جہد سے برتر نہیں ہوتا　حبابِ مے بصد بالیدنی ساغر نہیں ہوتا

عجب ہے آبلہ پایانِ صحرا سے نظر بازی　کہ تارِ جادۂ رہ رشتۂ گوہر نہیں ہوتا

خوشا عجزے کہ عاشق جل بجھے جوں شعلۂ خاموش　کہ کم از سرمہ اُس کا مُشتِ خاکستر نہیں ہوتا

تماشائے گل و گلشن ہے مفتِ سر بجیبی　ہا　یہ از چاکِ گریباں گلستاں کا در نہیں ہوتا

نہ رکھ چشمِ حصولِ نفعِ صحبت ہائے ممسک سے　لبِ خشکِ صدف آبِ گہر سے تر نہیں ہوتا

نہ دیکھا کوئی ہم نے آشیاں بلبل کا گلشن میں　کہ جس کے در پہ غنچہ شکلِ قفلِ زر نہیں ہوتا

۱۔ نخ = ہے　شعلہ خس میں مثلِ خوں در رگ نہاں ہو جائے گا
۲۔ „ = ہے　گر وہ مستِ ناز تمکیں دے صلائے عرضِ حال
خارِ گل جُن در دہانِ گل زباں ہو جائے گا
۳۔ „ = ہی (سہواً)
+ یہ اشعار پہلے پہل حاشیۂ ق میں درج ہوئے۔

○ ۱۸۱۶ء

صفا کب جمع ہو سکتی ہے غیر از گوشہ گیری　ہا　صدف بن قطرۂ نیساں اسدؔ، گوہر نہیں ہوتا

لبِ خشک در تشنگی مُردگاں کا　م　زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

ہمہ ناامیدی، ہمہ بدگمانی　م　میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

شگفتن کمیں گاہِ[1] تقریب جوئی　تصور ہوں بے موجب آزردگاں کا

غریبِ[2] ستم دیدۂ بازگشتن　سخن ہوں سخن بر لب آوردگاں کا

سراپا یک آئینہ دارِ شکستن　ارادہ ہوں یک عالم افسردگاں کا

بہ صورت[3] تکلف، بہ معنی تأسف　اسدؔ میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

ہے تنگ ز واماندہ شدن، حوصلۂ پا　جو اشک گرا خاک میں ہے آبلۂ پا

سر منزلِ ہستی سے ہے صحرائے طلب دور　جو خط ہے کفِ پا پہ، سو[4] ہے سلسلۂ پا

دیدار طلب ہے دلِ واماندہ کہ آخر　نوکِ سرِ مژگاں سے رقم ہو گئے پا

آیا نہ بیابانِ[5] طلب گامِ زباں تک　متبخالۂ لب ہو نہ سکا آبلۂ پا

فریاد سے پیدا ہے، اسدؔ، گرمیِ وحشت　تبخالۂ لب ہے جرسِ آبلۂ پا

۱۔ نخ = دارِ　۲۔ نخ = غریبِ بد رحیتنہ....
۳۔ „ = ہے چہ ظاہر چہ باطن تکلف تأسف　۴۔ „ = ہے سو
۵۔ „ = بیانِ (سہواً)

○ ۱۸۱۶ء

وہ فلک رتبہ کہ بر توسنِ چالاک چڑھا ماہ پر، ہالہ صفت، حلقۂ فتراک چڑھا
نشۂ مَے کے اُتر جانے کے غم سے انگور صورتِ اشک بہ مژگانِ رگِ تاک چڑھا
بوسۂ لب سے ملی طبع کو کیفیتِ حال[1] مَے کشیدن سے مجھے نشّۂ تریاک چڑھا
میں جو گردوں کو بہ میزانِ طبیعت تولا تھا یہ کم وزن کہ ہم سنگِ کفِ خاک چڑھا
اے اسدؔ، واشدنِ عقدۂ غم گر چاہے حضرتِ زلف میں جوں شانہ دلِ چاک چڑھا

شب کہ ذوقِ گفتگو سے تیری دل بیتاب تھا شوخیِ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا
شب[2] کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابرآب تھا م شعلۂ جوّالہ، ہر یک حلقۂ گرداب، تھا
واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام م گریے[3] سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا
لے زمیں سے آسماں تک فرش تھیں بے تابیاں شوخیِ بارش سے، مہ، فوارۂ سیماب تھا
واں[4] ہجومِ نغمہ ہاے سازِ عشرت تھا، اسدؔ ناخنِ غم، یاں[5] سرِ تارِ نفس، مضراب تھا
واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال م یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا
جلوۂ گل+ نے کیا تھا واں چراغاں، آبجو م یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

۱۔ نخ = خال (سہوِ کتابت؟)
۲۔ ” = گرمیِ برقِ تپش سے ....   ۳۔ نخ = گریہ
۴۔ ” = ے جوشِ یادِ نغمۂ دمسازِ مطرب سے (اسد)
۵۔ ” = بر
+ یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھایا گیا

○ ۱۸۱۶ء

یاں+ سرِ پُرشور، بے خوابی سے تھا، دیوار جو م واں وہ فرقِ ناز، محوِ بالشِ کمخواب تھا
یاں+ نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بےخودی م جلوۂ گل، واں بساطِ صحبتِ احباب تھا
فرش+ سے تا عرش، واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا م یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا
ناگہاں▭ اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا م دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذّت یاب تھا

نالۂ دل میں شب، اندازِ اثر نایاب تھا م تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر، گو بے تاب تھا
دیکھتے تھے ہم بچشمِ خود وہ طوفانِ بلا آسمانِ سفلہ جس میں یک کفِ سیلاب تھا
موج سے پیدا ہوئے، پیراہنِ دریا میں خار گریہ، وحشت بے قرارِ جلوۂ مہتاب تھا
جوشِ تکلیفِ تماشا، محشرستانِ[1] نگاہ فتنۂ خوابیدہ کو آئینہ مشتِ آب تھا
بے خبر مت کہہ ہمیں بے درد، خود بینی سے پوچھ قُلزُمِ ذوقِ نظر میں آئنہ پایاب تھا
بے دلی ہاے اسدؔ، افسردگی آہنگ تر یاد آیا ہے کہ ذوقِ صحبتِ احباب تھا
مقدمِ+ سیلاب سے، دل کیا نشاط آہنگ ہے م خانۂ عاشق، مگر، سازِ صداے آب تھا
نازشِ+ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں؟ م پہلوے اندیشہ، وقفِ بسترِ سنجاب تھا

+ یہ اشعار پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھائے گئے
▭ یہ شعر گل تک کسی مخطوطے میں نہیں ہے۔ متن م میں ہے گویا ۱۸۲۹ء تا ۱۸۴۰ء کسی وقت کہا گیا ہوگا۔
۱۔ نخ = آباد

○ ۱۸۱۶ء

+ کچھ نہ کی اپنی جنونِ نارسا نے، ورنہ یاں　م　ذرّہ ذرّہ، رُوکشِ خُورشیدِ عالم تاب تھا
+ آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے؟　م　کل تلک تیرا بھی دل، مہر و وفا کا باب تھا
+ یاد کر وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا　م　انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا
⊙ میں نے روکا رات غالبؔ کو، وگرنہ دیکھتے　م　اُس کی سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا　م　رشتۂ[1] ہر شمع، خارِ کسوتِ فانوس تھا
بت پرستی ہے، بہارِ نقش[2] بندی ہائے دہر　ہر صریرِ خامہ میں، یک نالۂ ناقوس تھا
+ مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا　م　کس قدر، یارب، ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا
حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو　م　دل بہ دل پیوستہ، گویا، یک لبِ افسوس تھا
* کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں؟　م　جو کہ کھایا خونِ دل بے منّتِ کیموس تھا
طبع[3] کی واشُد نے رنگِ یک گلستاں گل کیا　یہ[4] دلِ وابستہ، گویا، بیضۂ طاؤس تھا
کل[5] اسدؔ کو ہم نے دیکھا گوشۂ غم خانہ میں　دست بر سر[6]، سر بہ زانوے دلِ مایوس تھا

۱۔ نخ = شمع سے یک خار در پیراہن ......
۲۔ 〃 = نقش بندیٔ جہاں
۳۔ 〃 = غنچۂ خاطر نے رنگِ صد ....
۴۔ 〃 = گردۂ تصویرِ گلشن ....
۵۔ 〃 = ہے یاد آیا ہے کہ دردِ سینہ ریشی سے اسد
۶۔ 〃 = دل
* یہ شعر پہلے پہل متن ق میں درج ہوا
+ یہ اشعار پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھائے گئے
⊙ یہ شعر پہلے پہل قب میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

شبِ اختر، قدحِ عیش نے محمل باندھا　بارِ یک قافلۂ آبلہ منزل باندھا
سُبحہ واماندگیِ شوق و تماشا منظور　جادہ پر، زیورِ صد آئنہ منزل باندھا
ضبطِ گریہ، گہرِ آبلہ[1] لایا آخر　پائے صد موج، بہ طوفاں کدۂ دل باندھا
حیف[2]! اے تنگیِ تمنّا، کہ پئے عرضِ حیا　یک عرق آئنہ، بر جبہۂ سائل باندھا
حسن آشفتگیِ جلوہ، ہے عرضِ اعجاز　دستِ موسیٰ بہ سرِ دعویِ باطل باندھا
تپشِ آئنہ، پروازِ تمنّا لائی[3]　نامۂ شوق، بہ بالِ پرِ بسمل باندھا
دیدہ تا دل ہے یک آئینہ چراغاں کس نے　خلوتِ ناز پہ پیرایۂ محفل باندھا؟
نا امیدی نے، بہ تقریبِ مضامینِ خمار　کوچۂ موج کو خمیازۂ ساحل باندھا
مطرب[4] دل نے مرے تارِ نفس سے غالبؔ　ساز پر رشتہ، پئے نغمۂ بیدلؔ باندھا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا　م　جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا
+ جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے　م　ہوں شمعِ کشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا
+ مرنے کی، اے دل، اور ہی تدبیر کر کہ میں　م　شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا

۱۔ نخ = آبلہ ہائے تب خال
۲۔ 〃 = ہے داغ اسے حاجتِ بے دردکہ در عرضِ حیا
۳۔ 〃 = معلوم
۴۔ 〃 = ہے گہ نفس ہوں کہ اسد مطربِ دل نے مجھ سے
+ یہ اشعار سب سے پہلے حاشیہ ق میں اضافہ کیے گئے

○ ۱۸۱۶ء

بروئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے م یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
واکر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن+ م غیر از نگاہ، اب کوئی حائل نہیں رہا
گو میں+ رہا رہینِ ستم ہائے روزگار م لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
دل سے+ ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں م حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا
جاں دادگاں کا حوصلہ، فرصت گداز[1] ہے یاں عرصۂ تپیدنِ[2] بسمل نہیں رہا
ہوں قطرہ زن بمرحلۂ[3] یاس روز و شب جُز تارِ اشک، جادۂ منزل نہیں رہا
اے آہ، میری خاطرِ وابستہ کے سوا دنیا میں کوئی عقدۂ مشکل نہیں رہا
ہر چند میں ہوں طوطیِ شیریں سخن، ولے آئینہ آہ! میرے مقابل نہیں رہا
بیدادِ[4] عشق سے نہیں ڈرتا، مگر اسدؔ م جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

خلوتِ آبلۂ پا میں ہے، جولاں میرا خوں ہے، دل[5] تنگیِ وحشت سے بیاباں میرا
ذوقِ سرشار سے بے پردہ ہے، طوفاں میرا موجِ خمیازہ ہے، ہر زخمِ نمایاں میرا
عیشِ بازی کدۂ حسرتِ جاوید رسا خونِ آدینہ سے رنگیں ہے، دبستاں میرا

۱۔ نخ = تر ۲۔ نخ = طپیدن
۳۔ ″ = بوادیِ حسرت شبانہ روز
۴۔ ″ = ے اندازِ نالہ یاد ہیں سب مجھ کو پر اسد
۵۔ ″ = کس
+ یہ اشعار پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھائے گئے

○ ۱۸۱۶ء

حسرتِ نشۂ وحشت نہ بہ سعیِ دل ہے عرضِ خمیازۂ مجنوں ہے، گریباں میرا
عالمِ بے سر و سامانیِ فرصت مت پوچھ لنگرِ وحشتِ مجنوں ہے، بیاباں میرا
بے دماغِ تپشِ رشک ہوں، اے جلوۂ حسن[1] تشنۂ خونِ دل و دیدہ ہے پیماں میرا
فہمِ زنجیریِ بے ربطیِ دل ہے، یارب! کس زباں میں ہے لقبِ خوابِ پریشاں میرا
بہ ہوس[2]، دردِ سرِ اہلِ سلامت تا چند؟ مشکلِ عشق ہوں، مطلب نہیں آساں میرا
سرمۂ مُفتِ نظر ہوں، مری قیمت یہ ہے م کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
رخصتِ+ نالہ مجھے دے کہ مبادا! ظالم م تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا
بوئے یوسف مجھے گلزار سے آتی تھی، اسدؔ دے[3] نے برباد کیا پیرہنستاں میرا

بہ مُہر نامہ جو بوسہ گلِ پیام رہا ہمارا کام ہوا، اور تمہارا نام رہا
ہوا نہ مجھ سے بجز درد، حاصلِ صیّاد بسانِ[4] اشک، گرفتارِ چشمِ دام رہا
دل و جگر تفِ فرقت سے جل کے خاک ہوئے ولے ہنوز خیالِ وصال خام رہا
شکستِ رنگ کی لائی سحر، شبِ سُنبل پہ زلفِ یار کا افسانہ ناتمام رہا

۱۔ نخ = بساط ۲۔ نخ = بہوس
۳۔ ″ = کس ۴۔ ″ = برنگِ
+ یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھایا گیا

○ ۱۸۱۶ء

دہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آیا تھا؟   کہ شب خیال میں بوسوں کا اِزدحام رہا
نہ پوچھ[1] حال شب و روزِ ہجر کا، غالبؔ   خیالِ زلف و رُخِ دوست، صبح و شام رہا

خط جو رخ پر جانشینِ ہالۂ مہ ہو گیا   ہالہ دودِ شعلۂ جوّالۂ مہ ہو گیا
حلقۂ گیسو کھُلا دورِ خطِ رُخسار پر   ہالۂ دیگر بہ گردِ ہالۂ مہ ہو گیا
شب کہ مستِ دیدنِ مہتاب تھا وہ جاذِب   پارۂ چاکِ کتاں، پرکالۂ مہ ہو گیا
شب کہ وہ گل باغ میں تھا جلوہ فرما، اے اسدؔ   داغِ مہ، جوشِ چمن سے لالۂ مہ ہو گیا

بس کہ عاجز نارسائی سے کبوتر ہو گیا   صفحۂ نامہ، غلافِ بالشِ پر ہو گیا
صورتِ دیباتپش سے میری، غرقِ خوں ہے آج   خارِ پیراہن، رگِ بستر کو نشتر ہو گیا
بس کہ آئینے نے پایا گرمیِ رخ سے گداز   دامنِ تمثال، مثلِ برگِ[2] گل، تر ہو گیا
شعلہ رخسارا! تحیّر سے تری رفتار کے   خارِ شمعِ آئنہ، آتش میں جوہر ہو گیا
بس کہ وقتِ گریہ نکلا تیرہ کاری کا غبار   دامنِ آلودۂ عصیاں گراں تر ہو گیا

حیرتِ اندازِ رہبر ہے عناں گیر، اے اسدؔ
نقشِ پائے خضر، یاں، سدِّ سکندر ہو گیا

۱۔ نخ = ے اسدؔ نہ پوچھ شب و روزِ ہجر کا احوال
۲۔ 〃 = برگِ گل صفت

○ ۱۸۱۶ء

یک گام بیخودی سے لُوٹیں بہارِ صحرا   آغوشِ نقشِ پا میں کیجے فشارِ صحرا
وحشت اگر رسا ہے، بے حاصلی ادا ہے   پیمانۂ ہوا ہے، مشتِ غبارِ صحرا
اے آبلے[1]! کرم کر، یاں رنجہ یک قدم کر   اے نورِ چشمِ وحشت[2] اے یادگارِ صحرا
دل در رکابِ صحرا، خانہ خرابِ صحرا   موجِ سرابِ صحرا، عرضِ خمارِ صحرا
ہر ذرّہ یک دلِ پاک، آئینہ خانۂ[3] بے خاک   تمثالِ شوقِ بے باک، صد جا دوچارِ صحرا
دیوانگی اسدؔ کی حسرت کشِ طرب ہے   سر[4] میں ہوائے گلشن، دل میں غبارِ صحرا

دلِ بیتاب کہ سینے میں دمِ چند رہا   بہ دمِ چند گرفتارِ غمِ چند رہا
زندگی کے ہوئے ناگہ نفسِ چند تمام   کوچۂ یار جو مجھ سے قدمِ چند رہا
لکھ سکا میں نہ اُسے شکوۂ پیماں شکنی   لاجرم، توڑ کے، عاجز، قلمِ چند رہا
الفتِ زر، ہمہ نقصاں ہے، کہ آخر قاروں   زیر بارِ غمِ دام و دِرَمِ چند رہا
عمر بھر ہوش نہ یک جا ہوئے میرے کہ، اسدؔ   میں پرستندۂ روئے صنمِ چند رہا

۱۔ نخ = آبلہ
۲۔ 〃 = مجنوں
۳۔ 〃 = آئینہ خانۂ خاک
۴۔ 〃 = ے در سر ہوائے گلشن، در دل غبارِ صحرا

○ ۱۸۱۶ء

جگر سے ٹوٹی ہوئی ہوگئی سناں پیدا — دہانِ زخم میں، آخر، ہوئی زباں پیدا

بسانِ سبزہ رگِ خواب ہے زباں ایجاد — کرے ہے خامشی احوالِ بیخوداں پیدا

صفا و شوخی و اندازِ حسن پا بہ رکاب — خطِ سیاہ سے ہے گردِ کارواں پیدا

نہیں ہے آہ کو ایمائے تیرہ بالیدن — وگرنہ ہے خمِ تسلیم سے کماں پیدا

نصیبِ تیرہ، بلا گردش آفریں ہے اسدؔ — زمیں سے ہوتے ہیں، صد دامن آسماں پیدا

دل[1] مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا م آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا

دل[+] میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں م آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں[+] عدم سے بھی پرے ہوں، ورنہ غافل بارہا م میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض[+] کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں؟ م کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل[+] نہیں، تجھ کو دکھاتا، ورنہ داغوں کی بہار م اس چراغاں کا، کروں کیا کارفرما جل گیا

دود میرا سنبلستاں سے کرے ہے ہمسری — بس کہ ذوقِ آتشِ گل سے سراپا جل گیا

شمع[2] رویوں کی سرِ انگشتِ حنائی دیکھ کر — غنچۂ گل، پرفشاں پروانہ آسا جل گیا

خانمانِ عاشقاں، دکانِ آتش باز ہے — شعلہ رو جب[3] ہو گئے گرمِ تماشا جل گیا

۱۔ نخ = اُف نہ کی گو سوزِ دل سے ۔۔۔

۲۔ " = شمع رویاں

۳۔ " = یاں جب ہوئے

+ یہ اشعار پہلے پنسل حاشیہ ق میں بڑھائے گئے

○ ۱۸۱۶ء

تا کجا افسوسِ گرمی ہائے صحبت؟ اے خیال — دل[1]، بہ سوزِ آتشِ داغِ تمنا، جل گیا

میں[2] ہوں اور افسردگی کی آرزو، غالبؔ کہ دل م دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا، جل گیا

نہاں کیفیتِ مے میں ہے سامانِ حجاب اُس کا — بنا ہے پنبۂ مینا سے ساقی نے نقاب اُس کا

اگر اُس شعلہ رو کو دوں پیامِ مجلس افروزی — زبانِ شمعِ خلوت خانہ دیتی ہے جواب اُس کا

عیاں کیفیتِ میخانہ ہے جوئے گلستاں میں — کہ مے عکسِ شفق ہے، اور ساغر ہے حباب اُس کا

اُٹھائے ہیں جو میں افتادگی میں متصل صدمے — کروں گا اشک ہائے واچکیدہ سے حساب اُس کا

اسدؔ کے واسطے رنگے بروئے کار ہو پیدا
غبارِ آوارہ و سرگشتہ ہے، یا بو ترابؔ اُس کا

زبس ہے نازِ پروازِ غرورِ نشۂ صہبا — رگِ بالیدۂ گردن ہے موجِ بادہ در مینا

در آبِ آئنہ از جوشِ عکسِ گیسوئے مشکیں — بہارِ سنبلستاں جلوہ گر ہے آں سوئے دریا

کہاں ہے دیدۂ روشن کہ دیکھے بے حجابانہ — نقابِ یار ہے از پردہ ہائے چشمِ نابینا

۱۔ نخ = دل زِ آتش خیزی ۔۔۔۔

۲۔ " = ہے ہے اسدؔ بیگانۂ افسردگی، کو بے کسی
دل زِ گرمیِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

○ ۱۸۱۶ء

نہ دیجے پاسِ ضبطِ آبرو، وقتِ شکستن بھی — تحمّل پیشۂ تمکین رہیے آئنہ آسا

اسدؔ، طبعِ متیں سے گر نکالوں شعرِ برجستہ
شرر، ہو قطرۂ خونِ فسردہ در رگِ خارا

گرفتاری میں، فرمانِ خطِ تقدیر ہے پیدا — کہ طوقِ قمری از ہر حلقۂ زنجیر ہے پیدا
زمیں کو صفحۂ گلشن بنایا خونچکانی نے — چمن بالیدنی ہا، از رمِ نخچیر ہے پیدا
مگر وہ شوخ ہے طوفاں طرازِ شوقِ خونریزی — کہ در بحرِ کماں بالیدہ موجِ تیر ہے پیدا
نہیں ہے کف لبِ نازک پہ فرطِ نشّۂ مَے سے[1] — لطافت ہائے جوشِ حسن کا سرشیر ہے پیدا
عروجِ نا امیدی چشمِ زخمِ چرخ کیا جانے؟ — بہارِ بے خزاں، از آہِ بے تاثیر ہے پیدا
اسدؔ جس شوق سے ذرّے تپش فرسا ہوں روزن میں — جراحت ہائے دل سے جوہرِ شمشیر ہے پیدا

سحرگہ باغ میں وہ حیرتِ گلزار ہو پیدا — اُڑے رنگِ گُل اور آئینۂ دیوار ہو پیدا
بتاں! زہراب اس شدت سے دو پیکانِ ناوک کو — کہ خطِ سبز[2] تا پشتِ لبِ سوفار ہو پیدا
لگے گر سنگ سر پر یار کے دستِ نگاریں سے — بجائے زخم، گُل بر گوشۂ دستار ہو پیدا

۱۔ ″ = ے نہیں کف بر لبِ نازک، وفورِ نشّۂ مے سے
۲۔ ″ = یر

○ ۱۸۱۶ء

کروں گر عرضِ سنگینیِ کہسار اپنی بیتابی — رگِ ہر سنگ سے نبضِ دلِ بیمار ہو پیدا
بہ سنگِ شیشہ توڑوں، ساقیا! پیمانہ پیماں — اگر ابرِ سیہ مست از سوئے کہسار ہو پیدا

اسدؔ[1]، مایوس مت ہو، گرچہ رونے میں اثر کم ہے
کہ[2] غالب ہے کہ بعد از زاریِ بسیار ہو پیدا

بس کہ ہے مَیخانہ ویراں، جوں بیابانِ خراب — عکسِ چشمِ آہوئے رم خوردہ ہے، داغِ شراب
تیرگیِ ظاہری، ہے طبعِ آگہ[3] کا نشاں — غافلاں عکسِ سوادِ صفحہ ہے، گردِ کتاب
یک نگاہِ صاف، صد آئینۂ تاثیر ہے — ہے رگِ یاقوت، عکسِ خطِ جامِ آفتاب
ہے عرق افشاں مشی سے، ادہمِ مشکین یار — وقتِ شب اختر گنے[4] ہے چشمِ بیدارِ رکاب
ہے[5] شفق، سوزِ جگر کی آگ کی بالیدگی — ہر یک اختر ہے فلک پر قطرۂ اشکِ کباب
بس کہ شرمِ عارضِ رنگیں سے حیرت جلوہ ہے — ہے شکستِ رنگِ گُل آئینہ پردازِ نقاب

شب کہ تھا نظّارگی[6] روئے بتاں کا، اے اسدؔ
گر گیا بامِ فلک سے صبح، طشتِ ماہتاب

۱۔ نخ = نہ ہو مایوس غالبؔ ....
۲۔ ″ = توقع ہے ....
۳۔ ″ = موزوں
۴۔ ″ = شمر
۵۔ ″ = ہے شفق از سوزِ دل ہا، آتشِ افروختہ
۶۔ ″ = نظّارہ گر

○ ۔۔۔۔ ۱۸۱۶ء

نہ دیجے پاسِ ضبطِ آبرو، وقتِ شکستن بھی
تحمّل پیشۂ تمکین رہیے آئنہ آسا ۔

اسدؔ، طبعِ متیں سے گر نکالوں شعرِ برجستہ
شرر، ہو قطرۂ خونِ فسردہ در رگِ خارا

گرفتاری میں، فرمانِ خطِ تقدیر ہے پیدا
کہ طوقِ قمری از ہر حلقۂ زنجیر ہے پیدا

زمیں کو صفحۂ گلشن بنایا خونچکانی نے
چمن بالیدنی ہا، از رمِ نخچیر ہے پیدا

مگر وہ شوخ ہے طوفاں طرازِ شوقِ خونریزی
کہ در زخمِ کماں بالیدہ موجِ تیر ہے پیدا

نہیں[1] ہے کف لبِ نازک پہ فرطِ نشّۂ مے سے
لطافت ہائے جوشِ حسن کا سرِ شیر ہے پیدا

عروجِ ناامیدی چشمِ زخمِ چرخ کیا جانے؟
بہارِ بے خزاں، از آہِ بے تاثیر ہے پیدا

اسدؔ، جس شوق سے ذرّے تپش فرسا ہوں روزن میں
جراحت ہائے دل سے جوہرِ شمشیر ہے پیدا

سحر گہ باغ میں وہ حیرتِ گلزار ہو پیدا
اُڑے رنگِ گل، اور آئینۂ دیوار ہو پیدا

بتاں! زہراب اس شدّت سے دو پیکانِ ناوک کو
کہ خطِّ سبز[2] تا پشتِ لبِ سوفار ہو پیدا

لگے گر سنگ سر پر یار کے دستِ نگاریں سے
بجائے زخم، گل بر گوشۂ دستار ہو پیدا

۱۔ ؍؍ = ہے نہیں کف برلبِ نازک، وفورِ نشّۂ مے سے
۲۔ ؍؍ = پر

○ ۔۔۔۔۔ ۱۸۱۶ء

کروں گر عرضِ سنگینیِ کہسار اپنی بیتابی
رگِ ہر سنگ سے نبضِ دلِ بیمار ہو پیدا

بہ سنگِ شیشہ توڑوں، ساقیا! پیمانہ پیماں
اگر ابرِ سیہ مست از سوے کہسار ہو پیدا

اسدؔ[1]، مایوس مت ہو، گرچہ رونے میں اثر کم ہے
کہ[2] غالب ہے کہ بعد از زاریِ بسیار ہو پیدا

بس کہ ہے میخانہ ویراں، جوں بیابانِ خراب
عکسِ چشمِ آہوے رم خوردہ ہے، داغِ شراب

تیرگیِ ظاہری، ہے طبعِ آگہ[3] کا نشاں
غافلاں، عکسِ سوادِ صفحہ ہے، گردِ کتاب

یک نگاہِ صاف، صد آئینۂ تاثیر ہے
ہے رگِ یاقوت، عکسِ خطِّ جامِ آفتاب

ہے عرق افشاں مشی سے، ادہمِ مشکینِ یار
وقتِ شب اختر گنئے[4] ہے چشمِ بیدارِ رکاب

ہے[5] شفق، سوزِ جگر کی آگ کی بالیدگی
ہر یک اختر ہے فلک پر قطرۂ اشکِ کباب

بس کہ شرمِ عارضِ رنگیں سے حیرت جلوہ ہے
ہے شکستِ رنگِ گل، آئینہ پردازِ نقاب

شب کہ تھا نظّارگی[6] روے بتاں کا، اے اسدؔ
گر گیا بامِ فلک سے صبح، طشتِ ماہتاب

۱۔ نخ = نہ ہو مایوس غالبؔ ۔۔۔
۲۔ ؍؍ = توقع ہے ۔۔۔
۳۔ ؍؍ = موزوں
۴۔ ؍؍ = شمر
۵۔ ؍؍ = ہے شفق از سوزِ دل ہا، آتشِ افروختہ
۶۔ ؍؍ = نظّارہ گر

○ ۱۸۱۶ء

ہے بہاراں میں خزاں حاصل[1]، خیالِ عندلیب ‏ رنگِ گل آتش کدہ ہے زیرِ بالِ عندلیب
عشق کو ہر رنگ شانِ حسن ہے مدِّ نظر ‏ مصرعِ سروِ چمن ہے حسبِ حالِ عندلیب
حیرتِ[2] حسنِ چمن پیرا سے تیرے، رنگِ گل ‏ بسملِ ذوقِ[3] پریدن ہے بہ بالِ عندلیب
عمر میری ہوگئی صرفِ بہارِ حسنِ یار ‏ گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عندلیب
* منع مت کر حسن کی، ہم کو پرستش سے کہ ہے ‏ بادۂ نظارۂ گلشن، حلالِ عندلیب

ہے مگر موقوف بروقتِ دگر، کارِ اسد
اے شبِ پروانہ و روزِ وصالِ عندلیب

آمدِ[4] خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست ‏ م ‏ دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست
اے[5] دلِ ناعاقبت اندیش! ضبطِ شوق کر ‏ م ‏ کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست
○ خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجیے ‏ م ‏ صورتِ نقشِ قدم، ہوں رفتۂ رفتارِ دوست
○ عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے ‏ م ‏ کشتۂ دشمن ہوں آخر، گرچہ تھا بیمارِ دوست

۱۔ نخ = پرور
۲۔ ″ = ہے رنگِ گل از حیرتِ گلشن فروزی ہاے دوست
۳۔ ″ = آہنگ
۴۔ ″ = ہے نیم رنگی جلوہ ہے بزمِ تجلّی زارِ دوست
۵۔ ″ = اے عدوے مصلحت چندے بہ ضبط افسردہ رہ
کردنی ہے جمع تابِ شوخیِ دیدارِ دوست
* یہ شعر پہلے پہل متن ق میں درج ہوا
○ یہ اشعار پہلے پہل متن قا میں درج ہوئے

○ ۱۸۱۶ء

○ چشمِ ما روشن! کہ اُس بیدرد کا دل شاد ہے ‏ م ‏ دیدۂ پرخوں ہمارا، ساغرِ سرشارِ دوست
○ غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اُس کے ہجر میں ‏ م ‏ بے تکلّف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست
○ تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک ‏ م ‏ مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست
○ جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ ‏ م ‏ سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست
○ چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر ‏ م ‏ ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست
○ مہربانی ہاے دشمن کی شکایت کیجیے ‏ م ‏ یا بیاں کیجے سپاسِ لذّتِ آزارِ دوست
○ یہ غزل اپنی، مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ ‏ م ‏ ہے ردیفِ شعر میں، غالبؔ، ز بس تکرارِ دوست
چشم بندِ خلق[1]، غیر از نقشِ خود بینی نہیں ‏ آئنہ ہے قالبِ خشتِ در و دیوارِ دوست
برقِ خرمن زارِ گوہر ہے، نگاہِ تیز، یاں ‏ اشک ہو جاتے ہیں خشک از گرمیِ رفتارِ دوست
ہے[2] سوا نیزے پہ، اس کے قامتِ نوخیز سے ‏ آفتابِ روزِ[3] محشر ہے، گلِ دستارِ دوست
لغزشِ مستانہ و جوشِ تماشا[4] ہے، اسد ‏ آتشِ مے سے[5] بہارِ گرمیِ بازارِ دوست

جاتا ہوں جدھر، سب کی اٹھے ہے اُدھر انگشت ‏ یک دست جہاں مجھ سے پھرا ہے، مگر انگشت

○ یہ اشعار پہلے پہل متن قا میں درج ہوئے
۱۔ نخ = پردہ جز تمثال
۲۔ ″ = ہے بقدرِ نیزہ از بالاے واافراختہ
۳۔ ″ = صبح ‏ ۴۔ نخ = تماشائی
۵ ″ = ہے

○ ۱۸۱۶ء

میں[1] الفتِ مژگاں میں جو انگشت نما ہوں   لگتی ہے مجھے تیر کے مانند، ہر انگشت
ہر غنچۂ گل، صورتِ یک قطرۂ خوں ہے   دیکھا ہے[2] کسو کا جو حنا بستہ، سر انگشت
گرمی[3] ہے زباں کی، سببِ سوختنِ جاں   ہر[4] شمع، شہادت کو ہے یاں سربسر انگشت
+خوں دل میں جو میرے نہیں باقی، تو پھر اُس کی   جوں ماہیِ بے آب، تڑپتی ہے ہر انگشت
+شوخی تری کہہ دیتی ہے احوال ہمارا   رازِ دلِ صد پارہ کی ہے پردہ در انگشت
+بس رتبے میں باریکی و نرمی ہے کہ جوں گل   آتی نہیں پنجے میں بس اس کے نظر انگشت
+افسوس! کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے   م   جن لوگوں کی، تھی درخورِ عقدِ گہر، انگشت
+کافی ہے نشانی تری، چھلّے کا نہ دینا   م   خالی مجھے دکھلا کے، بوقتِ سفر انگشت
لکھتا ہوں، اسدؔ، سوزشِ دل سے سخنِ گرم   م   تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

دودِ شمعِ کشتہ گل، بزم سامانی عبث   یک شبہ آشفتہ نازِ سنبلستانی عبث
ہے، ہوس، محمل بدوشِ شوخیِ ساقیِ مست   نشۂ مے کے تصور میں نگہبانی عبث
بازماندن ہائے مژگاں ہے یک آغوشِ وداع   عیدِ دیدارِ حیرت سوارِ چشم قربانی عبث

۱۔ نخ = مژگاں کی محبت میں ....
۲۔ 〃 = خوباں کا جو دیکھا ہے .....
۳۔ 〃 = گرمی زباں ہے ....
۴۔ 〃 = ہے شمع شہادت کے لیے .....
+ یہ اشعار پہلے پہل حاشیہ ق میں اضافہ کیے گئے

○ ۱۸۱۶ء

جز غبارِ کردہ سیر، آہنگیِ پرواز کو؟   بلبلِ تصویر، دعوائے پرافشانی عبث
سرنوشتِ خلق، ہے طغرائے عجزِ اختیار   آرزو ہا خار خارِ چینِ پیشانی عبث
جب[1] کہ نقشِ مدعا ہووے[2] نہ جز موجِ سراب   وادیِ حسرت میں پھر آشفتہ جولانی عبث
دستِ برہم سودہ ہے، مژگانِ خوابیدہ اسدؔ
اے دل از کف دادۂ غفلت، پشیمانی عبث

نازِ لطفِ عشق، با وصفِ توانائی، عبث   رنگ ہے سنگِ محک، دعوائے مینائی عبث
ناخنِ دخلِ عزیزاں، یک قلم ہے نقب زن   پاسبانیِ طلسمِ کنجِ تنہائی عبث
محملِ پیمانۂ فرصت ہے بردوشِ حباب   دعویِ دریا کشی و نشہ پیمائی عبث
جانِ[3] عاشق حاملِ صد غلبۂ تاثیر ہے   دل کو، اے بیدادخو، تعلیمِ خارائی عبث
یک نگاہِ گرم ہے، جوں شمع، سرتا پا گداز   بہرِ از خود رفتگاں، رنجِ[5] خود آرائی عبث
+قیس بھاگا شہر سے شرمندہ ہو کر سوئے دشت   بن گیا تقلید سے میری، یہ سودائی عبث
اے اسدؔ، بے جا ہے نازِ سجدۂ عرضِ نیاز
عالمِ تسلیم میں یہ[6] دعویٰ آرائی عبث

۱۔ نخ = چونکہ   ۲۔ نج = معلوم
۳۔ 〃 = سے طبعِ نالاں   ۴۔ 〃 = عاشق کشاں
۵۔ 〃 = سعی   ۶۔ 〃 = دعوائے مرزائی
+ یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں اضافہ کیا گیا

○ ۱۸۱۶ء

گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج م قمری کا طوق، حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا[+] ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ م تارِ نفس، کمندِ شکارِ اثر ہے آج
اے[*] عافیت! کنارہ کر، اے انتظام، چل م سیلابِ گریہ، درپئے دیوار و در ہے آج
معزولیٔ[۱] تپش ہوئی، افراطِ انتظار چشمِ کشودہ[۲]، حلقۂ بیرونِ در ہے آج
حیرت فروشِ صد نگرانی ہے اضطرار ہر رشتہ، چاکِ جیب کا، تارِ نظر ہے آج
ہوں داغِ نیم رنگیِ شامِ وصالِ یار نورِ چراغِ بزم سے جوشِ سحر ہے آج
کرتی[۳] ہے عاجزی، سفرِ سوختن، تمام پیراہنِ خسک میں غبارِ شرر ہے آج
تا صبح ہے بہ منزلِ مقصد رسیدنی دودِ چراغِ خانہ، غبارِ سفر ہے آج
دور اوفتادۂ چمنِ فکر ہے، اسدؔ مرغِ خیال، بلبلِ بے بال و پر ہے آج

جنبش[۴] ہر برگ سے ہے گل کے لب کو اختلاج حبِ شبنم سے صبا ہر صبح کرتی ہے علاج
شاخِ گل جنبش میں ہے گہوارہ آسا، ہر نفس طفلِ شوخِ غنچۂ گل، بس کہ ہے وحشی[۵] مزاج
سیرِ ملکِ حسن کر، میخانہ ہا نذرِ خمار چشمِ مستِ یار سے ہے گردنِ مینا پہ باج

۱۔ نخ = بہ ضبط ۲۔ نخ = کشادہ
۳۔ ″ = بے تابی نے کیا ....
۴۔ ″ = ہے لبِ گل کو ز واجنبیدنِ برگ اختلاج
۵۔ ″ = وحشت
+ یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں اضافہ کیا گیا
* یہ شعر پہلے پہل متن ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

گریہ ہائے بیدلاں، گنجِ شرر در آستیں قہرمانِ عشق میں، حسرت سے لیتے ہیں خراج
رنگریزِ جسم و جاں نے از خمستانِ عدم خرقۂ ہستی نکالا ہے بہ رنگِ احتیاج
ہے[۱] سوادِ چشمِ قربانی میں یک عالم مقیم حسرتِ فرصت جہاں دیتی ہے حیرت کو رواج
اے اسدؔ، ہے مستعدِ شانۂ[۲] گیسو شدن
پنجۂ مژگاں بخود بالیدنی رکھتا ہے آج

بیدل، نہ نازِ وحشتِ جیبِ دریدہ کھینچ جوں بوئے غنچہ، یک نفسِ آرمیدہ کھینچ
یک مشتِ خوں ہے، پرتوِ خور سے، تمام[۳] دشت دردِ طلب بہ آبلۂ نادمیدہ کھینچ
پیچیدگی، ہے حاملِ طومارِ انتظار پائے نظر بہ دامنِ شوقِ دویدہ کھینچ
برقِ بہار سے ہوں میں پا در حنا ہنوز اے خارِ دشت! دامنِ شوقِ رمیدہ کھینچ
بیخود بہ لطفِ چشمکِ عبرت ہے، چشمِ صید یک داغِ حسرتِ نفسِ ناکشیدہ کھینچ
بزمِ نظر ہیں بیضۂ طاؤس خلوتاں فرشِ طرب بہ گلشنِ ناآفریدہ کھینچ
دریا، بساطِ دعوتِ سیلاب ہے، اسدؔ
ساغر بہ بارگاہِ دماغِ رسیدہ کھینچ

۱۔ نخ = ہے یک جہاں ہے در سوادِ چشمِ قربانی مقیم
حسرتِ فرصت نے بخشا بس کہ حیرت کو رواج
۲۔ ″ = شانہ گشتن بہرِ زلف
۳۔ ″ = گدازِ

○ ۱۸۱۶ء

قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا ، ہیچ — رفتار نہیں بیشتر از لغزشِ پا ، ہیچ
حیرت ہمہ اسرار ، پہ مجبورِ خموشی — ہستی نہیں جز بستنِ پیمانِ وفا ، ہیچ
تِمثالِ گدازِ آئنہ ، ہے عبرتِ بینش — نظّارہ تحیّر ، چمنستانِ بقا ، ہیچ
گلزارِ دمیدن ، شررستانِ رمیدن — فرصت تپش و حوصلۂ نشو و نما ، ہیچ
آہنگِ عدم نالہ بہ کہسار گرو ہے — ہستی میں نہیں شوخیِ ایجادِ صدا ، ہیچ
کس بات پہ مغرور ہے اے عجزِ تمنّا ؟ — سامانِ دعا وحشت و تاثیرِ دعا ، ہیچ

آہنگِ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ
"عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ، ہیچ"

دعویِ عشقِ بتاں[1] سے بہ گلستاں گل و صبح — ہیں رقیبانہ بہم دست و گریباں گل و صبح
ساقِ گل رنگ سے[2] ، اور آئنۂ زانو سے — جامہ زیبوں[3] کے سدا ہیں تہِ داماں گل و صبح
وصلِ آئینہ رخاں ، ہم نفَسِ یک دیگر — ہیں دعاہائے سحرگاہ سے خواہاں گل و صبح
آئنہ خانہ ہے صحنِ چمنستاں یکسر[4] — بس کہ ہیں بے خود و وارفتہ و حیراں گل و صبح
زندگانی نہیں بیش از نفَسِ چند ، اسدؔ — غفلت آرامیِ یاراں پہ ہیں خنداں گل و صبح

۱۔ نخ = جنوں — ۲۔ نخ = و خطِ
۳۔ ″ = جامہ زیباں — ۴۔ ″ = یک دست

○ ۱۸۱۶ء

بس کہ وہ پاکوبیاں در پردۂ وحشت ہیں یاد — ہے غلافِ دفچۂ خورشید ، ہر یک گردباد
طُرفہ موزونی ہے صرفِ جنگ جوئی ہائے یار — ہے سرِ مصرعِ صافِ تیغ ، خنجر ، مُستزاد
*ہاتھ آیا زخمِ تیغِ یار سا پہلو نشیں — کیوں نہ ہووے آج کے دن بیکسی کی روح شاد
کیجیے آہوئے ختن کو خضرِ صحرائے طلب — مشک ہے سنبلستانِ زلف ہیں ، گردِ سواد
ہم نے[1] سوزِ زخمِ جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی — گل ہوا ہے ایک زخمِ سینہ پر خواہانِ داد
بس کہ ہیں در پردہ مصروفِ سیہ کاری تمام[2] — آستر ہے خرقۂ زُہّاد کا ، صوفِ مِداد

*تیغ در کف ، کف بلب آتا ہے قاتل اس طرف
مژدہ باد ، اے آرزوئے مرگِ غالبؔ ، مژدہ باد

تو پست فطرت اور خیالِ بسا بلند — اے طفلِ خود معاملہ ، قد سے عصا ، بلند
ویرانے سے ، جز آمد و رفتِ نفَس نہیں — ہے کوچہ ہائے نَے میں ، غبارِ صدا ، بلند
رکھتا ہے انتظارِ تماشائے حُسنِ دوست — مژگانِ باز ماندہ[3] سے ، دستِ دعا ، بلند
موقوف کیجیے یہ تکلّف نگاریاں — ہوتا ہے ، ورنہ ، شعلۂ رنگِ حنا ، بلند
قربانِ اوج ریزیِ چشمِ حیا پرست — یک آسماں ہے ، مرتبۂ پشتِ پا ، بلند

۱۔ نخ = غنچہ کا دل خوں ہوا لیکن .....
۲۔ ″ = اسدؔ
۳۔ ″ = واکشادہ
* یہ اشعار پہلے پہل متن ق میں درج ہوئے

○ ۱۸۱۶ء

ہے، دلبری، کمیں گرِ ایجادِ یک نگاہ　　کارِ بہانہ جوئیِ چشمِ حیا، بلند

بالیدگی[1] نیازِ قدِ جاں فزا، اسدؔ
در ہر نفس بقدرِ نفس ہے، قبا، بلند

حسرتِ دست گہ و پائے تحمل تا چند؟　　رگِ گردن، خطِ پیمانۂ مُل تا چند؟

ہے گلیمِ سیہ بختِ پریشاں کاکل　　موئنہ بافتنِ ریشۂ سنبل تا چند؟

کوکبِ بخت، بجز روزنِ پُر دود نہیں　　عینکِ چشمِ جنوں، حلقۂ کاکل تا چند؟

چشم بے خونِ دل، و دل تہی از جوشِ نگاہ　　بہ زباں عرضِ فسونِ ہوسِ گل تا چند؟

بزم داغِ طرب و باغ کشادِ پرِ رنگ　　شمع و گل تا کے؟ پُروانہ و بلبل تا چند؟

نالہ دامِ ہوس و دردِ اسیری معلوم　　شرحِ بر خود غلطی ہائے تحمل تا چند؟

جوہرِ آئنۂ فکرِ سخن ہُوسے دماغ　　عرضِ حسرت، پس زانوئے تامل تا چند؟

سادگی ہے عدمِ قدرتِ ایجادِ غنا　　ناکسی، آئنۂ نازِ توکل تا چند؟

اسدِ خستہ، گرفتارِ دو عالم اوہام
مشکل آساں کنِ یک خلق، تغافل تا چند؟

بہ کامِ دل کریں کس طرح[2] گمرہاں فریاد؟　　ہوئی ہے لغزشِ پا لکنتِ زباں فریاد!

۱۔ نخ = بالیدنی　　۲۔ نخ = رنگ

○ ۱۸۱۶ء

کمالِ بندگیِ گل ہے رہنِ آزادی　　ز دستِ مشتِ پر و خارِ آشیاں فریاد

نوازشِ نفسِ آشنا کہاں؟ ورنہ　　برنگِ نے ہے نہاں در ہر اُستخواں فریاد

تغافل، آئنہ دارِ خموشیِ دل ہے　　ہوئی ہے محو بہ تقریبِ امتحاں فریاد

ہلاکِ[1] بے خبری، نغمۂ وجود و عدم　　جہان و اہلِ جہاں سے جہاں جہاں فریاد

جوابِ[2] سنگ دلی ہائے دشمنانِ ہمت　　ز دستِ شیشہ[3] دلی ہائے دوستاں فریاد

ہزار آفت و یک جانِ بے[4] نوائے اسدؔ
خدا کے واسطے، اے شاہِ بیکساں! فریاد

شیشۂ آتشیں، رُخِ پُر نور　　عرق از خط چکیدہ، روغنِ مور

بس کہ ہوں بعدِ مرگ بھی نگراں　　مردمک سے ہے خال بر لبِ گور

بار[5] لائی ہے دانہ ہائے سرشک　　مژہ، ہے ریشۂ رزِ انگور

ظلم کرنا گدائے عاشق پر　　نہیں شاہانِ حسن کا دستور

دوستو، مجھ ستم رسیدہ سے　　دشمنی ہے، وصال کا مذکور

زندگانی پہ اعتماد غلط　　ہے کہاں قیصر اور کہاں فغفور؟

کیجے، جوں اشک، اور قطرہ زنی　　اے اسدؔ، ہے ہنوز دلی دور

۱۔ نخ = فدائے　　۲۔ نخ = نیازِ
۳۔ نخ = شیشگیِ طبع　　۴۔ ″ = مستمند
۵۔ ″ = ے دانہ ہائے سرشک لاتی ہے

○ ۱۸۱۶ء

بس کہ مائل ہے وہ رشکِ ماہتاب آئینے پر
ہے نفس، تارِ شعاعِ آفتاب آئینے پر

بازگشتِ جادہ پیمائے رہِ حیرت کہاں؟
غافلاں، غشِ جان کر، چھڑکے ہیں آب آئینے پر

بدگماں کرتی ہے عاشق کو خود آرائی تری
بے دلوں کو ہے براتِ اضطراب آئینے پر

نازِ خود بینی کے باعث، مجرمِ صد بے گناہ
جوہرِ شمشیر کو ہے پیچ تاب آئینے پر

ناتوانی نے نہ چھوڑا بس کہ بیش از عکسِ جسم
مفتِ واگستردنی ہے فرشِ خواب آئینے پر

+ مدعی، میری صفائے دل سے ہوتا ہے خجل
ہے تماشا، زشت رویوں کا عتاب آئینے پر

سدِّ اسکندر[۱] ہے نے بہرِ نگاہِ گل رخاں
گر کرے یوں امرِ نہیِ بوتراب، آئینے پر

دل کو توڑا جوششِ بیتابی سے غالب[۲] کیا کیا؟
رکھ دیا پہلو بوقتِ اضطراب آئینے پر؟

دنداں کا خیال، چشمِ تر، کر
ہر دانۂ اشک کو گہر کر

آتی نہیں نیند، اے شبِ تار
افسانۂ زلفِ یار سر کر

اے دل، بہ خیالِ عارضِ یار
یہ شامِ غم آپ پر سحر کر

ہر چند امیدِ دور تر ہو
اے حوصلے! سعیِ بیشتر کر

۱۔ خ = ہو نگاہِ گل رخاں کو سدِّ اسکندر اسد
۲۔ ‹‹ = غافل
+ یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں اضافہ ہوا

○ ۱۸۱۶ء

میں آپ سے جا چکا ہوں اب بھی
اے بے خبری، اسے خبر کر

افسانہ، اسد، بایں درازی
اے غمزدہ! قصہ مختصر کر

بینش بہ سعیِ ضبطِ جنوں، نو بہار تر
دل، در گدازِ نالہ، نگہ آبیار تر

قاتل بہ عزمِ ناز و دل از زخم در گداز
شمشیرِ آبدار و نگہ آب دار تر

بے کسوتِ عروجِ تغافل، کمالِ حسن
چشمِ سیہ بہ مرگِ نگہ، سوگوار تر

سعیِ خرام، کاوشِ ایجادِ جلوہ ہے
جوششِ چکیدنِ عرق، آئینہ کار تر

ہر گرد باد، حلقۂ فتراکِ بے خودی
مجنونِ دشتِ عشق، تحیر شکار تر

اے چرخ! خاک برسرِ تعمیرِ کائنات
لیکن بنائے عہدِ وفا استوار تر

○ سمجھا ہوا ہوں عشق میں نقصاں کو فائدہ
جتنا کہ نا امید تر، امیدوار تر

آئینہ داغِ حیرت و حیرت شکنجِ یاس
سیماب بے قرار و اسد بے قرار تر

فسونِ یک دلی ہے لذتِ بیدادِ دشمن پر
کہ وجدِ برق، جوں پروانہ بال افشاں ہے خرمن پر

تکلف، خارِ خارِ التماسِ بے قراری ہے
کہ رشتہ باندھتا ہے پیرہن انگشتِ سوزن پر

○ یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶..... ء

یہ کیا وحشت ہے؟ اے دیوانے! پیش از مرگ واویلا[3]　　رکھی بے جا بنائے خانۂ زنجیر شیون پر

+جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہو نہ عریانی؟　م　گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

برنگِ کاغذِ آتش زدہ، نیرنگِ بیتابی　م　ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن[1] پر

+فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے!　م　متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

ہم[2] اور وہ بے سبب رنج، آشنا دشمن کہ رکھتا ہے　م　شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

+فنا کو سونپ، گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا　م　فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

+اسد بسمل ہے کس انداز کا؟ قاتل سے کہتا ہے　م　کہ "مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر"

صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر　م　تغیّر آبِ برجا ماندہ کا، چلتا ہے رنگ آخر

○ نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی　م　ہوا جامِ زمرّد بھی، مجھے، داغِ پلنگ آخر

خطِ نوخیز، نیلِ چشمِ زخمِ صافیِ عارض　　لیا آئینے نے حرزِ پرِ طوطی بچنگ، آخر

ہلال آسا تہی رہ، گر کشادن ہائے دل چاہے　　ہوا مہ، کثرتِ سرمایہ اندوزی سے تنگ آخر

تڑپ کر مر گیا وہ صیدِ بال افشاں کہ مضطر تھا　　ہوا ناسورِ چشمِ تعزیت، زخمِ خدنگ، آخر

۱۔ نخ = طپیدن
۲۔ " = ہیں
۳۔ " = تمنّا
+ یہ اشعار پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھائے گئے
○ یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶..... ء

لکھی[1] یاروں کی بدمستی نے میخانے کی پامالی　　ہوئی قطرہ فشانی ہائے مے بارانِ سنگ آخر

اسد، پیری میں بھی آہنگِ شوقِ یار قائم ہے
نہیں ہے نغمے سے خالی، خمیدن ہائے چنگ آخر

دیا یاروں نے بے ہوشی میں درماں کا فریب آخر　　ہوا سکتے سے میں آئینۂ دستِ طبیب آخر

رگِ گل، جادۂ تارِ نگہ سے حد موافق ہے　　ملیں گے منزلِ الفت میں ہم اور عندلیب آخر

غرورِ ضبط، وقتِ نزع ٹوٹا بے قراری[2] سے　　نیازِ پرفشانی[3] ہو گیا صبر و شکیب آخر

ستم کش مصلحت سے ہوں، کہ خوباں تجھ پہ عاشق[4] ہیں　م　تکلف برطرف، مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

اسد کی طرح میری بھی، بغیر از صبحِ رخساراں
ہوئی شامِ جوانی، اے دلِ حسرت نصیب آخر

حسنِ خود آرا کو ہے مشقِ تغافل ہنوز　　ہے کفِ مشاطہ میں آئینۂ گل ہنوز

سادگیِ یک خیال، شوخیِ صد رنگ نقش　　حیرتِ آئینہ ہے جیبِ تأمل ہنوز

سادہ و پُرکار تر، غافل و ہشیار تر　　مانگے ہے شمشاد سے شانۂ سنبل ہنوز

۱۔ نخ = ع زبدمستی سے نوشاں ہوا ویرانہ میخانہ
۲۔ " = بے قرارانہ
۳۔ " = بال افشانی ہوا
۴۔ " = مائل

○ ۱۸۱۶ء

ساقی و تعلیمِ رنج[1]، محفل و تمکیں گراں　　سیلیِ استاد ہے ساغرِ بے مُل ہنوز
شغلِ ہوس در نظر، لیک حیا بے خبر　　شاخِ گلِ نغمہ ہے، نالۂ بلبل ہنوز
دل کی صدا بے شکست سازِ[2] طرب ہے اسدؔ
شیشۂ بے بادہ سے چاہیے ہے قلقل ہنوز

چاکِ گریباں کو ہے ربطِ تامّل ہنوز　　غنچے میں دل تنگ ہے، حوصلۂ گل ہنوز
دل میں ہے، سودائے زلف، مستِ تغافل ہنوز　　ہے مژۂ خوابناک ریشۂ سنبل ہنوز
پرورشِ نالہ ہے وحشتِ پرواز سے　　ہے تہِ بالِ پری بیضۂ بلبل ہنوز
عشق کمیں گاہِ درد، وحشتِ دل دور گرد　　دامِ تہِ سبزہ ہے، حلقۂ کاکل ہنوز
لذّتِ تقریرِ عشق، پردگیِ گوشِ دل　　جوہرِ افسانہ ہے عرضِ تحمّل ہنوز
آئنۂ امتحاں، نذرِ تغافل اسدؔ
شش جہت اسباب ہے وہمِ توکّل ہنوز

بے گانۂ وفا ہے ہوائے چمن ہنوز　　وہ سبزہ سنگ پر نہ اُگا، کوہکن! ہنوز
فارغ[+] مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و مہر　م　ہے داغِ عشق، زینتِ جیبِ کفن ہنوز

۱۔ نخ = وردِ
۲۔ نخ = رنج
+ یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھایا گیا

○ ۱۸۱۶ء

ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر　م　ہوں گل فروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز
مَے[+] خانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں　م　خمیازہ کھینچے ہے بتِ بے دادفن ہنوز
یارب! یہ دردمند ہے کس کی نگاہ کا؟　　ہے ربطِ مشک و داغِ سوادِ ختن ہنوز
جوں جادہ، سر بہ کوئے تمنّائے بیدلی　　زنجیرِ پا ہے رشتۂ حُبّ الوطن ہنوز
میں دور گردِ قربِ بساطِ نگاہ تھا　　بیرونِ دل نہ تھی تپشِ انجمن ہنوز
تھا مجھ کو خار خارِ جنونِ وفا اسدؔ
سُوزن میں تھا نہُفتہ گلِ پیرہن ہنوز

میں ہوں سرابِ یک تپش آموختن ہنوز　　زخمِ جگر ہے تشنۂ لب دوختن ہنوز
اے شعلہ، فرصتے کہ سُویدائے دل سے ہوں　　کشتِ سپندِ صد جگر اندوختن ہنوز
فانوسِ شمع ہے کفنِ کشتگانِ[1] شوق　　درپردہ ہے معاملۂ سوختن ہنوز
مجنوں، فسونِ شعلہ خرامی فسانہ ہے　　ہے شمعِ جادہ، داغِ نیفروختن ہنوز
گو یک شرر؟ کہ سازِ چراغاں کروں اسدؔ　　بزمِ طرب ہے پردگیِ سوختن ہنوز

داغِ اطفال ہے دیوانہ بہ کہسار ہنوز　　خلوتِ سنگ میں ہے نالہ طلبگار ہنوز

۱۔ نخ = ہے
۲۔ نخ = ضبطِ مردگاں
+ یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھایا گیا

○ ۱۸۱۶ء

خانہ ہے سیل سے، خوکردۂ دیدار ہنوز ‌ ‌ دوربیں درزدہ ہے رخنۂ دیوار ہنوز
آئی یک عمر سے معذورِ تماشا نرگس ‌ ‌ چشمِ شبنم میں نہ ٹوٹا مژۂ خار ہنوز
کیوں ہوا تھا طرفِ آبلۂ پا، یارب؟ ‌ ‌ جادہ ہے واشدنِ پیچشِ طومار ہنوز
وسعتِ سعیِ کرم دیکھ، کہ سرتاسرِ خاک ‌ م ‌ گزرے ہے آبلہ پا، ابرِ گہربار ہنوز
یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت ‌ م ‌ نقشِ پا میں ہے تبِ گرمیِ[1] رفتار ہنوز
ہوں خموشی چمنِ حسرتِ دیدار[2]، اسدؔ
مژہ ہے شانہ کشِ طرّۂ گفتار ہنوز

نہ بندھا تھا بہ عدم نقشِ دلِ مور ہنوز ‌ ‌ تب سے ہے یاں دہنِ یار کا مذکور ہنوز
سبزہ ہے نوکِ زبانِ دہنِ گور ہنوز ‌ ‌ حسرتِ عرضِ تمنّا میں ہوں رنجور ہنوز
صد تجلّی کدہ ہے[3] صرفِ جبینِ غربت ‌ ‌ پیرہن میں ہے غبارِ شررِ طور ہنوز
زخمِ دل میں ہے نہاں غنچۂ پیکانِ نگار ‌ ‌ جلوۂ باغ ہے در پردۂ ناسور ہنوز
پا پُر از آبلہ راہِ طلبِ مے میں ہوا ‌ ‌ ہاتھ آیا نہیں یک دانۂ انگور ہنوز
گل کھلے، غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی ‌ ‌ سرخوشِ خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ہنوز
اے اسدؔ، تیرگیِ بختِ سیہ ظاہر ہے ‌ ‌ نظر آتی نہیں صبحِ شبِ دیجور ہنوز

۱۔ نخ = وحشت ‌ ‌ ۲۔ نخ = یک دید
۳۔ // = یک ناصیۂ غربت میں

○ ۱۸۱۶ء

کو بیابانِ تمنّا و کجا جولانِ عجز؟ ‌ ‌ آبلے پا کے، ہیں یاں رفتار کو دندانِ عجز
ہو[1] قبولِ کم نگاہی، تحفۂ اہلِ نیاز ‌ ‌ اے دل، وائے جانِ ناز، اے دین، وائے ایمانِ عجز
بوسۂ پا، انتخابِ بدگمانی ہائے حسن ‌ ‌ یاں ہجومِ عجز سے تا سجدہ ہے جولانِ عجز
حسن کو غنچوں سے ہے پوشیدہ چشمی ہائے ناز ‌ ‌ عشق نے وا کی ہے ہر یک خار سے مژگانِ عجز
اضطرابِ نارسائی، مایۂ[2] شرمندگی ‌ ‌ ہے عرق ریزیِ خجلت، جوششِ طوفانِ عجز
وہ جہاں مسند نشینِ بارگاہِ ناز ہو ‌ ‌ قامتِ خوباں، ہو محرابِ نیازستانِ عجز
بس کہ بے پایاں ہے صحرائے محبّت اے اسدؔ
گردباد اس راہ کا، ہے عقدۂ پیمانِ عجز

حاصلِ دلبستگی ہے عمرِ[3] کوتہ اور بس ‌ ‌ وقتِ عرضِ عقدہ ہائے متّصل تارِ نفس
کیوں نہ طوطیِ طبیعت نغمہ پیرائی کرے ‌ ‌ باندھتا ہے رنگِ گل آئینہ تا[4] چاکِ قفس
اے ادا فہماں، صدا ہے تنگیِ فرصت سے خوں ‌ ‌ ہے بہ صحرائے تحیّر چشمِ قربانی، جرس
تیز تر ہوتا ہے خشمِ تند خویاں عجز سے ‌ ‌ ہے رگِ سنگِ فسانِ تیغِ شعلہ خار و خس

۱۔ نخ = ہو پذیرائے تکلّف
۲۔ // = موجدِ
۳۔ // = کوتہیِ عمر و بس
۴۔ // = پر

○ ۱۸۱۶ء

سختیِ راہِ محبّت، منعِ دخلِ غیر ہے — پیچ تابِ جادہ ہے[1] یاں جوہرِ تیغِ عسس

اے اسدؔ، ہم خود اسیرِ رنگ و بوئے باغ ہیں
ظاہرا، صیّادِ ناداں ہے گرفتارِ ہوس

دشتِ الفت میں ہے خاکِ کشتگاں محبوس و بس — پیچ تابِ جادہ[2]، ہے خطِ کفِ افسوس و بس

نیم رنگی ہائے شمعِ محفلِ خوباں سے ہے — پیچکِ مہ، صرفِ چاکِ پردۂ فانوس و بس

ہے تصور میں نہاں سرمایۂ صد گلستاں — کاسۂ زانو، ہے مجھ کو بیضۂ طاؤس و بس

کفر ہے، غیر از دفورِ شوق، رہبر ڈھونڈھنا[3] — راہِ صحرائے حرم میں ہے جرسِ ناقوس و بس

یک[4] جہاں گل، تختۂ مشقِ شگفتن ہے اسدؔ
غنچۂ خاطر رہا افسردگی مانوس و بس

کرتا ہے، بیادِ بتِ رنگیں، دلِ مایوس — رنگِ زنظر رفتہ، حنائے کفِ افسوس

تھا خواب میں کیا جلوہ پرستارِ[5] زلیخا؟ — ہے بالشِ دلِ سوختگاں میں پرِ طاؤس

۱۔ نخ = حکم
۲۔ 〃 = جادہ ہا
۳۔ 〃 = خواستن
۴۔ 〃 = ع اے اسدؔ گل، تختۂ مشقِ شگفتن ہو گئے
۵۔ 〃 = نظر جوشِ

○ ۱۸۱۶ء

حیرت سے ترے[1] جلوے کی، از بس کہ ہیں بیکار — خور، قطرۂ شبنم[2] میں ہے، جوں شمع بہ فانوس

دریافتِ صحبتِ اغیار، غرض ہے — اے نامہ رساں! نامہ رساں چاہیئے جاسوس

ہے مشق، اسدؔ، دستگہِ وصل کی منظور
ہوں خاک نشیں از پئے ادراکِ قدم بوس

ہوئی ہے بس[3] کہ صرفِ مشقِ تمکین بہارِ آتش — بہ اندازِ حنا، ہے رونقِ دستِ چنارِ آتش

شرر ہے رنگ، بعدِ اظہارِ تابِ جلوۂ تمکیں — کرے ہے سنگ پر، خورشید، آبِ روئے کارِ آتش

گداز[4] موم ہے افسونِ ربطِ پیکر آرائی — نکالے کب[5]، نہالِ شمع، بے[6] تخمِ شرارِ آتش

نہ لیوے گر خسِ جوہر، طراوت، سبزۂ خط سے — لگاوے خانۂ آئینہ میں، روئے نگارِ آتش ؎

فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِّ مشکلِ عاشق[7] — نہ نکلے[8] شمع کے پا سے، نکالے گر نہ خارِ آتش ؎

خیالِ دود تھا، سر جوشِ سودائے غلط فہمی — اگر رکھتی نہ خاکستر نشینی کا غبارِ آتش

ہوائے پر فشانی، برقِ خرمن ہائے خاطر ہے — بہ[9] بالِ شعلۂ بیتاب ہے پروانہ زارِ آتش

۱۔ نخ = رخِ دوست ۲۔ نخ = سے
۳۔ 〃 = ع زجوشِ اعتدالِ فصل و تمکین بہارِ آتش
۴۔ 〃 = ع نہ پاوے بے گدازِ موم ربطِ پیکر آرائی
۵۔ 〃 = ہے سے
۶۔ 〃 = از ۷۔ نخ = عشق
۸۔ 〃 = ع نکالے ہے زپائے شمع، برجا ماندہ خارِ آتش
۹۔ 〃 = ز

○ ۱۸۱۶ء

نہیں برق و شرر، جز وحشت و ضبطِ تپیدن[1] ہا   بلا گردانِ بے پروا خرامی ہائے یار، آتش

دھوئیں[2] سے آگ کے، اک ابر دریا بار ہو پیدا
اسدؔ، حیدر پرستوں سے اگر ہووے دوچار آتش

باقلیمِ سخن ہے جلوہ گردِ[3] سوادِ، آتش   کہ ہے دودِ چراغاں سے، ہیولائے مداد، آتش
اگر مضمون خاکستر[4] کرے دیباچہ آرائی   نہ باندھے شعلۂ جوالہ غیر از گردِ باد، آتش
کرے ہے لطفِ اندازِ برہنہ گوئیِ خوباں   بہ تقریبِ[5] نگارش ہائے سطرِ شعلہ یاد، آتش
دیا[6] داغِ جگر کو آہ نے سامانِ شگفتن کا   نہ ہو بالیدہ، غیر از جنبشِ دامانِ باد، آتش

اسدؔ، قدرت سے حیدر کی، ہوئی[7] ہر گبر و ترسا کو
شرارِ سنگِ بت، مہرِ[8] بنائے اعتقاد، آتش

۱۔ نخ = طپیدن
۲۔ ؍؍ = ؎ اسدؔ از دودِ آتش ابرِ دریا بار ہو پیدا
اگر ناگاہ ہو حیدر پرستوں سے دوچار آتش
۳۔ ؍؍ = گرد افروزِ سواد آتش   ۴۔ نخ = خاکستر شدن دیباچہ آرا ہو
۵۔ ؍؍ = ز وا بالیدن مضمون .....
۶۔ ؍؍ = ؎ دیا داغِ جگر کو آہ نے رنگِ شگفتن ہا
ہوئی بالیدہ تر از جنبشِ دامانِ بار آتش
۷۔ ؍؍ = پڑی ہے گبر و ترسا کے
۸۔ ؍؍ = سے در

○ ۱۸۱۶ء

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع   م   چرخ وا کرتا ہے، ماہِ نو سے آغوشِ وداع
شمع سے ہے، بزم، انگشتِ تحیر در دہن   شعلۂ آوازِ خوباں[1] پر بہ ہنگامِ سماع
جوں پرِ طاؤس، جوہر، تختہ مشقِ رنگ ہے   بس کہ ہے وہ قبلۂ آئینہ محوِ اختراع
رنجشِ حیرت سرشتاں، سینہ صافی پیشکش   جوہرِ آئینہ ہے یاں، گردِ میدانِ نزاع
چار سوئے دہر میں بازارِ[2] غفلت گرم ہے   عقل[3] کے نقصان سے اٹھتا ہے خیالِ انتفاع
آشنا[4]، غالبؔ، نہیں ہیں دردِ دل کے آشنا   ورنہ کس کو میرے افسانے کی تابِ استماع؟

رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع   م   ہوئی ہے آتشِ گل، آبِ زندگانیِ شمع
زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ، خاموشی   م   یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع
کرے ہے صرف بایمائے شعلہ قصہ تمام   م   بطرزِ[5] اہلِ فنا ہے، فسانہ خوانیِ شمع
غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے، اے شعلے   م   ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع
ترے* خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے   م   بجلوہ ریزیِ باد و بپرفشانیِ شمع
نشاطِ* داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ   م   شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیِ شمع
جلے ہے، دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو   م   نہ کیوں[6] ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع

۱۔ نخ = رنگیں   ۲۔ نخ = غفلت کا ہے بازار گرم
۳۔ ؍؍ = ورنہ نقصانِ تصور   ۴۔ ؍؍ = ؎ اے اسدؔ ہیں آشنا بیگانۂ سوز و گداز
۵۔ ؍؍ = ملا نہ ہم کو شعورِ   ۶۔ ؍؍ = اسدؔ ہے
* یہ اشعار پہلے پہل متن ق میں درج ہوئے

○ ۱۸۱۶ء

عشاق، اشکِ چشم سے دھوویں ہزار داغ — دیتا ہے اور، جوں گل و شبنم، بہار داغ
جوں چشم، باز ماندہ ہے ہر یک بسوئے دل[1] — رکھتا ہے داغِ تازہ کا یاں انتظار، داغ
بے لالہ عارضاں[2] مجھے گلگشتِ باغ میں — دیتی ہے، گرمیِ گل و بلبل، ہزار داغ
جوں اعتماد نامہ و خط کا ہو مُہر سے — یوں عاشقوں میں ہے سببِ اعتبار، داغ
*ہوتے ہیں محو جلوۂ غور سے، ستارگاں — دیکھ اُس کو دل سے مٹ گئے بے اختیار داغ

وقتِ[3] خیالِ جلوۂ حُسنِ بتاں، اسد
دکھلائے ہے مجھے دو جہاں[4] لالہ زار، داغ

بلبلوں کو دور سے کرتا ہے منعِ بارِ باغ — ہے، زبانِ پاسباں، خارِ سرِ دیوارِ باغ
کون آیا جو چمن بے تابِ استقبال ہے؟ — جنبشِ موجِ صبا، ہے شوخیِ رفتارِ باغ
میں ہمہ حیرت، جنوں بے تابِ دورانِ خمار — مردمِ چشمِ تماشا، نقطۂ پرکارِ باغ
آتشِ رنگِ رخِ ہر گل کو بخشے ہے فروغ — ہے دمِ سردِ صبا سے، گرمیِ بازارِ باغ

۱۔ نخ = ے جوں چشم، واکشادہ ہے ہر ایک ظاہرا
رکھتا ہے اور داغ کا یاں انتظار داغ
۲۔ " = بے لالہ عارضانِ چمن و باغ میں مجھے
۳۔ " = درحالتِ تصوّرِ رُوے ....
۴۔ " = چمن
* یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

کون گل سے ضعفِ خاموشیِ بلبل کہہ سکے؟ — نَے زبانِ[1] غنچہ گویا، نَے زبانِ خارِ باغ

جوشِ گل، کرتا ہے استقبالِ تحریرِ اسد
زیرِ مشقِ شعر، ہے نقش از پئے احضارِ باغ

نامہ بھی لکھتے ہو، تو بخطِ غبار، حیف! — رکھتے ہو مجھ سے اتنی کُدورت، ہزار حیف!
بیش از نفس، بتاں کے کرم نے وفا نہ کی — تھا محملِ نگاہ بدوشِ شرار، حیف!
تھی میرے ہی جلانے کو، اے آہِ شعلہ ریز — گھر پر پڑا نہ غیر کے کوئی شرار، حیف!
+گل، چہرہ ہے کسو خفقانی مزاج کا — گھبرا رہی ہے بیمِ خزاں سے بہار، حیف!
ہم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش م — مجبوریاں تلک ہوئے، اے اختیار، حیف!
+جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے م — اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار، حیف!
ہیں میری مشتِ خاک سے اس کو کُدورتیں — پائی جگہ بھی دل میں، تو ہو کر غبار، حیف!

بنتا، اسد، میں سرمۂ چشمِ رکابِ یار
آیا نہ میری خاک پہ وہ شہ سوار، حیف!

عیسیِ مہرباں ہے شفا ریز یک طرف — درد آفریں ہے طبعِ الم خیز یک طرف

۱۔ نخ = نہ (جو سہو ہے)
+ یہ اشعار پہلے پہل حاشیہ ق میں اضافہ کیے گئے

○ ۱۸۱۶ء

سنجیدنی ہے ایک طرف رنجِ کوہکن — خوابِ گرانِ خسرو پرویز یک طرف
خرمن بباد دادۂ دعویٰ ہیں ہو، سو ہو — ہم یک طرف ہیں، برقِ شرر ریز یک طرف
+مفتِ دل و جگر، خلشِ غمزہ ہائے ناز — کاوشِ فروشیِ مژۂ تیز یک طرف
ہر مُو، بدن پہ شہپرِ پرواز ہے مجھے — بے تابیِ دلِ تپش انگیز یک طرف

یک جانب، اے اسدؔ، شبِ فرقت کا بیم ہے
دامِ ہوس ہے، زلفِ دلاویز، یک طرف

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دعا نہ مانگ م یعنی، بغیرِ یک دلِ بے مدعا نہ مانگ
اے آرزو! شہیدِ وفا! خوں بہا نہ مانگ — جز بہرِ دست و بازوے قاتل، دعا نہ مانگ
گستاخیِ وصال، ہے مَشاطۂ نیاز — یعنی، دعا بجز خمِ زلفِ دوتا نہ مانگ
برہم ہے بزمِ غنچہ، بیک جنبشِ نشاط — کاشانہ بس کہ تنگ ہے، غافل! ہوا نہ مانگ
عیسیٰ! طلسمِ حسن تغافل ہے، زینہار — جز پشتِ چشم، نسخۂ عرضِ دوا نہ مانگ
میں دور گردِ عرضِ رسومِ نیاز ہوں — دشمن سمجھ، ولے نگہِ آشنا نہ مانگ
نظارہ دیگر و دلِ خونیں نفس دگر — آئینہ دیکھ، جوہرِ برگِ حنا نہ مانگ

+ یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں اضافہ کیا گیا

○ ۱۸۱۶ء

آتا ہے، داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد م مجھ سے مرے گنہ کا حساب، اے خدا نہ مانگ

یک بختِ اوج، نذرِ سبک باری، اسدؔ
سر پر، وبالِ سایۂ بالِ ہما نہ مانگ

بدر، ہے آئینۂ طاقِ ہلال — غافلاں، نقصاں سے پیدا ہے کمال
ہے بیادِ زلفِ مشکیں[۲] سال و ماہ — روزِ روشن، شامِ آں سوے خیال
بس کہ ہے اصلِ دمیدن ہا غبار — ہے نہال شکوہ، ریحانِ سفال
صافیِ رخ[۳] سے ترے، ہنگامِ شب — عکسِ داغِ مہ، ہوا عارض پہ خال
نور[۴] سے تیرے ہے اس کی روشنی — ورنہ تھا خورشید یک دستِ سوال
شورِ حشر اُس فتنہ قامت کے حضور — سایہ آسا ہو گیا ہے پایمال

ہو جو بلبل پیروِ فکرِ اسدؔ
غنچۂ منقارِ گل ہو زیرِ بال

ہوں، بہ وحشت، انتظار آوارۂ دشتِ خیال — اک سفیدی مارتی ہے دور سے چشمِ غزال

۱۔ رخ = حبابِ بے گہنی
۲۔ ″ = مشکینِ بتاں
۳۔ ″ = رُخسار سے
۴۔ ″ = ے نورِ خوباں سے یدِ بیضا ہے آج

○ ۱۸۱۶ء

ہے نفس[۱] پروردہ، گلشن، کس ہوائے بام کا ؟
طوقِ قمری میں ہے، سروِ باغ، ریحانِ سفال

ہم غلط سمجھے تھے، لیکن زخمِ دل پر رحم کر
آخر اس پردے میں تو ہنستی تھی، اے صبحِ وصال

بیکسی افسردہ ہوں، اے ناتوانی، کیا کروں[۲] ؟
جلوۂ خورشید سے ہے گرم، پہلوے ہلال

شکوہ دردو درد داغ، اے بے وفا معذور رکھ
خوں بہاے یک جہاں اُمیّد ہے، تیرا خیال

عرضِ دردِ بے وفائی، وحشتِ اندیشہ ہے
خوں ہوا دل تا جگر، یارب، زبانِ شکوہ لال

اُس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے، اسدؔ
مالِ[۳] سُنّی کو مُباح اور خونِ صوفی کو حلال

ہر عضو، غم سے ہے شکن آسا شکستہ دل
جوں زلفِ یار، ہوں میں سراپا شکستہ دل

ہے سرنوشت میں رقمِ واشکستگی
ہوں، جوں خطِ شکستہ، بہر جا[۴] شکستہ دل

امواج کی جو یہ شکنیں آشکار ہیں
ہے چشمِ اشک ریز سے، دریا شکستہ دل

ناسازیِ نصیب، درشتیِ غم سے ہے
اُمیّد و نا اُمیّد و تمنّا شکستہ دل

ہے سنگِ ظلمِ چرخ سے میخانے میں، اسدؔ
صہبا فتادہ خاطر و مینا شکستہ دل

۱۔ نخ = قفس
۲۔ ″ = علاج
۳۔ ″ = ے خونِ صوفی کو مُباح اور مالِ سُنّی کو حلال
۴۔ ″ = ہمہ

○ ۱۸۱۶ء

بہرِ عرضِ حالِ شبنم سے رقم ایجادِ گُل
ظاہرا ہے اس چمن میں لالِ مادرزاد، گُل

گر[۱] کرے انجام کو آغاز ہی میں یاد، گُل
غنچے سے منقارِ بلبل وار ہو فریاد، گُل

گر بہ بزمِ باغ، کھینچے[۲] نقشِ روے یار کو
شمع ساں ہو جاے قطِ[۳] خامۂ بہزاد، گُل

دستِ رنگیں سے جو رخ پردا کرے زلفِ رسا
شاخِ گُل میں ہو نہاں جوں شانہ در شمشاد، گُل

سعیِ عاشق ہے فروغ افزاے آبِ روے کار
ہے[۴] شرارِ تیشہ، بہرِ تربتِ فرہاد، گُل

ہے تصوّر، صافیِ قطعِ نظر از غیر[۵] یار
لختِ دل سے[۶] لاوے ہے، شمعِ خیال آباد، گُل

گلشن[۷] آبادِ دلِ مجروح میں ہو جائے ہے
غنچۂ پیکان شاخِ ناوکِ صیّاد، گُل

برق[۸] سامانِ نظر ہے، جلوۂ بے باکِ حسن
شمعِ خلوت خانہ کیجے ہر چہ بادا باد، گُل

خاک ہے عرضِ بہارِ صد نگارستان، اسدؔ
حسرتیں[۹] کرتی ہے، میری خاطرِ آزاد، گُل

۱۔ نخ = ے گر کرے پژمردہ انجامی کو داغِ یاد گُل
۲۔ ″ = کھینچا چاہے نقشِ روے یار
۳۔ ″ = زنگ
۴۔ ″ = ے یاں شرارِ تیشہ ہے بر تربتِ فرہاد گُل
۵۔ ″ = جسم و جاں
۶۔ ″ = ہے بر سر
۷۔ ″ = ے ہو گیا در گلشن آبادِ جراحت ہاے دل
۸۔ ″ = ے برق زارِ جلوہ ہے از خود ربودن ہاے حسن
کیجے شمعِ بزمِ خلوت، ہر چہ باد اباد، گُل
۹۔ ″ = ے آرزوئیں کرتے ہیں از خاطرِ آزاد گُل

○ ۱۸۱۶ء

گرچہ ہے یک بیضۂ طاؤس آسا تنگ، دل — ہے چمن سرمایۂ بالیدنِ صد رنگ، دل

بے دلوں[1] سے ہے تپش، جوں خواہشِ آب از سراب — ہے شررِ موہوم،[2] اگر رکھتا نہ ہوئے سنگ دل

رشتۂ فہمیدِ مُمسک ہے یہ بندِ کوتہی — عُقدہ[3] ساں ہے کیسۂ زر پر خیالِ تنگ دل

ہوں زِپا اُفتادۂ اندازِ یادِ حسنِ سبز — کس[4] قدر ہے نشّہ فرسائے خمارِ بنگ، دل

*شوقِ بے پروا کے ہاتھوں، مثلِ سازِ نادرست — کھینچتا ہے آج نالے خارج از آہنگ، دل

اے اسدؔ، خامُش ہے طوطیِ شکر گفتارِ طبع

ظاہرا رکھتا ہے آئینہ[5] اسیرِ زنگ دل

اثر کمندیِ فریادِ نارسا معلوم — غبارِ نالہ کمیں گاہِ مُدّعا معلوم

بقدرِ حوصلۂ عشق جلوہ[6] ریزی ہے — وگرنہ خانۂ آئینہ کی فضا معلوم

بہار، در گروِ غنچہ، شہرِ جولاں ہے — طلسمِ ناز، بجز تنگیِ قبا معلوم

بنالہ، حاصلِ دلبستگی فراہم کر — م متاعِ خانۂ زنجیر، جُز صدا معلوم

۱۔ نخ = بے دلاں
۲۔ ″ = ے نقشے شررِ طوفان باطل گر نہ رکھتا سنگدل
۳۔ ″ = ہے گرہ بر گیسۂ درہم ......
۴۔ ″ = ہے بہ خوابِ سبزہ از جوشِ......
۵۔ ″ = یاں آئینہ زیرِ زنگ دل
۶۔ ″ = جلوہ سازی
* یہ شعر پہلی بار متنِ ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

طلسمِ خاک، کمیں گاہِ یک جہاں سودا — بہ مرگ تکیۂ آسایشِ فنا معلوم

تکلّف، آئنۂ دو جہاں مدارا ہے — سراغِ یک نگہِ قہر آشنا معلوم

اسدؔ فریفتۂ انتخابِ طرزِ جفا

وگرنہ دلبریِ وعدۂ وفا معلوم

ازاں جا کہ حسرت کشِ یار ہیں ہم — رقیبِ تمنّائے دیدار ہیں ہم

رمیدن، گلِ باغِ واماندگی ہے — عبث محملِ آرائے رفتار ہیں ہم

نفس ہو نہ معزولِ شعلہ درودن — کہ ضبطِ تپش سے شرر کار ہیں ہم

تغافل، کمیں گاہِ وحشت شناسی — نگہبانِ دلہائے اغیار ہیں ہم

تماشائے گلشن، تمنّائے چیدن — بہار آفرینا! گنہ گار ہیں ہم

نہ ذوقِ گریباں، نہ پروائے داماں — نگہ آشنائے گل و خار ہیں ہم

اسدؔ، شکوہ کفر، و دعا ناسپاسی

ہجومِ تمنّا سے لاچار ہیں ہم

یاں اشک جدا گرم ہے، اور آہ جدا گرم — حسرت کدۂ عشق کی ہے آب و ہوا گرم

اُس شعلے نے گلگوں کو جو گلشن میں کیا گرم — پھولوں کو ہوئی بادِ بہاری، وہ ہوا گرم

وا کر سکے یاں کون بجز کاوشِ شوخی — جوں برق ہے پیچیدگیِ بندِ قبا گرم

○ ۱۸۱۶ء

گر ہے سرِ دریوزگیِ جلوۂ دیدار　　جوں پنجۂ خورشید ہو، اے دستِ دعا، گرم
یہ آتشِ ہمسایہ کہیں گھر نہ جلا دے　　کی ہے دلِ سوزاں نے مرے پہلو میں جا گرم
غیروں سے اُسے گرمِ سخن دیکھ کے، غالبؔ
میں رشک سے، جوں آتشِ خاموش، رہا گرم

بس کہ ہیں بدمستِ بشکن بشکنِ میخانہ ہم　　موئے شیشہ کو[1] سمجھتے ہیں خطِ پیمانہ ہم
بس کہ ہر یک موئے زلفِ افشاں سے، ہے تارِ شعاع　　پنجۂ[2] خورشید کو سمجھے ہیں دستِ شانہ ہم
ہے[3] فروغِ ماہ سے، ہر موج، اک تصویرِ چاک　　سَیل سے، فرشِ کتاں کرتے ہیں[4] تا ویرانہ ہم
مشقِ از خود رفتگی سے ہیں بہ گلزارِ خیال　　آشنا تعبیرِ خوابِ سبزۂ بیگانہ ہم
فرطِ بےخوابی سے، ہیں شب ہائے ہجرِ یار میں　　جوں زبانِ شمع، داغِ گرمیِ افسانہ ہم
جانتے ہیں، جوششِ سودائے زلفِ یار میں　　سنبلِ بالیدہ[5] کو موئے سرِ دیوانہ ہم
بس کہ وہ چشم و چراغِ محفلِ اغیار ہے　　چپکے چپکے جلتے ہیں، جوں شمعِ خلوت خانہ ہم
شامِ غم میں، سوزِ عشقِ آتشِ[6] رخسار سے　　پرفشانِ سوختن ہیں، صورتِ پروانہ ہم

۱۔ نخ = سے اُگاتے
۲۔ " = پنجۂ خور دیکھتے ہیں زیر -------
۳۔ " = نقش بندِ چاک ہے موج از فروغِ ماہتاب
۴۔ " = در
۵۔ " = آشفتہ
۶۔ " = شمع رویاں سے اسدؔ

○ ۱۸۱۶ء

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس　م　برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
°محفلیں برہم کرے ہے، گنجفہ بازِ خیال　م　ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بتخانہ ہم
*باوجودِ یک جہاں ہنگامہ، پیدائی نہیں　م　ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم
°ضعف سے ہے، نے قناعت سے، یہ ترکِ جستجو　م　ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم
+دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم　م

جس دم کہ جادہ وارہو تارِ نفس تمام　　پیمایشِ زمینِ رہِ عمر بس تمام
کیا دے صدا؟ کہ کلفتِ گم گشتگاں سے، آہ　　ہے سرمہ، گردِ رہ، بہ گلوئے جرس تمام
ڈرتا[1] ہوں کوچہ گردیِ بازارِ عشق سے　　ہیں، خارِ راہ، جوہرِ تیغِ عسس تمام
اے بالِ اضطراب! کہاں تک فسردگی؟　　یک پرزدن تپش میں ہے، کارِ قفس تمام
گزرا جو آشیاں کا تصور بوقتِ بند　　مژگانِ چشمِ دام ہوئے خار و خس تمام
کرنے نہ پائے ضعف سے شورِ جنوں، اسدؔ
اب کے بہار کا یہیں[2] گزرا برس تمام

۱۔ نخ = ترساں ہوں　　۲۔ یونہیں
+ یہ شعر پہلی بار حاشیہ ق میں درج ہوا
* یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا
° یہ اشعار پہلی بار متن ق ا میں درج ہوئے

○ ۱۸۱۶ء

خوشِ وحشتے کہ عرضِ جنون فنا کروں ۔۔۔ جوں گردِ راہ، جامۂ ہستی قبا کروں
گر بعدِ مرگ وحشتِ[1] دل کا گلا کروں ۔۔۔ موجِ غبار سے پرِ یک دشت وا کروں
آ، اے بہارِ ناز! کہ تیرے[2] خرام سے ۔۔۔ دستار گردِ شاخِ گُلِ نقشِ پا کروں
خوش اوفتادگی! کہ بہ صحرائے انتظار ۔۔۔ جوں جادہ، گردِ رہ سے نگہ سرمہ سا کروں
صبر اور یہ ادا کہ دل آوے اسیرِ چاک ۔۔۔ درد اور یہ کمیں کہ رہِ نالہ وا کروں
وہ بے دماغِ منّتِ اقبال ہوں کہ میں ۔۔۔ وحشت بہ داغِ سایۂ بالِ ہما کروں
وہ التماسِ لذّتِ بیداد ہوں کہ میں ۔۔۔ تیغِ ستم کو پشتِ خمِ التجا کروں
وہ رازِ نالہ ہوں کہ بشرحِ نگاہِ عجز ۔۔۔ افشاں، غبارِ سرمہ سے فردِ صدا کروں

لوں وام بختِ خفتہ سے، یک خوابِ خوش[3] ولے
غالبؔ[4]! یہ خوف[5] ہے کہ کہاں سے ادا کروں م

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں ۔۔۔ م ۔۔۔ خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
کسو کو زِ خود رستہ کم دیکھتے ہیں ۔۔۔ کہ آہو کو پابندِ رم دیکھتے ہیں

۱۔ نخ = عرضِ جنون ہوا
۲۔ ″ = جوشِ خرام
۳۔ ″ = اسؔد
۴۔ ″ = لیکن
۵۔ ″ = بیمِ

○ ۱۸۱۶ء

خطِ لختِ دل یک قلم دیکھتے ہیں ۔۔۔ مژہ کو جواہر رقم دیکھتے ہیں
دلِ آشفتگاں خالِ کُنجِ دہن کے ۔۔۔ م ۔۔۔ سُویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں
ترے سروِ قامت[1] سے یک قدِ آدم ۔۔۔ م ۔۔۔ قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کہ، اے محوِ آئینہ داری[2]! ۔۔۔ م ۔۔۔ تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں
سُراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے ۔۔۔ م ۔۔۔ کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
سرابِ یقیں ہیں پریشاں نگاہاں ۔۔۔ اسدؔ کو گرازِ چشم کم دیکھتے ہیں
کہ ہم بیضۂ طوطیِ ہند، غافل ۔۔۔ تہِ بالِ شمعِ حرم دیکھتے ہیں

*بنا کر فقیروں کا ہم بھیس، غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں م

▭ مت مردُمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں ۔۔۔ م ۔۔۔ ہیں جمع، سُویدائے دلِ چشم میں، آہیں
جوں مردمکِ چشم میں ہوں جمع، نگاہیں ۔۔۔ خوابیدہ[3] بہ حیرت کدۂ داغ ہیں آہیں
پھر حلقۂ کاکل میں پڑیں دید کی راہیں ۔۔۔ جوں دود، فراہم ہوئیں روزن میں نگاہیں

۱۔ نخ = رعنا ۔۔۔ ۲۔ نخ = بازی
۳۔ ″ = خوابیدہ حیرت کدہ
* یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا
▭ شبہ ہوتا ہے کہ یہ مطلع اس غزل کے آخری شعر (مطلع) ہے حسرت کش یک... ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ م میں اشاعت کے لیے صرف یہی مطلع انتخاب ہوا۔

○ ۶۱۸۱۶

پایا سرِ ہر ذرّہ، جگر گوشۂ وحشت — ہیں داغ سے معمور[1] شقایق کی کلاہیں
کس دل پہ ہے عزمِ صفِ مژگانِ خود آرا؟ — آئینے کے پایاب سے اتری ہیں سپاہیں
دیر و حرم، آئینۂ تکرارِ تمنّا — واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں
یہ مطلع، اسدؔ، جوہرِ افسونِ سخن ہو — گر عرض تپاکِ نفسِ سوختہ چاہیں

حسرت کشِ یک جلوۂ معنی ہیں نگاہیں
کھینچوں ہوں سُویداے دلِ چشم سے آہیں

جس[2] جا کہ پاے سیلِ بلا درمیاں نہیں — دیوانگاں کو[3] واں ہوسِ خانماں نہیں
کس جرم سے ہے چشم تجھے حسرتِ قبول — برگِ حنا مگر مژۂ خوں فشاں نہیں
ہر رنگِ گردش، آئنہ ایجادِ درد ہے — اشکِ سحاب، جز بوداعِ خزاں نہیں
جز[4] عجز کیا کروں بہ تمنّاے بے خودی! — طاقت، حریفِ سختیِ خوابِ گراں نہیں
عبرت سے پوچھ دردِ پریشانیِ نگاہ — یہ گردِ وہم جز بسرِ امتحاں نہیں
گل، غنچگی میں غرقۂ دریاے رنگ ہے — اے آگہی، فریبِ تماشا کہاں نہیں
برقِ بجانِ حوصلہ آتش فگن، اسدؔ — اے دلِ فسردہ! طاقتِ ضبطِ فغاں نہیں

۱۔ نخ = لبریز
۲۔ ″ = جاے کہ
۳۔ ″ = دیوانگانِ غم کو سر
۴۔ ″ = اے

○ ۶۱۸۱۶

مرگِ شیریں[1] ہو گئی تھی کوہکن کی فکر میں — تھا، حریرِ سنگ سے قطعِ کفن کی فکر میں
فرصتِ یک چشمِ حیرت[2]، شش جہت آغوش ہے — ہوں سپند آسا، وداعِ انجمن کی فکر میں
وہ غریبِ وحشت آبادِ تسلّی ہوں، جسے — کوچہ دے ہے زخمِ دل، صبحِ وطن کی فکر میں
سایۂ گل داغ و جوشِ نکہتِ گل موجِ دُود — رنگ کی گرمی ہے تاراجِ چمن کی فکر میں
فالِ ہستی، خارِ خارِ وحشتِ اندیشہ ہے — شوخیِ سوزن ہے سامانِ پیرہن کی فکر میں
غفلتِ دیوانہ، جز تمہیدِ آگاہی نہیں — مغزِ سر، خوابِ پریشاں ہے سخن کی فکر میں

مجھ میں اور مجنوں میں، وحشت، سازِ دعوا ہے، اسدؔ
برگ برگِ بید ہے ناخن زدن کی فکر میں

ہے ترحّم آفریں، آرایشِ بیداد، یاں — اشکِ چشمِ دام ہے، ہر دانۂ صیّاد، یاں
ہے، گدازِ موم، اندازِ چکیدن ہاے خوں — نیشِ زنبورِ عسل، ہے نشترِ فصّاد، یاں
ناگوارا ہے ہمیں، احسانِ صاحب دولتاں — ہے، زرِ گل بھی[3]، نظر میں جوہرِ فولاد، یاں
جنبشِ دل سے ہوے ہیں، عقدہ ہاے کار، وا — کمتریں مزدورِ سنگیں دست ہے، فرہاد، یاں
+دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا م — بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی داد، یاں

۱۔ نخ = حسرت
۲۔ نخ = تعبیر
۳۔ ″ = در نظرِ ما
+ یہ شعر پہلی بار حاشیہ ق میں اضافہ کیا گیا

○ ۱۸۱۶ء

ہیں زوال آمادہ، اجزا آفرینش کے تمام + ؎ مہرِ گردوں، ہے چراغِ رہگزارِ باد، یاں

قطرہ ہائے خونِ بسمل زیبِ داماں ہیں، اسدؔ
ہے تماشا کردنی گلچینیِ جلّاد، یاں

اے نوا سازِ تماشا، سر بکف جلتا ہوں میں
یک طرف جلتا ہے دل، اور یک طرف جلتا ہوں میں

شمع ہوں، لیکن بپا در رفتہ خارِ جستجو
مدّعا گم کردہ، ہر سو، ہر طرف جلتا ہوں میں

ہے، مساسِ دستِ افسوس، آتش انگیزِ تپش
بے تکلّف آپ پیدا کرکے تف جلتا ہوں میں

ہے تماشا گاہِ سوزِ تازہ، ہر یک عضوِ تن
جوں چراغانِ دوالی، صف بصف جلتا ہوں میں

شمع ہوں، تو بزم میں جا پاؤں غالبؔ کی طرح
بے محل، اے مجلس آرائے نجف! جلتا ہوں میں

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں
بہ رنگِ جادہ، سرِ کوئے یار رکھتے ہیں

برہنہ مستیِ صبحِ بہار رکھتے ہیں
جنونِ حسرتِ یک جامہ وار رکھتے ہیں

طلسمِ مستیِ دل، آں سوئے ہجومِ سرشک
ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں

ہمیں، حریرِ شرر بافِ سنگ، خلعت ہے
یہ ایک پیرہنِ زرنگار رکھتے ہیں

نگاہِ دیدۂ نقشِ قدم ہے، جادۂ راہ
گزشتگاں اثرِ انتظار رکھتے ہیں

+ یہ شعر پہلی بار حاشیہ ق میں درج کیا گیا

○ ۱۸۱۶ء

ہوا ہے گریۂ بے باک[1] ضبط سے تسبیح
ہزار دل پہ ہم ایک اختیار رکھتے ہیں

بساطِ ہیچ کسی ہیں، برنگِ ریگِ رواں
ہزار دل بہ وداعِ قرار رکھتے ہیں

برنگِ سایہ سروکارِ انتظار نہ پوچھ
سراغِ خلوتِ شب ہائے تار رکھتے ہیں

جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہے، غالبؔ
بسانِ[2] دشت، دلِ پُر غبار رکھتے ہیں

تن بہ بندِ ہوس در ندادہ رکھتے ہیں
دلِ ز کارِ جہاں اوفتادہ رکھتے ہیں

تمیزِ[3] زشتی و نیکی میں لاکھ باتیں ہیں
بہ عکسِ آئنہ، یک فردِ سادہ رکھتے ہیں

بہ رنگِ سایہ ہمیں بندگی میں ہے تسلیم
کہ داغِ دل بہ جبینِ کشادہ رکھتے ہیں

بہ زاہداں، رگِ گردن، ہے رشتۂ زنّار
سرِ بپائے بتے نانہادہ رکھتے ہیں

معافِ بیہودہ گوئی ہیں ناصحانِ عزیز
دلِ بدستِ نگارے ندادہ رکھتے ہیں

بہ رنگِ سبزہ، عزیزانِ بد[4] زباں یک دست
ہزار تیغ بہ زہرآب دادہ رکھتے ہیں

ادب نے سونپی ہمیں سرمہ سائیِ حیرت
زبانِ بستہ و چشمِ کشادہ رکھتے ہیں

زمانہ سخت کم آزار ہے، بجانِ اسدؔ ؎ وگرنہ ہم تو توقّع زیادہ رکھتے ہیں

۱۔ نخ = سرشار
۲۔ نخ = برنگ
۳۔ " = تمیزِ بخششِ زشتی و نیکوئی پر حرف
۴۔ " = کج

○ ۱۸۱۶ء

بہ غفلت عطرِ گل، ہم آگہی مخمور ملتے ہیں   چراغانِ تماشا، چشمِ صد ناسور ملتے ہیں
رہا کس جرم سے میں بیقرارِ داغِ ہم طرحی ؟   سمندر کو پرِ پروانہ سے کافور ملتے ہیں
چمن نا محرمِ آگاہیِ دیدارِ خوباں ہے   سحر گل ہائے نرگس چندِ چشمِ کور ملتے ہیں
کجا جوہر؟ چہ عکسِ خط؟ بتاں وقتِ خود آرائی   دل آئینہ زیرِ پائے خیلِ مور ملتے ہیں
تماشائے بہار، آئینۂ[1] پردازِ تسلی ہے   کفِ[2] گل برگ سے پائے دلِ رنجور ملتے ہیں
گراں جانیِ سنگ سار، و تماشائے دماغ آیا   کفِ افسوسِ فرصت، سنگِ کوہِ طور ملتے ہیں

اسد حسرت کشِ یک داغِ مشک اندودہ[3] ہے یارب
لباسِ شمع پر عطرِ شبِ دیجور ملتے ہیں

بہ رشکِ آشفتہ سر تھا قطرہ زن مژگاں بہ جانے میں   رہے یاں شوخیِ رفتار سے، پا آستانے میں
ہجومِ مژدۂ دیدار، و پروازِ تماشا ہا   گلِ اقبالِ خس ہے چشمِ بلبل، آشیانے میں
ہوئی یہ بیخودی چشم و زباں کو تیرے جلوے سے   کہ طوطی قفلِ زنگ آلودہ ہے آئینہ خانے میں
ترے کوچے میں ہے مشاطۂ واماندگی، قاصد   پرِ پرواز، زلفِ ناز ہے ہدہد کے شانے میں
کجا معزولیِ آئینہ؟ کو ترکِ خود آرائی ؟   نمد در آب ہے اے سادہ پرکار اس بہانے میں

۱۔ نخ = آئینہ پردازِ تسکیں
۲۔ ″ = بجیبِ گل کفِ پائے ....
۳۔ ″ = آلودہ

○ ۱۸۱۶ء

بہ حکمِ[1] عجز، ابروئے مہِ تو حیرت ایما ہے   کہ یاں گم کر جبینِ سجدہ فرسا آستانے میں
+ قیامت ہے کہ حسنِ لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا   م   تعجب سے وہ بولا "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں؟"
* دلِ نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالب   م   نہ کر سرگرم اس کافر کی الفت آزمانے میں

فزوں کی دوستوں نے حرصِ قاتل ذوقِ کشتن میں   ہوئے ہیں بخیہ ہائے زخم، جوہر تیغِ دشمن میں
▭ نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں   م   ہوا ہے تارِ اشکِ یاس، رشتہ چشمِ سوزن میں
تماشا کردنی ہے لطفِ زخمِ انتظار[2]، اے دل   سوادِ داغِ مرہم، مردمک ہے چشمِ سوزن میں
دل و دین و خرد، تاراجِ نازِ جلوہ پیرائی   ہوا ہے جوہرِ آئینہ، خیلِ مور خرمن میں
نکوہش، مانعِ بے[3] ربطیِ شورِ جنوں آئی   م   ہوا ہے[4] خندۂ احباب، بخیہ جیب و دامن میں
ہوئی[5] ہے مانعِ ذوقِ تماشا، خانہ ویرانی   م   کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں
▭ ودیعت خانۂ بیدادِ کاوشہائے مژگاں ہوں   م   نگینِ نامِ شاہد ہے مرے ہر قطرۂ خوں تن میں
▭ بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی ؟   م   شبِ مہ ہو، جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں
▭ ہوئے اس مہر وش کے جلوۂ تمثال کے آگے   م   پر افشاں جوہر آئینے میں، مثلِ ذرہ روزن میں

۱۔ نخ = اسد آں   ۲۔ نخ = انتظارِ دل
۳۔ ″ = دیوانگی ہائے جنوں   ۴۔ ″ = لگایا خندۂ ناصح نے بخیہ
۵۔ ″ = ہے   ہوئی تقریبِ منعِ شوقِ دیدن خانہ ویرانی
▭ یہ اشعار گلِ میں نہیں مگر م میں موجود ہیں۔ شاید ۱۸۲۸ء تا ۱۸۴۰ء کسی وقت فکر کیے گئے ہوں گے۔
+ یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں اضافہ ہوا۔
* یہ شعر پہلے پہل متن ق میں درج ہوا۔

○ ۱۸۱۶ء

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے[ع۵] م جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں
ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو[ع۵] م سیہ ہو کر سویدا ہو گیا، ہر قطرہ خوں، تن میں
اسدؔ، زندانیِ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں م خمِ دستِ نوازش، ہو گیا ہے طوق گردن میں

خوں در جگر نہفتہ، بہ زردی رسیدہ ہوں — خود آشیانِ طائرِ رنگِ پریدہ ہوں
ہے دستِ ردبہ سیرِ جہاں، بستنِ نظر — پائے ہوس بدامنِ مژگاں کشیدہ ہوں
ہیں چشمِ واکشادہ و گلشن نظر فریب — لیکن عبث کہ شبنمِ خورشید دیدہ ہوں
تسلیم سے یہ نالۂ موزوں ہوا حصول — اے بے خبر، میں نغمۂ چنگِ خمیدہ ہوں
پیدا نہیں ہے اصلِ تگ و تازِ جستجو — مانندِ موجِ آب، زبانِ بریدہ ہوں
سر پر مرے وبالِ ہزار آرزو رہا — یارب، میں کس غریب کا بختِ رمیدہ ہوں
میں بے ہنر کہ جوہرِ آئینہ تھا، عبث — پائے نگاہِ خلق میں خارِ خلیدہ ہوں

میرا نیاز و عجز ہے مفتِ بتاں، اسدؔ
یعنی کہ بندۂ بہ درم ناخریدہ ہوں

سودائے عشق سے دمِ سردِ کشیدہ ہوں — شامِ خیالِ زلف سے صبحِ دمیدہ ہوں
دورانِ سر سے گردشِ ساغر ہے متصل — خمخانۂ جنوں میں دماغِ رسیدہ ہوں

ع۵ یہ اشعار پہلی بار گل میں درج ہوئے

○ ۱۸۱۶ء

کی متصلِ ستارہ شماری میں عمر صرف — تسبیحِ اشک ہائے زِ مژگاں چکیدہ ہوں
ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں — خارِ الم سے، پشت بدنداں گزیدہ ہوں
ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج — میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں
دیتا ہوں کشتگاں کو سخن سے سرِ تپش — مضرابِ تارہائے گلوئے بریدہ ہوں
ہے جنبشِ زباں بدہن سخت ناگوار — خونابۂ ہلاہلِ حسرت چشیدہ ہوں

جوں بوئے گل، ہوں گرچہ گراں بارِ منتِ زر
لیکن، اسدؔ، بوقتِ گزشتن جریدہ ہوں

ہوئی ہیں آب، شرمِ کوششِ بیجا سے تدبیریں — عرق ریزِ تپش ہیں، موج کے مانند زنجیریں
خیالِ سادگی ہائے تصور، نقشِ حیرت ہے — پرِ عنقا پہ رنگِ رفتہ سے کھینچی ہیں[۲] تصویریں
زبس ہر شمع یاں آئینۂ حیرت پرستی ہے — کرے ہیں غنچۂ منقارِ طوطی نقشِ گل گیریں
سپند آہنگیِ ہستی و سعیِ نالہ فرسائی — غبار آلودہ ہیں، جوں دردِ شمعِ کشتہ تقریریں
ہجومِ سادہ لوحی، پنبۂ گوشِ حریفاں ہے — وگرنہ خواب کی مضمر ہیں افسانے میں تعبیریں

۱۔ نخ = مانندِ شانہ، دست بدنداں
۲۔ 〃 = کھینچے ہے
۳۔ 〃 = طرازی
۴۔ 〃 ہے درشتیِ تامل ہے فسونِ پنبہ درگوشی

○..... ١٨١٦ء

بتانِ شوخ کی تمکینِ بعد از قتل کی حیرت
بیاضِ دیدۂ نخچیر پر کھینچے ہے تصویریں

اسدؔ، طرزِ عروجِ اضطراب[1] دل کو کیا کہیے
سمجھتا[2] ہوں تپش کو الفتِ قاتل کی تاثیریں

بے دماغی، حیلہ جُوے ترکِ تنہائی نہیں
ورنہ کیا موجِ نفس زنجیرِ رسوائی نہیں؟

وحشی خو کردۂ نظّارہ ہے، حیرت، جسے
حلقۂ زنجیر، جز چشمِ تماشائی نہیں

قطرے کو جوشِ عرق کرتا ہے دریا دستگاہ
جز حیا، پرکارِ سعیِ بے سروپائی نہیں

چشمِ نرگس میں نمک بھرتی[3] ہے شبنم سے بہار
فرصتِ نشوونما، سازِ شکیبائی نہیں

کس کو دوں، یارب، حسابِ سوزناکی ہاے دل؟
آمد و رفتِ نفس، جز شعلہ پیمائی نہیں

مت رکھ، اے انجام غافل، سازِ ہستی پر غرور
چیونٹی[4] کے پر، سروبرگِ خود آرائی نہیں

سایۂ اُفتادگی بالین و بستر ہوں، اسدؔ
جوں صنوبر، دل سراپا قامت آرائی نہیں

ظاہرا سر پنجۂ افتادگاں گیرا نہیں
ورنہ کیا حسرت[5] کشِ دامن پہ نقشِ پا نہیں

١۔ نخ = بسمل آہنگاں ٢۔ نخ = سمجھتے ہیں
٣۔ " = بوتی ٤۔ " = مور کے پر ہیں
٥۔ " = داماں کی حسرت

○..... ١٨١٦ء

آنکھیں پتھرائی ہیں، نا محسوس ہے تارِ نگاہ
ہے زمیں از بس کہ سنگیں، جادہ بھی پیدا نہیں

ہو چکے ہم جادہ ساں صد بار قطع، اور[1] پھر ہنوز
زینتِ یک پیرہن، جوں دامنِ صحرا نہیں

ہو سکے ہے پردۂ جوشیدنِ خونِ جگر
اشک، بعدِ ضبط، غیر از[2] پنبۂ مینا نہیں

ہو سکے کب کلفتِ دل، مانعِ سیلانِ اشک؟
گردِ ساحل، سنگِ راہِ جوششِ دریا نہیں

ہے[3] طلسمِ دہر میں، صد حشر پاداشِ عمل
آگہی غافل، کہ اک امروز بے فردا نہیں

بسمل+ اس تیغِ دو دستی کا نہیں بچتا، اسدؔ
عافیت بیزار، ذوقِ کعبتین اچھا نہیں

ضبط سے مطلب، بجز وارستگی دیگر نہیں
دامنِ تمثال، آبِ آئنہ سے تر نہیں

ہے[4] وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت
عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں

باعثِ ایذا ہے، برہم خوردنِ بزمِ سرور
لخت[5] لختِ شیشۂ بشکستہ، جز نشتر نہیں

واں[6] سیاہی مردمک ہے، اور یاں داغِ شراب
مہ، حریفِ نازشِ ہم چشمیِ ساغر نہیں

ہے فلک بالا نشیں، فیضِ خمِ گردیدنی
عاجزی سے، ظاہرا رتبہ کوئی برتر نہیں

١۔ نخ = د تا ہنوز ٢۔ نخ = کم
٣۔ " = اے اسدؔ ہے
٤۔ " = سے ہوتے ہیں بے قدر در کنجِ وطن صاحب دلاں
٥۔ " = سے شیشہ ریزہ غیر عرقِ شوخیِ نشتر نہیں
٦۔ " = سے واں سیاہی ہے سوادِ مردمک، یاں داغِ مے
+ یہ شعر پہلی بار حاشیہ ق میں بڑھایا گیا

○ ۱۸۱۶ء

دل کو اظہارِ سخن، اندازِ فتح الباب ہے　　یاں صریرِ خامہ غیر از اصطکاکِ در نہیں
ہوگئی ۵ ہے غیر کی شیریں بیانی، کارگر　　عشق کا، اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں
کب تلک پھیرے اسدؔ لب ہائے تفتہ پر زباں؟
تابِ عرضِ تشنگی، اے ساقیِ کوثر، نہیں

ضمانِ جادہ رو یا ندن ہے خطِ جامِ مے نوشاں　　وگرنہ منزلِ حیرت سے کیا واقف ہیں مدہوشاں؟
نہیں ہے ضبط، بجز مشاطگی ہائے غمِ آرائش　　کہ میلِ سرمۂ چشم داغ میں ہے آہِ خاموشاں
بہ ہنگامِ تصور ساغرِ زانو سے پیتا ہوں　　مئے کیفیتِ خمیازہ ہائے صبحِ آغوشاں
نشانِ روشنیِ دل نہاں ہے تیرہ بختوں کا　　نہیں محسوس، دودِ مشعلِ بزمِ سیہ پوشاں
پریشانی، اسدؔ، در پردہ ہے سامانِ جمعیت
کہ ہے آبادیِ صحرا، ہجومِ خانہ بردوشاں

نہیں ہے بے سبب قطرے کو شکلِ گوہر افسردن　　گرہ ہے حسرتِ آبے بروئے کار آوردن
مہِ نو سے ہے، رہزن وار، نعلِ واژگوں باندھا　　نہیں ممکن بجولاں ہائے گردوں دخل پے بردن
خمارِ ضبط سے بھی نشۂ اظہار پیدا ہے　　تراوش شیرۂ انگور کی ہے مفتِ افشردن
خراب آبادِ غربت میں عبث افسوسِ ویرانی　　گلِ از شاخ دور افتادہ ہے نزدیکِ پژمردن

۵　یہ شعر پہلی بار متن قطع میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

فغان و آہ سے حاصل بجز دردِ سرِ یاراں　　خوشا! اے غفلت آگاہاں نفس دزدیدن و مردن
دریغا! بستنِ رختِ سفر سے ہو کے ہیں غافل　　رہا پامالِ حسرت ہائے فرشِ بزم گستردن
اسدؔ، ہے طبع مجبورِ تمنّا آفرینی ہا
فغاں! بے اختیاری و فریبِ آرزو خوردن

دیکھیے مت چشمِ کم سے سوئے ضبط افسردگاں　　جوں صدف پُر دُر ہیں، دنداں بجگر افشردگاں
گرمِ تکلیفِ دلِ رنجیدہ ہے از بس کہ چرخ　　قرصِ کافوری ہے مہر، از بہرِ سرما خوردگاں
رنجشِ دل[۱] یک جہاں ویراں کرے گی، اے فلک　　دشت ساماں ہے غبارِ خاطرِ آزردگاں
ہاتھ پر ہو ہاتھ، تو[۲] درسِ تأسف ہی سہی　　شوق مفتِ زندگی ہے، اے بہ غفلت مردگاں
خار سے گل سینہ افگارِ جفا ہے، اے اسدؔ
برگ ریزی ہے پرافشانیِ ناوک خوردگاں

سازشِ صلحِ بتاں میں ہے نہاں جنگیدن　　نغمہ و چنگ ہیں جوں تیر و کماں فہمیدن
بس کہ شرمندۂ بوئے خوشِ گل رویاں ہے　　نکہتِ گل کو ہے غنچے میں نفس دزدیدن
ہے فروغِ رخِ افروختۂ خوباں سے　　شعلۂ شمع، پرافشانِ بخود لرزیدن

۱۔ نخ = ہا
۲۔ ؍؍ = تاہم جنبشِ فرسودنی

○ ۱۸۱۶ء

گلشنِ زخم کھلاتا ہے جگر میں، پیکاں — گرہِ غنچہ ہے، سامانِ چمن بالیدن
چمنِ دہر میں ہوں سبزۂ بیگانہ، اسدؔ
وائے! اے بے خودی و تہمتِ آرامیدن

صاف ہے ازبس کہ عکسِ گل سے گلزارِ چمن — جانشینِ جوہرِ آئینہ ہے خارِ چمن
ہے نزاکت بس کہ فصلِ گل[1] میں معمارِ چمن — قالبِ گل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن
بڑشکالِ گریۂ عاشق ہے، دیکھا چاہیے — م — کھل گئی، مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن
الفتِ گل سے، غلط ہے، دعویِ وارستگی — م — سرو ہے، باوصفِ آزادی، گرفتارِ چمن
تیری آرائش کا استقبال کرتی ہے بہار — جوہرِ آئینہ، ہے یاں نقشِ احضارِ چمن
بس کہ پائی یار کی رنگیں ادائی سے شکست — ہے، کلاہِ نازِ گل، بر طاقِ دیوارِ چمن
وقت ہے، گر بلبلِ مسکیں زلیخائی کرے — یوسفِ گل جلوہ فرما ہے بہ بازارِ چمن
وحشت افزا گریہ ہا موقوفِ فصلِ گل، اسدؔ
چشمِ دریا[2] بار ہے میرابِ سرکارِ چمن

منقار سے رکھتا ہوں بہم چاکِ قفس کو — تا گل زِ جگر زخم میں ہے راہ نفس کو

۱۔ نخ = اس موسم ۲۔ نخ = دریاریز
+ یہ شعر پہلی بار حاشیہ ق میں بڑھایا گیا

○ ۱۸۱۶ء

بیباک ہوں ازبس کہ بہ بازارِ محبت — سمجھا ہوں زرہ جوہرِ شمشیرِ عسس کو
رہنے دو گرفتار بہ زندانِ خموشی — چھیڑو نہ مجھ افسردۂ دزدیدہ نفس کو
پیدا ہوئے ہیں ہم الم آبادِ جہاں میں — فرسودنِ پائے طلبِ دستِ ہوس کو
نالاں ہو، اسدؔ، تو بھی سرِ راہ گزر پر
کہتے ہیں کہ تاثیر ہے فریادِ جرس کو

اگر وہ آفتِ نظارہ جلوہ گستر ہو — ہلال، ناخنکِ دیدہ ہائے اختر ہو
بہ یادِ قامت، اگر ہو بلند آتشِ غم — ہر ایک داغِ جگر، آفتابِ محشر ہو
*ستم کشی کا، کیا دل نے، حوصلہ پیدا — اب اس سے ربط کروں جو بہت ستمگر ہو
عجب نہیں پئے تحریرِ حالِ گریۂ چشم — بروئے آب[1] جو ہر موج نقشِ مسطر ہو
امیدوار ہوں، تاثیرِ تلخ کامی سے — کہ قندِ بوسۂ شیریں لباں مکرر ہو
صدف کی[2]، ہے ترے نقشِ قدم میں کیفیت
سرشکِ چشمِ اسدؔ، کیوں نہ اس میں گوہر ہو

۱۔ نخ = کہ سطحِ آب پر
۲۔ ″ = اسدؔ پہ گوشۂ چشمِ عنایت لے آقا
کہ یہ سرشکِ زِ چشم اوفتادہ گوہر ہو
* یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

بے درد، سر بہ سجدۂ الفت فرو نہ ہو ۔۔۔ جوں شمع، غوطہ داغ میں کھا، گر وضو نہ ہو
دل[1] دے کفِ تغافلِ ابروے یار میں[2] ۔۔۔ آئینہ ایسے طاق پہ گم کر کہ تو نہ ہو
زلفِ خیالِ نازک و اظہار بے قرار ۔۔۔ یارب، بیاں[3] شانہ کشِ گفتگو نہ ہو
تمثالِ ناز، جلوۂ نیرنگِ اعتبار[4] ۔۔۔ ہستی عدم ہے، آئینہ گر روبرو نہ ہو
مژگاں خلیدۂ رگِ ابرِ بہار ہے ۔۔۔ نشتر، بہ مغز، پنبۂ مینا فرو نہ ہو
عرضِ نشاطِ دید ہے، مژگانِ انتظار ۔۔۔ یارب کہ خارِ پیرہنِ آرزو نہ ہو

واں پر فشانِ دامِ نظر ہوں جہاں، اسدؔ
صبحِ بہار بھی، قفسِ رنگ و بو نہ ہو

حسد[5] سے دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو ۔۔۔ م ۔۔۔ کہ چشمِ تنگ، شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو
بہ بالیدن سنگ و گلِ صحرا یہ چاہے[6] ہے ۔۔۔ کہ تارِ جادہ بھی کہسار کو زنارِ مینا ہو
حریفِ وحشتِ نازِ نسیمِ عشق جب آوے ۔۔۔ کہ مثلِ غنچہ، سازِ یک[8] گلستاں دل مہیا ہو

۱۔ نخ = در ۔۔۔ ۲۔ نخ = سوتے
۳۔ ″ = کہ شوق ۔۔۔ ۴۔ ″ = جلوہ گرِ نقشِ اعتبار
۵۔ ″ = ے حسد پیمانہ ہے دل، عالمِ آبِ تماشا ہو
۶۔ ″ = کیفیت
۷۔ ″ ہا ۔۔۔ ۸۔ نخ =

○ ۱۸۱۶ء

بجاے دانہ، خرمن یک بیاباں بیضۂ قمری ۔۔۔ مرا[1] حاصل وہ نسخہ ہے کہ جس سے خاک پیدا ہو
کرے کیا سازِ بینش وہ شہیدِ[2] دردِ آگاہی؟ ۔۔۔ جسے موے دماغِ بے خودی، خوابِ زلیخا ہو
بقدرِ[3] حسرتِ دل چاہیے، ذوقِ معاصی بھی ۔۔۔ م ۔۔۔ بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو
وہ دل، جوں شمع، بہرِ دعوتِ نظارہ لا، جس[4] سے ۔۔۔ نگہ لبریزِ اشک و سینہ معمورِ تمنا ہو
اگر[5] وہ سرو قد، گرمِ خرامِ ناز آ جاوے ۔۔۔ م ۔۔۔ کفِ ہر خاکِ گلشن، شکلِ قمری، نالہ فرسا ہو

نہ دیکھیں روے یک دل سرد، غیر از شمعِ کافوری
خدایا،[6] اس قدر بزمِ اسدؔ گرمِ تماشا ہو

مبادا! بے تکلف فصل کا برگ و نوا کم ہو ۔۔۔ مگر طوفانِ مے میں پیچشِ موجِ صبا کم ہو
سبب وارستگاں کو تنگیِ ہمت ہے، خداوندا ۔۔۔ اثر سرمے سے اور لب ہاے عاشق سے صدا کم ہو
نہیں جز دردِ تسکینِ تکوشش ہاے بیدرداں ۔۔۔ کہ موجِ گریہ میں صد خندۂ دنداں نما گم ہو
ہوئی ہے ناتوانی، بے دماغِ شوخیِ مطلب ۔۔۔ فرو[7] ہوتا ہے سر سجدے میں ادے ستِ دعا گم ہو

۱۔ نخ = مجھے
۲۔ ″ = تماشا رنجِ آگاہی
۳۔ ″ = ے جنونِ عیش ہے یارب سروسامانِ آزادی / کروں یک گوشۂ دامن تر، گر آبِ ہفت دریا ہو
۴۔ ″ = یعنی
۵۔ ″ = اگر وہ سروِ جاں بخشِ خرامِ اہتزاز آوے
۶۔ ″ = خدایا! بزمِ غالبؔ اس قدر گرمِ تماشا ہو
۷۔ ″ = جبیں میں در لباسِ سجدہ لے ۔۔۔

○ ۱۸۱۶ء

تجھے ہم مفت دیویں یک جہاں چینِ جبیں لیکن — مبادا اے بیچتابِ طبع نقشِ مدّعا گم ہو
بلاگردانِ تمکینِ بتاں، صد موجۂ گوہر — عرق بھی جن کے عارض پر بہ تکلیفِ حیا گم ہو
اُٹھاوے کب وہ جانِ شرم تہمت قتلِ عاشق کی — کہ جس کے ہاتھ میں مانندِ خوں، رنگِ حنا گم ہو

کریں خوباں جو سیرِ حسن، اسدؔ، یک پردہ نازک تر
دمِ صبحِ قیامت، در گریبانِ قبا گم ہو

خشکیِ مَے نے تلف کی مے کدے کی آبرو — کاسۂ دریوزہ ہے، پیمانۂ دستِ سبو[1]
بہرِ جاں پروردنِ یعقوب، بالِ چاک سے — وام لیتے[2] ہیں، پرِ پرواز، پیراہن کی بو
گردِ ساحل، ہے نمِ شرمِ جبینِ آشنا — گر نہ باندھے قلزمِ الفت میں سرِ جائے کدو
گرمیِ شوقِ طلب، ہے عینِ تاپاکِ وصال — غافلاں، آئینہ داں ہے، نقشِ پائے جستجو
رہنِ خاموشی میں ہے آرایشِ بزمِ وصال — ہے پرِ پروازِ رنگِ رفتۂ خوں، گفتگو
ہے تماشا، حیرت آبادِ تغافل ہائے شوق — یک رگِ خواب و سراسر جوشِ خونِ آرزو

خوئے شرمِ سرد بازاری، ہے سیلِ خانماں
ہے، اسدؔ نقصاں میں مفت اوصاحبِ سرمایہ تو

۱۔ نخ = سے کاسۂ دریوزگی ہے جام بر دستِ سبو
۲۔ ″ = لیتی ہے

○ ۱۸۱۶ء

اشکِ چکیدہ، رنگِ پریدہ — ہر طرح ہوں میں از خود رمیدہ
گو، یاد مجھ کو کرتے ہیں خوباں — لیکن بسانِ دردِ کشیدہ
ہے رشتۂ جاں فرطِ کشش سے — مانندِ نبضِ دستِ بُریدہ
ٹوٹا ہے، افسوس! موئے خمِ زُلف — ہے شانہ یکسر دستِ گزیدہ
خالِ سیاہِ رنگیں رُخاں سے — ہے داغِ لالہ در خوں طپیدہ
جوشِ جنوں سے جوں کسوتِ گل — سرتابہ پا ہوں، جیبِ دریدہ

یارو، اسدؔ کا نام و نشاں کیا؟
بیدل، فقیرِ آفت رسیدہ

خوشا! طوطیؔ و کُنجِ آشیانہ — نہاں در زیرِ بال آئینہ خانہ
سرشکِ بر زمیں اُفتادہ آسا — اُٹھایاں سے نہ میرا آب و دانہ
حریفِ عرضِ سوزِ دل نہیں ہے — زباں ہر چند ہو جاوے زبانہ
دلِ نالاں سے ہے بے پردہ پیدا — نوائے بربط و چنگ و چغانہ
کرے کیا دعویِ آزادیِ عشق — گرفتارِ الم ہائے زمانہ

اسدؔ، اندیشۂ ششدر شُدن ہے
نہ بھریے مہرہ ساں خانہ بخانہ

○ ۱۸۱۶ء

رفتار سے شیرازۂ اجزائے قدم باندھ — اے آبلۂ[1] محمل پئے صحرائے عدم باندھ
بیکاریِ تسلیم، بہر رنگ چمن ہے — گر خاک ہو گلدستۂ صد نقشِ قدم باندھ
اے جادۂ[2]، بسر رشتۂ یک ریشہ دو یدن — شیرازۂ صد آبلہ جوں سُبحہ، بہم باندھ
حیرت، حدِ اقلیمِ تمنائے پری ہے — آئینۂ[3] پہ آئینِ گلستانِ اِرم باندھ
پامردیِ یک انداز نہیں قامتِ ہستی — طاقت اگر اعجاز کرے تہمتِ خم باندھ

دیباچۂ وحشت ہے، اسدؔ، شکوۂ خوباں
خوں کر دلِ اندیشہ و مضمونِ ستم باندھ

خلق ہے صفحۂ عبرت سے سبق ناخواندہ — ورنہ ہے چرخ و زمیں، یک ورقِ گردانده
دیکھ کر[4] بادہ پرستوں کی دل افسردگیاں — موجِ مے، مثلِ خطِ جام، ہے برجا مانده
خواہشِ دل ہے زباں کو سببِ گفت و بیاں — ہے سخن، گردِ زِ دامانِ ضمیر افشانده
کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے — ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخوانده
حیف[5]! بے حاصلیِ اہلِ ریا پر، غالبؔ — یعنی ہیں ماندہ[6] ازاں سو و ازیں سو رانده

۱۔ نخ = آبلہ
۲۔ " = جادہ
۳۔ " = تا آئینہ
۴۔ " = ہے = ہے کدے میں ز دل افسردگیِ بادہ کشاں
۵۔ " = ہے = اے اسدؔ ولے بہ بے حاصلیِ بوالہوساں
۶۔ " = ہرزہ

○ ۱۸۱۶ء

بس[1] کہ مے پیتے ہیں، اربابِ فنا پوشیدہ — خطِ پیمانۂ مے، ہے نفسِ دزدیدہ
بہ غرورِ طرحِ قامت و رعنائیِ سرو — طوق، ہے گردنِ قمری میں رگِ بالیدہ
کی ہے وا اہلِ جہاں نے بہ گلستانِ جہاں — چشمِ غفلت نظرِ شبنمِ خور نادیدہ
اے دریغا! کہ نہیں طبعِ نزاکت ساماں — ورنہ کانٹے میں تُلے ہے سخنِ سنجیدہ
یاس* آئینۂ پیدائیِ استغنا ہے — ناامیدی ہے پرستارِ دلِ رنجیدہ

واسطے[2] فکرِ مضامینِ متیں کے، غالبؔ
چاہیئے خاطرِ جمع و دلِ آرامیدہ

از مہر تا بہ ذرّہ دل و دل ہے آئنہ م — طوطی کو شش جہت سے، مقابل ہے آئنہ
حیرت، ہجومِ لذتِ غلطانیِ تپش — سیماب بالش و کمرِ دل ہے آئنہ
غفلت، بہ بالِ جوہرِ شمشیر پرفشاں — یاں پشتِ چشمِ شوخیِ قاتل ہے آئنہ
حیرت نگاہ برق، تماشا بہار شوخ — در[3] پردۂ ہوا، پرِ بسمل ہے آئنہ
یاں رہ گئے ہیں ناخنِ تدبیر ٹوٹ کر — جوہر طلسمِ عقدۂ مشکل ہے آئنہ

۱۔ نخ = ہے = بس کہ مے پینے لگے بادہ کشاں پوشیدہ
۲۔ " = ہے = اے اسدؔ بہرِ رم آموختنی ہائے تپش
۳۔ " = درکسوت
* یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

ہم زانوے تامّل و ہم جلوہ گاہِ گُل   آئینہ بندِ خلوت و محفل ہے آئینہ

دل کارگاہِ فکر و اسدؔ بے نوائے دل
یاں سنگِ آستانۂ بیدؔل ہے آئینہ

جوشِ دل ہے، مجھ سے[1] حسنِ فطرتِ بیدل نہ پوچھ   قطرے[2] سے میخانۂ دریا ے بے ساحل نہ پوچھ
پہن گشتن ہاے دل، بزمِ نشاطِ گرد باد   لذّتِ عرضِ کشادِ عقدۂ مشکل نہ پوچھ
آبلہ، پیمانۂ اندازۂ تشویش تھا   اے دماغِ نارسا! خم خانۂ منزل نہ پوچھ
نَے صبا بالِ پری، نَے شعلہ سامانِ[3] جنوں   شمع سے جز عرضِ افسونِ گدازِ دل نہ پوچھ
یک مژہ برہم زدن حشرِ دو عالم فتنہ ہے   یاں سراغِ عافیت جز دیدۂ بسمل نہ پوچھ
بزم ہے یک پنبۂ مینا، گدازِ ربط سے   عیش کر غافل، حجابِ نشۂ محفل نہ پوچھ

تا تخلّص جامۂ شنگرفی ارزانی ، اسدؔ
شاعری جز سازِ درویشی نہیں حاصل نہ پوچھ

جز، دل سراغِ دردِ بدل خفتگاں نہ پوچھ   آئینہ عرض کر، خط و خالِ بیاں نہ پوچھ
پرواز یک تپ غمِ تسخیرِ نالہ ہے   گرمیِ نبضِ خار و خسِ آشیاں نہ پوچھ

۱۔ نخ = نشۂ ہاے   ۲۔ نخ = قطرہ
۳۔ " = حرزِ عافیت

○ ۱۸۱۶ء

+ ہے سبزہ زار، ہر در و دیوارِ غمکدہ   م   جس کی بہار یہ ہو، پھر اس کی خزاں نہ پوچھ
ہندوستان سایۂ گل پاے تخت تھا   جاہ و جلالِ[1] عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ
تو مشقِ[2] ناز کر، دلِ پروانہ ہے بہار   بے تابیِ تجلّیِ آتش بجاں نہ پوچھ
غفلت متاعِ کفّۂ میزانِ عدل ہوں[3]   یارب، حسابِ سختیِ خوابِ گراں نہ پوچھ
ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے   عرضِ فضاے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ
ناچار[5] بیکسی کی بھی حسرت اُٹھائیے   م   دشواریِ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

کہتا[4] تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے کہ آہ
دردِ جدائیِ اسداللہ خاں نہ پوچھ

ضبط[5] سے، جوں مردمکِ اسپند اقامت گیر ہے   مجمرِ بزمِ فسردن، دیدۂ نخچیر ہے
آشیاں بندِ بہارِ عیش ہوں ہنگامِ قتل   یاں پرِ پروازِ رنگِ رفتہ، بالِ تیر ہے
ہے جہاں فکرِ کشیدن ہاے نقشِ روے یار   ماہتابِ ہالہ پیرا، گردۂ تصویر ہے
وقتِ حسن افروزیِ زینت طرازاں، جاے گل   ہر نہالِ[6] شمع میں اِک غنچۂ گل گیر ہے

۱۔ نخ = نازِ بہارِ رفتہ   ۲۔ نخ = عرض   ۳۔ نخ = ہیں
۴۔ " = ے کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوزِ دل
۵۔ " = ے ضبط سے اسپند جوں مردم اقامت گیر ہے
۶۔ " = ے از نہالِ شمع پیدا غنچۂ ------
+ یہ شعر پہلی بار حاشیہ ق میں اضافہ کیا گیا
۵ یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

ہم زانوے تامّل و ہم جلوہ گاہِ گُل   آئینہ بندِ خلوت و محفل ہے آئینہ

دل کارگاہِ فکر و اسدؔ بے نواے دل

یاں سنگِ آستانۂ بیدلؔ ہے آئینہ

جوشِ دل ہے مجھ سے[1] حسنِ فطرتِ بیدل نہ پوچھ   قطرے[2] سے میخانہ دریاے بے ساحل نہ پوچھ

پہن گشتن ہاے دل، بزمِ نشاطِ گرد باد   لذّتِ عرضِ کشادِ عقدۂ مشکل نہ پوچھ

آبلہ، پیمانۂ اندازۂ تشویش تھا   اے دماغِ نارسا! خم خانۂ منزل نہ پوچھ

نے صبا بالِ پری، نے شعلہ سامانِ[3] جنوں   شمع سے جز عرضِ افسونِ گدازِ دل نہ پوچھ

یک مژہ برہم زدن، حشرِ دو عالم فتنہ ہے   یاں سراغِ عافیت جز دیدۂ بسمل نہ پوچھ

بزم ہے یک پنبۂ مینا، گدازِ ربط سے   عیش کر غافل، حجابِ نشّۂ محفل نہ پوچھ

تا تخلّص جامۂ شنگرفی ارزانی، اسدؔ

شاعری جز سازِ درویشی نہیں حاصل نہ پوچھ

جز، دل سُراغِ دردِ بدل خفتگاں نہ پوچھ   آئینہ عرض کر، خط و خالِ بیاں نہ پوچھ

پرواز، یک تپِ غمِ تسخیرِ نالہ ہے   گرمیِّ نبضِ خار و خسِ آشیاں نہ پوچھ

۱۔ نخ = نشّۂ ہاے   ۲۔ نخ = قطرہ
۳۔ " = حرزِ عافیّت

○ ۱۸۱۶ء

ہے[+] سبزہ زار، ہر در و دیوارِ غمکدہ   م   جس کی بہار یہ ہو، پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

ہندوستان سایۂ گل پاے تخت تھا   جاہ[1] و جلالِ عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ

تو مشقِ[2] ناز کر، دل پروانہ ہے بہار   بے تابیِ تجلّیِ آتش بجاں نہ پوچھ

غفلت متاعِ کفّۂ میزانِ عدل ہوں[3]   یارب، حسابِ سختیِ خوابِ گراں نہ پوچھ

ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے   عرضِ فضاے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ

ناچار[5] بیکسی کی بھی حسرت اُٹھائیے   م   دشواریِ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

کہتا[4] تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے کہ آہ

دردِ جدائیِ اسد اللہ خاں نہ پوچھ

ضبط[5] سے، جوں مردمکِ اسپند اقامت گیر ہے   مجمرِ بزمِ فسردن، دیدۂ نخچیر ہے

آشیاں بندِ بہارِ عیش ہوں ہنگامِ قتل   یاں پرِ پروازِ رنگِ رفتہ، بالِ تیر ہے

ہے جہاں فکرِ کشیدن ہاے نقشِ روے یار   ماہتاب ہالہ پیرا، گردۂ تصویر ہے

وقتِ حسن افروزیِ زینت طرازانِ جاے گل   ہر[6] نہالِ شمع میں اِک غنچۂ گل گیر ہے

۱۔ نخ = نازِ بہارِ رفتہ   ۲۔ نخ = عرض   ۳۔ نخ = ہیں
۴۔ " = ے کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوزِ دل
۵۔ " = ے ضبط سے اسپند جوں مردم اقامت گیر ہے
۶۔ " = ے از نہالِ شمع پیدا غنچۂ ......
+ یہ شعر پہلی بار حاشیہ ق میں اضافہ کیا گیا
٥ یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

گریے[1] سے بندِ محبت میں ہوئی نام آوری — لخت لختِ دل، نگینِ خانۂ زنجیر ہے
ریزشِ[2] خونِ وفا ہے، جرعہ نوشی ہائے یار — یاں گلوے شیشۂ مے، قبضۂ شمشیر ہے
جو بشامِ غم چراغِ خلوتِ دل تھا، اسدؔ
وصل میں وہ سوز، شمعِ مجلسِ تقریر ہے

کرے ہے رہرواں سے خضرِ راہِ عشق جلّادی — ہوا ہے موجۂ ریگِ رواں شمشیرِ فولادی
نظر بندِ تصوّر ہے قفس میں لطفِ آزادی — شکستِ آرزو کے رنگ کی کرتا ہوں صیّادی
کرے ہے حسنِ ویراں کار رُوے سادہ رویاں پر — غُبارِ خط[3] سے تعمیرِ بنائے خانہ بربادی
چنار آسا عدم سے بادلِ پُرآتش آیا ہوں — تہی آغوشیِ دشتِ تمنّا کا ہوں فریادی
اسدؔ، ازبس کہ فوجِ درد و غم سرگرمِ جولاں ہے
غبارِ راہ ویرانی ہے ملکِ دل کی آبادی

یہ سرنوشت میں میری ہے، اشک افشانی — کہ موجِ آب ہے، ہر ایک چینِ پیشانی
جنونِ وحشتِ ہستی یہ عام ہے کہ بہار — رکھے ہے کسوتِ طاؤس میں پَرافشانی

۱۔ نخ = گریہ
۲۔ ″ = ریزشِ خوں ہے سراسر
۳۔ ″ = خطِ

○ ۱۸۱۶ء

لبِ نگار میں آئینہ دیکھ، آبِ حیات — بہ گمرہیِ سکندر ہے محوِ حیرانی
نظر بہ غفلتِ اہلِ جہاں ہوا ظاہر — کہ عیدِ خلق پہ حیراں ہے چشمِ قربانی
کہوں[1] وہ مصرعِ برجستہ وصفِ قامت میں — کہ سرو ہو نہ سکے اُس[2] کا مصرعِ ثانی
اسدؔ نے[3] کثرتِ دل ہائے خلق سے جانا
کہ زلفِ یار ہے مجموعۂ پریشانی

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے — م — صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے
ہے پیچ تابِ رشتۂ شمعِ سحر گہی — خجلت گدازیِ نفسِ نارسا مجھے
واں رنگ ہا بہ پردۂ تدبیر ہیں ہنوز — یاں شعلۂ چراغ ہے، برگِ حنا مجھے
ڈھونڈھے ہے اُس مغنّیِ آتش نفس کو، جی — م — جس کی صدا، ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے
مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال — م — تا بازگشت سے نہ رہے مدّعا مجھے
پرواز ہا، نیازِ تماشائے حسنِ دوست — بالِ کشادہ ہے، نگہِ آشنا مجھے
کرتا ہے، بس کہ باغ میں تو بے حجابیاں — م — آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے
از خود گزشتگی میں خموشی پہ حرف ہے — موجِ غبارِ سرمہ ہوئی ہے صدا مجھے

۱۔ نخ = لکھوں   ۲۔ نخ = جس
۳۔ ″ = یَک   ۴۔ ″ = نہفتہ
○ یہ اشعار پہلی بار متن ق میں درج ہوئے

○ ۱۸۱۶ء

کھلتا کسی[1] پہ کیوں مرے دل کا معاملہ؟ م شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

تا چند[2] پست فطرتیِ طبعِ آرزو؟ یارب ملے بلندیِ دستِ دعا مجھے

یاں آب و دانہ، موسمِ گل میں حرام ہے زنّارِ واگسستہ ہے، موجِ صبا مجھے

یک[3] بار امتحانِ ہوس بھی ضرور ہے اے جوششِ عشق، بادۂ مرد آزما مجھے

*میں نے جنوں سے کی جو، اسدؔ، التماسِ رنگ
خونِ جگر میں ایک ہی غوطہ دیا مجھے

ہر رنگِ سوز، پردۂ یک ساز ہے مجھے بالِ سمندر، آئنۂ ناز ہے مجھے

طاؤسِ خاک، حسنِ نظر باز ہے مجھے ہر ذرّہ، چشمکِ نگہِ ناز ہے مجھے

آغوشِ گل ہے آئنۂ ذرّہ ذرّہ خاک عرضِ بہار، جوہرِ پرواز ہے مجھے

ہے بوئے گل غریبِ تسلّی گہِ وطن ہر جزوِ آشیاں، پرِ پرواز ہے مجھے

ہے جلوۂ خیال، سویدائے مردمک جوں داغ، شعلہ سرخطِ آغاز ہے مجھے

وحشت بہارِ نشّہ و گل ساغرِ شراب چشمِ پری، شفق کدۂ راز ہے مجھے

فکرِ سخن، بہانۂ پروازِ خامشی دودِ چراغ، سرمۂ آواز ہے مجھے

۱۔ نخ = کسو
۲۔ ” = ے تا چند پست حوصلگی ہائے طبعِ خام
اے آرزو بلندیِ دستِ دعا مجھے
۳۔ ” = ے ہے مست امتحانِ ہوس طینتی اسدؔ
* یہ شعر پہلے پہل متنِ ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

ہے خامہ فیضِ بیعتِ بیدلؔ بکف، اسدؔ یک نیستاں قلم روِ اعجاز ہے مجھے

کہوں کیا گرمجوشی مے کشی میں شعلہ رویاں کی کہ شمعِ خانۂ دل، آتشِ مے سے فروزاں کی

+سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر م مری قسمت میں یوں تصویر ہے شب ہائے ہجراں کی

بہ زلفِ مہ وشاں رہتی ہے شب بیدار ظاہر ہے زبانِ شانہ سے تعبیر صد خوابِ پریشاں کی

ہمیشہ مجھ کو طفلی میں بھی مشقِ تیرہ روزی تھی سیاہی، ہے مرے ایّام میں، لوحِ دبستاں کی

دریغ! آہِ سحر گہ کارِ بادِ صبح کرتی ہے کہ ہوتی ہے زیادہ، سرد مہری شمع رویاں کی

*مجھے اپنے جنوں کی، بے تکلف، پردہ داری تھی ولیکن کیا کروں، آوے جو رسوائی گریباں کی

ہنر پیدا کیا ہے میں نے، حیرت آزمائی میں کہ جوہر آئنے[1] کا، ہر پلک ہے چشمِ حیراں کی

*خدایا، کس قدر اہلِ نظر نے خاک چھانی ہے! کہ ہیں صد رخنہ جوں غربال دیواریں گلستاں کی

*ہوا شرمِ تہی دستی سے وہ بھی سرنگوں آخر بس، اے زخمِ جگر، اب دیکھ لی شورش نمکداں کی

بیادِ گرمیِ صحبت، برنگِ شعلہ دہکے ہے
چھپاؤں کیونکے، غالبؔ، سوزشیں داغِ نمایاں کی

جنوں، تہمت کشِ تسکیں نہ ہو، گر شادمانی کی م نمک پاشِ خراشِ دل ہے، لذّت زندگانی کی

۱۔ نخ = آئنہ
+ یہ شعر پہلی بار حاشیہ ق میں بڑھایا گیا
* یہ اشعار پہلی بار متنِ ق میں درج ہوئے ع

○ ۱۸۱۶ء

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی　م　ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو، فرصت روانی کی

نہ کھینچ [۱] اے دستِ سعیِ نارسا، زلفِ تمنّا کو　پریشاں تر ہے موئے خامہ سے تدبیر مانی کی

کہاں ہم بھی رگ و پے رکھتے ہیں، انصاف بہتر ہے　نہ کھینچے طاقتِ خمیازہ، تہمت ناتوانی کی

تکلّف برطرف، فرہاد اور [۲] اتنی سبک دستی　خیال آساں تھا، لیکن خوابِ خسرو نے گرانی کی

پس از مردن بھی، دیوانہ، زیارت گاہِ طفلاں ہے　م　شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی

اسد کو بوریے میں دھر کے پھونکا موجِ ہستی نے
فقیری میں بھی باقی ہے، شرارت نوجوانی کی

نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی　م　مبادا! خندۂ دنداں نما ہو، صبحِ محشر کی

رگِ لیلیٰ کو، خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے　م　اگر بووے بجائے دانہ، دہقاں نوک نشتر کی

+مرا دل مانگتے ہیں عاریت اہلِ ہوس، شاید　یہ جایا چاہتے ہیں آج دعوت میں سمندر کی

پرِ پروانہ، شاید، بادبانِ کشتیِ مے تھا　م　ہوئی مجلس [۳] کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

+کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت!　م　کہ طاقت اڑ گئی اُڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

غرورِ لطفِ ساقی نشۂ بے باکیِ مستاں　نمِ دامانِ عصیاں ہے طراوت موجِ کوثر کی

۱۔ نخ = نہ کھینچے دست
۲۔ ″ = واظہارِ سبک.....
۳۔ ″ = گرمیِ مجلس
+ یہ اشعار پہلی بار حاشیہ ق میں بڑھائے گئے

○ ۱۸۱۶ء

+کہاں تک روؤں اُس کے خیمے کے پیچھے؟ قیامت ہے!　م　مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی؟

تھکا جب قطرۂ بے دست و پا بالا دویدن سے　زبہرِ یادگاری ہا گرہ دیتا ہے گوہر کی

بجز دیوانگی ہوتا نہ انجامِ خود آرائی　اگر پیدا نہ کرتا آئنہ زنجیر جوہر کی

اسد، جز آب بخشیدن ز دریا خضر کو کیا تھا!
ڈبوتا چشمۂ حیواں میں، گر، کشتی سکندر کی

آنکھوں میں انتظار سے جاں پُر شتاب ہے　آتا ہے آ، وگرنہ یہ پا در رکاب ہے

حیراں ہوں، دامنِ مژہ کیوں جھاڑتا نہیں　خطِ صفحۂ عذار پہ گردِ کتاب ہے

جوں نخلِ ماتم، ابر سے مطلب نہیں مجھے　رنگِ سیاہِ نیل، غبارِ سحاب ہے

ممکن نہیں کہ ہو دلِ خوباں میں کارگر　تاثیرِ جُستنِ اشک سے نقش بر آب ہے

ظاہر ہے طرزِ قید سے، صیاد کی غرض　جو دانہ دام میں ہے سوا [۱] اشک کباب ہے

*بے چشمِ دل نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار　یعنی یہ ہر ورق، ورقِ انتخاب ہے

دیکھ اے اسد، بہ دیدۂ باطن کہ ظاہرا
ہر ایک ذرّہ غیرتِ صد آفتاب ہے

۱۔ نخ = سرشک
+ یہ شعر پہلی بار حاشیہ ق میں بڑھایا گیا
* یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

بے خود، زبس کہ خاطرِ بے تاب ہو گئی — مژگانِ باز ماندہ، رگِ خواب ہو گئی

موجِ تبسمِ لبِ آلودۂ مسی — میرے لیے تو تیغِ سیہ تاب ہو گئی

رخسارِ یار کی جو کھلی جلوہ گستری — زلفِ سیاہ بھی شبِ مہتاب ہو گئی

بیدادِ انتظار کی طاقت نہ لا سکی — اے جانِ برلب آمدہ، بے تاب ہو گئی

غالب، زبس کہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
آنسو کی بوند گوہرِ نایاب ہو گئی

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے — م — کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

ہوا ہے مانعِ عاشق نوازی، نازِ خود بینی — تکلف برطرف، آئینۂ تمییز حائل ہے

بہ سیلِ اشک، لختِ دل ہے دامن گیر مژگاں کا — غریقِ بحر، جویائے خس و خاشاکِ ساحل ہے

نکلتی ہے تپش میں بسملوں کی، برق کی شوخی — غرض اب تک خیالِ گرمیِ رفتارِ قاتل ہے

بہا ہے یاں تک اشکوں میں غبارِ کلفتِ خاطر — کہ چشمِ تر میں ہر یک پارۂ دل پائے در گل ہے

۱۔ نخ = واکشادہ ۲۔ نخ = تبسم از لب ۳۔ نخ = آئینہ دارِ تیغ
۴۔ // = ے رخسارِ صاف نے جو دیے جلوہ ہائے نور
زلفِ پری وشاں شبِ مہتاب ہو گئی
۵۔ // = یک لمحہ ۶۔ نخ = اشکِ چشم میں ۷۔ نخ = ہا
۸۔ // = زبس دل میں ۹۔ نخ = انداز

○ ۱۸۱۶ء

+ رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخمِ سوزن کی — م — سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے، غالب — م — چٹکنا غنچۂ گل کا، صدائے خندۂ دل ہے

جنوں رسوائیِ وارستگی؟ زنجیر بہتر ہے — بقدرِ مصلحت دل بستگی، تدبیر بہتر ہے

خوشا! خود بینی و تدبیرِ غفلت نقد اندیشہ — بدین عجز اگر بدنامیِ تقدیر بہتر ہے

○ کمالِ حسن اگر موقوفِ اندازِ تغافل ہو — تکلف برطرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

دلِ آگاہ تسکیں خیزِ بیدردی نہ ہو یارب! — نفس آئینہ دارِ آہِ بے تاثیر بہتر ہے

خدایا چشم تا دل، درد ہے افسونِ آگاہی! — نگہ حیرت سوادِ خوابِ بے تعبیر بہتر ہے

درونِ جوہرِ آئینہ، جوں برگِ حنا خوں ہے — بتاں نقشِ خود آرائی، حیا تحریر بہتر ہے

تمنا ہے، اسد، قتلِ رقیب اور شکر کا سجدہ
دعائے دل، بہ محرابِ خمِ شمشیر بہتر ہے

مژہ پہلوئے چشم، اے جلوۂ ادراک باقی ہے — ہوا وہ شعلہ داغ، اور شوخیِ خاشاک باقی ہے

چمن میں کچھ نہ چھوڑا تو نے غیر از بیضۂ قمری — عدم میں، بہرِ فرقِ مرو، مشتِ خاک باقی ہے

۱۔ نخ = دل تنگی
۲۔ // = تعبیر + یہ شعر پہلی بار حاشیۂ ق میں بڑھایا گیا
○ یہ شعر پہلی بار متنِ ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

گدازِ سعیِ بینش، شستِ و شوئے نقشِ خود کامی　　سراپا شبنم آئیں، یک نگاہِ پاک باقی ہے

ہوا ترکِ لباسِ زعفرانی دلکشا لیکن　　ہنوز آفت نسب یک خندہ یعنی چاک باقی ہے

چمن زارِ تمنا ہو گئی صرفِ خزاں[1]، لیکن　　بہارِ نیم رنگِ آہِ حسرت ناک باقی ہے

نہ حیرت چشمِ ساقی کی، نہ صحبت دورِ ساغر کی
مری محفل میں، غالبؔ، گردشِ افلاک باقی ہے

خموشیوں میں "تماشا ادا" نکلتی ہے　م　نگاہ، دل سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے

بہ حلقۂ خمِ گیسو ہے راستی آموز　　دہانِ یار سے گویا صبا نکلتی ہے

بہ رنگِ شیشہ ہوں یک گوشۂ دلِ خالی　　کبھی پری مری خلوت میں آ نکلتی ہے

فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی[2] ہے شبنم　م　صبا جو غنچے کے پردے میں[3] جا نکلتی ہے

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ　م　کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

بہار شوخ و چمن تنگ و رنگِ گل دلچسپ　　نسیم باغ سے پا درحنا نکلتی ہے

اسدؔ کو حسرتِ عرضِ نیاز تھی دمِ قتل
ہنوز، یک سخنِ بے صدا نکلتی ہے

۱۔ نخ　=　ورِ خزاں پیچیدہ ہے لیکن
۲۔ 〃　=　آتی
۳۔ 〃　=　غنچہ کی خلوت میں

○ ۱۸۱۶ء

زبس کہ مشقِ تماشا، جنوں علامت ہے　م　کشاد و بستِ مژہ، سیلیِ ندامت ہے

نہ جانوں کیونکے مٹے داغِ طعنِ بد عہدی　م　تجھے کہ آئنہ بھی ورطۂ ملامت ہے

بہ پیچ[1] و تابِ ہوس، سلکِ عافیت مت توڑ　م　نگاہِ عجز[2]، سرِ رشتۂ سلامت ہے

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد　م　جنونِ ساختہ و فصلِ گل، قیامت ہے

اسدؔ، بہارِ تماشائے گلستانِ حیات
وصالِ لالہ عذارانِ سرو قامت ہے

تر جبیں رکھتی ہے، شرمِ قطرہ سامانی مجھے　　موجِ گردابِ حیا ہے، چینِ پیشانی مجھے

شبنم آسا کو مجالِ سبحہ گردانی مجھے؟　　ہے، شعاعِ مہر، زنّارِ سلیمانی مجھے

بلبلِ تصویر ہوں بے تابِ اظہارِ تپش　　جنبشِ نالِ قلم، جوشِ پرافشانی مجھے

ضبطِ[3] سوزِ دل ہے وجہِ حیرتِ اظہارِ حال　　داغ ہے مُہرِ دہن، جوں چشمِ قربانی مجھے

شوخ، ہے مثلِ حباب از خویش[4] بیروں آمدن　　ہے گریباں گیرِ فرصت، ذوقِ عریانی مجھے

وا کیا ہرگز نہ میرا[5] عقدۂ تارِ نفس　　ناخنِ بُرّیدہ ہے تیغِ صفاہانی مجھے

ہوں، ہیولائے دو عالم، صورتِ تقریر، اسدؔ
فکر نے سونپی خموشی کی گریبانی مجھے

۱۔ نخ　=　پیچتاب　　۲۔ نخ　=　خفتہ　　۳۔ نخ　=　حسرتے اے ضبط سوزش حیرت
۴۔ 〃　=　پوست　　۵۔ 〃　=　ظالم

○ ۱۸۱۶ء

ہم زباں آیا نظر فکرِ سخن میں تُو مجھے　　مردمک ہے طوطیِ آئینۂ زانو مجھے

باعثِ واماندگی ہے عمرِ فرصت جُو مجھے　　کر دیا ہے پا بہ زنجیرِ رمِ آہو مجھے

پا بہ دامن ہو رہا ہوں بس کہ میں صحرا نورد[1]　م　خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے

خاکِ فرصت بر سرِ ذوقِ فنا! اے انتظار　　ہے غبارِ شیشۂ ساعت، رمِ آہو مجھے

یادِ مژگاں میں بہ نشتر زارِ سودائے خیال　　چاہیئے وقتِ تپش یک دست صد پہلو مجھے

دیکھنا حالت مرے دل کی، ہم آغوشی کے وقت*　م　ہے نگاہِ آشنا، تیرا سرِ ہر مو مجھے

کثرتِ جور و ستم سے، ہو گیا ہوں بے دماغ　　خوب رویوں نے بنایا[2] عاقبت بد خو مجھے

ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ*　م　ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

اضطرابِ عمرِ بے مطلب نہیں آخر، کہ ہے　　جستجوئے فرصتِ ربطِ سر[3] زانو مجھے

چاہیے درمانِ ریشِ دل بھی تیغِ ناز[4] سے　　مرہمِ زنگار ہے وہ وسمۂ ابرو مجھے

فرصتِ آرامِ غشِ ہستی ہے بحرانِ عدم　　ہے شکستِ رنگِ امکاں گردشِ پہلو مجھے

سازِ[5] ایمائے فنا ہے عالمِ[6] پیری، اسدؔ
قامتِ خم سے ہے حاصل شوخیِ ابرو مجھے

۱۔ نخ = صحرائے　　۲۔ نخ = اسدؔ! آخر کیا
۳۔ ″ = سر و زانو　　۴۔ ″ = یار
۵۔ ″ = محوِ　　۶۔ ″ = فرصتِ
* یہ اشعار پہلی بار متن ق میں درج ہوئے

○ ۱۸۱۶ء

یاد ہے شادی میں بھی[1]، ہنگامۂ "یا رب" مجھے　م　سُبحۂ زاہد ہوا ہے، خندہ زیرِ لب مجھے

ہے کشادِ خاطرِ وابستہ، در رہنِ سخن　م　تھا طلسمِ قفلِ ابجد، خانۂ مکتب مجھے

یا رب* اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے؟　م　رشک، آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

صبح ناپیدا ہے کلفت خانۂ ادبار میں　　توڑنا ہوتا ہے رنگِ یک نفس، ہر شب مجھے

شوخیِ طالع سے ہوں ذوقِ معاصی میں اسیر　　نامۂ اعمال ہے، تاریکیِ کوکب مجھے

درد ناپیدا و بے جا تہمتِ وارستگی　　پردہ دارِ یاوگی ہے، وسعتِ مشرب مجھے

طبع ہے مشتاقِ لذّت ہائے حسرت کیا کروں![2]　م　آرزو سے ہے شکستِ آرزو، مطلب مجھے

دل لگا کر آپ بھی غالبؔ، مجھی سے ہو گئے*　م　عشق سے آتے تھے مانع، میرزا صاحب مجھے

کاوشِ دزدِ حنا پوشیدہ افسوں ہے مجھے　　ناخنِ انگشتِ خوباں، لعلِ وارون ہے مجھے

ریشۂ شہرت دوانیدن ہے، رفتن زیرِ خاک　　خنجرِ جلّاد، برگِ بیدِ مجنوں ہے مجھے

ساقیا!* دے ایک ہی ساغر میں سب کو دے، کہ آج　　آرزوئے بوسۂ لب ہائے مے گوں ہے مجھے

ہو گئے باہم دگر، جوشِ پریشانی سے، جمع　　گردشِ جامِ تمنّا، دورِ گردوں ہے مجھے

دیکھ لی[3] جوشِ جوانی کی ترقی بھی کہ اب　　بدر[4] کے مانند، کاہش روز افزوں ہے مجھے

غنچگی ہے، ہر نفس پیچیدنِ فکر، اے اسدؔ　　وا شگفتن ہائے دل در رہنِ مضموں ہے مجھے

۱۔ نخ = عقدِ نالہ　　۲۔ نخ = اے اسدؔ
۳۔ ″ = ہے حسرت اے آغاز و انجام سیہ شامِ شباب　　۴۔ نخ = ماہ
* یہ اشعار پہلی بار متن ق میں درج ہوئے

○ ۱۸۱۶ء

دیکھ تری خوئے گرم، دل بہ تپش[1] رام ہے — طائرِ سیماب کو، شعلہ، رگِ دام ہے

شوخیِ چشمِ حبیب، فتنۂ ایّام ہے — قسمتِ بختِ[2] رقیب، گردشِ صد جام ہے

جلوۂ بینش پناہ، بخشے ہے ذوقِ نگاہ — کعبۂ پوشش سیاہ مردمک احرام ہے

گو نفس وجہ غبار؟ جرأت عجز آشکار — در تپش آبادِ شوق، سرمہ، صدا نام ہے

غفلتِ افسردگی، تہمتِ تمکیں نہ ہو — اے ہمہ خوابِ گراں، حوصلہ بدنام ہے

بزمِ وداعِ نظر، یاس طرب نامہ بر — فرصتِ رقصِ شرر، بوسہ بہ پیغام ہے

گریۂ طوفاں رکاب، نالۂ محشر عناں
بے سر و ساماں اسدؔ، فتنہ سرانجام ہے

بس کہ سودائے خیالِ زلف، وحشت ناک ہے — تا دلِ شب، آبنوسی شانہ آسا، چاک ہے

یاں، فلاخن باز، کس کا نالۂ بے باک ہے؟ — جادہ، تا کہسار، موئے چینیِ افلاک ہے

ہے دو عالم صیدِ[3] اندازِ شۂ دُلدُل سوار — یاں، خطِ پرکارِ ہستی، حلقۂ فتراک ہے

خلوتِ بال و پرِ قمری میں واکر راہِ شوق — جادۂ گلشن، بہ رنگِ ریشہ، زیرِ خاک ہے

عیش گرمِ اضطرابِ اہلِ غفلت سرد مہر — دورِ ساغر، یک گلستاں برگِ بے تاک ہے

۱۔ نخ = طپش
۲۔ ″ = کسوت
۳۔ ″ = نازِ یک صیدِ شر

○ ۱۸۱۶ء

عرضِ وحشت پہ ہے، نازِ ناتوانی ہائے دل — شعلۂ بے پردہ، چینِ دامنِ خاشاک ہے

ہے کمندِ موجِ گل، فتراکِ[1] بے تابی، اسدؔ
رنگ یاں بو سے، سوارِ توسنِ چالاک ہے

چشمِ[2] خوباں، خامشی میں بھی نوا پرداز ہے م — سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

پیکرِ عشّاق، سازِ طالعِ ناساز ہے م — نالہ گویا، گردشِ سیّارہ کی آواز ہے

ہے، صریرِ خامہ، ریزش ہائے استقبالِ ناز — نامہ خود پیغام کو بال و پرِ پرواز ہے

سرنوشتِ اضطراب انجامیِ الفت نہ پوچھ — نالِ[3] خامہ، خارِ خارِ خاطرِ آغاز ہے

شرم ہے طرزِ[4] تلاشِ انتخابِ یک نگاہ — اضطرابِ چشمِ بر پا دوختہ غمّاز ہے

نغمہ[5] ہے کانوں میں اُس کے، نالۂ مرغِ اسیر — رشتۂ پا، یاں نوا سامانِ بندِ ساز ہے

دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا م — یک بیاباں جلوۂ گل، فرشِ پا انداز ہے

نقشِ سطرِ[6] صد تبسّم ہے برآبِ زیرِ گاہ — حُسن کا خطِ پر نہاں خندیدنی انداز ہے

۱۔ نخ = آشفتہ فتراکی، اسدؔ
۲۔ ″ = ے چشمِ خوباں، مے فروشِ نشہ زارِ ناز ہے
سرمہ گویا دودِ موجِ شعلۂ آواز ہے
۳۔ ″ = ے نالِ خامہ، خار در پیراہنِ آغاز ہے
۴۔ ″ = وضعِ تامّل
۵۔ ″ = ے نالۂ دل نغمہ ریزاں ہے بہ مضرابِ خیال
۶۔ ″ = صد سطرِ تبسّم (شاید سہوِ کتابت)
٥ یہ اشعار پہلی بار متن قا میں درج ہوئے

○ ۱۸۱۶ء

شوخیِ اظہار غیر از وحشتِ مجنوں نہیں [1] — لیلیِ معنی، اسدؔ، محمل نشینِ راز ہے

بس کہ حیرت سے زِ پا افتادۂ زنہار ہے — ناخنِ انگشت، تبخالِ لبِ بیمار ہے

+جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں؟ م — ہم نہیں جلتے، نفس ہر چند آتش بار ہے

زُلف سے شب درمیاں دادن نہیں ممکن [2] دریغ! — ورنہ، صد محشر بہ رہنِ [3] جلوۂ رخسار ہے

+ہے وہی بدمستیِ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ م — جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

بس کہ ویرانی سے کفر و دیں ہوے زیر و زبر — گردِ صحرائے حرم [4] تا کوچۂ زُنّار ہے

اے سرِ شوریدہ، ذوقِ [5] عشق و پاسِ آبرو! — جوشِ [6] سودا کب حریفِ منّتِ دستار ہے

+مجھ سے مت کہ "تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی" م — زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

°آنکھ کی تصویر سر نامے پہ کھینچی ہے کہ تا م — تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

وصل میں دل انتظارِ طرفہ رکھتا ہے مگر [7] — فتنہ تاراجِ تمنا کے لیے درکار ہے

*ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا، سو بھی مٹ گیا م — ظاہرا، کاغذ ترے خط کا، غلط بردار ہے

۱۔ نخ = ہے شوخیِ اظہار کو، جُز وحشتِ مجنوں اسدؔ
بس کہ لیلائے سخن محمل نشینِ راز ہے

۲۔ ″ = قدرت ۳۔ نخ = ہے ورنہ محشر ہا بہ رہنِ صافیِ رخسار ہے

۴۔ ″ = در ۵۔ ″ = ساماں

۶۔ ″ = ہے یک طرف سودا و یک سو منّتِ دستار ہے

۷۔ ″ = ہے سیر تاراجِ تمنا، فتنہ درکار ہے

° یہ شعر پہلی بار متنِ ق میں درج ہوا

* یہ شعر پہلی مرتبہ متنِ ق میں درج ہوا

+ یہ اشعار پہلی بار حاشیہ ق میں بڑھائے گئے

○ ۱۸۱۶ء

ᄃآگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا م — ہر کوئی، درماندگی میں، نالے سے ناچار ہے

در خیال آبادِ سودائے سرِ مژگانِ دوست — صد رگِ جاں جادہ آسا، وقفِ نشتر زار [1] ہے

خانماں ہا، پائمالِ شوخیِ دعویٰ، اسدؔ
سایۂ دیوار، سیلابِ در و دیوار ہے

کوہ کے ہوں بارِ خاطر، گر صدا ہو جائیے م — بے تکلف، اے شرارِ جستہ، کیا ہو جائیے؟

یاد رکھیے ناز ہائے التفاتِ [2] اوّلیں — آشیانِ طائرِ رنگِ حنا ہو جائیے

بیضہ آسا، تنگ بال و پر ہے یہ کُنجِ قفس م — از سرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے

لطفِ عشقِ ہر یک اندازِ دگر دکھلائے گا — بے تکلف یک نگاہِ آشنا ہو جائیے

داد از دستِ جفائے صدمۂ ضربُ المثل! — گر ہمہ افتادگی، جوں نقشِ پا ہو جائیے

از دلِ ہر دردمندے جوشِ بیتابی زدن — اے ہمہ بے مدّعائی، یک دعا ہو جائیے

وسعتِ مشرب، نیازِ کلفتِ وحشت، اسدؔ
یک بیاباں سایۂ بالِ ہما ہو جائیے

کوشش، ہمہ بے تابِ تردّد شکنی ہے — صد جنبشِ دل، یک مژہ برہم زدنی ہے

۱۔ نخ = جادۂ صحرائے نشتر زار

۲۔ ″ = رفتۂ دل بردنی

ᄃ یہ شعر م میں طبع ہوا

○ ۱۸۱۶ء

گو حوصلہ پا مردِ تغافل نہیں، لیکن
خاموشیِ عاشق، گِلہ کم سخنی ہے

دی لطفِ ہوا نے بہ جنوں طرفہ نزاکت
تا آبلہ، دعوائے[1] تنک پیرہنی ہے

رامشگرِ اربابِ فنا، نالۂ زنجیر[2]
عیشِ ابد، از خویش بروں تاختنی ہے

ازبس کہ ہے محوِ بہ چمن تکیہ زدن ہا
گل برگ، پرِ بالشِ سروِ چمنی ہے

آئینہ و شانہ، ہمہ دست و ہمہ زانو
اے حسن، مگر حسرتِ پیماں شکنی ہے

فریاد، اسدؔ، بے نگہی ہائے بتاں سے
سچ کہتے ہیں، واللہ، کہ اللہ غنی ہے

کاشانۂ ہستی کہ بر انداختنی ہے
یاں سوختنی، اور[3] وہاں ساختنی ہے

ہے شعلۂ شمشیرِ فنا، حوصلہ پرداز[4]
اے داغِ تمنا، سپر انداختنی ہے

جز خاک بسر کردنِ بے فائدہ حاصل؟
ہر چند بہ میدانِ ہوس تاختنی ہے

اے بے ثمراں! حاصلِ تکلیف دمیدن
گردن، بہ تماشائے گل، افراختنی ہے

ہے سادگیِ ذہن، تمنائے تماشا
جائے کہ، اسدؔ، رنگِ چمن باختنی ہے

۱۔ نخ = پرداز
۲۔ نخ = اسپند
۳۔ ״ = چارہ گر
۴۔ ״ = افگار

○ ۱۸۱۶ء

حکمِ بے تابی نہیں، اور آرمیدن منع ہے
باوجودِ مشقِ وحشت ہا، رمیدن منع ہے

شرم، آئینہ تراشِ جبہۂ طوفان ہا[1] ہے
آب گردیدن روا، لیکن چکیدن منع ہے

بیخودی، فرماں روائے حیرت آبادِ جنوں
زخم دوزی جرم و پیراہن دریدن منع ہے

مژدۂ دیدار سے رسوائیِ اظہار دور
آج کی شب چشمِ کوکب تک پریدن منع ہے

بیمِ طبعِ نازکِ خوباں سے، وقتِ سیرِ باغ
ریشۂ زیرِ زمیں کو بھی دویدن منع ہے

یار معذورِ تغافل ہے، عزیزاں شفقتے!
نالۂ بلبل بگوشِ گل شنیدن منع ہے

مانعِ بادہ کشی نادان ہے، لیکن، اسدؔ
بے ولائے ساقیِ کوثر کشیدن منع ہے

چارسوئے عشق میں صاحب دکانی مفت ہے
نقد ہے داغِ دل، اور آتش زبانی مفت ہے

زخمِ دل پر باندھیے حلوائے مغزِ استخواں
تندرستی فائدہ، اور ناتوانی مفت ہے

نقدِ انجم تا یکے از کیسہ بیروں ریختن؟
یعنی، اے پیرِ فلک، شامِ جوانی مفت ہے

گر نہیں پاتا درونِ خانہ، ہر بے گانہ، جا
بر درِ نکشودۂ دل، پاسبانی مفت ہے

چونکہ بالائے ہوس پر ہر قبا کوتاہ ہے
بر ہوس ہائے جہاں دامن فشانی مفت ہے

*یک نفس، ہر یک نفس، جاتا ہے قسطِ عمر میں
حیف ہے اُن کو جو سمجھیں زندگانی مفت ہے

مال و جاہ و دست و پا بے زر خریدہ ہیں، اسدؔ
پس بہ دل ہائے دگر راحت رسانی مفت ہے

۱۔ نخ = پا
* یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

بے تابیِ یادِ دوست، ہم رنگِ تسلّی ہے — غافل، تپش[1] مجنوں، محمل کشِ لیلیٰ ہے
کلفت کشیِ ہستی، بدنامِ دو رنگی ہے — یاں تیرگیِ اختر، خالِ رخِ زنگی ہے
دیدن ہمہ بالیدن، کردن ہمہ افسردن — خوشتر زگل و غنچہ، چشم و دلِ ساقی ہے
وہمِ طربِ[2] ہستی، ایجادِ سیہ مستی — تسکیں دہِ صد محفل، یک ساغرِ خالی ہے
زندانِ تحمّل میں مہمانِ تغافل ہیں — بے فائدہ یاروں کو فرقِ غم و شادی ہے
ہووے نہ غبارِ دل تسلیم زمیں گیراں — مغرور نہ ہو، ناداں، سرتاسرِ گیتی ہے

رکھ[3] فکرِ سخن میں تو معذور مجھے غالب
یاں زورقِ خودداری، طوفانیِ معنی ہے

گلشن کو تری صحبت، ازبس کہ خوش آئی ہے م — ہر[4] غنچے کا گل ہونا، آغوش کشائی ہے
* واں کنگرِ استغنا، ہر دم ہے بلندی پر م — یاں نالے کو اور الٹا دعوائے رسائی ہے
آئینہ نفس سے بھی[5] ہوتا ہے کدورت کش — عاشق کو غبارِ دل، اک وجہِ صفائی ہے

۱۔ نخ = ایّام
۲۔ ″ = تپشِ
۳۔ ″ = ہے ہوں وقتِ سخن گوئی ہر صورت اسدؔ، معذور
۴۔ ″ = غنچوں کے شگفتن میں
۵۔ ″ = ہے آئینہ نفس سے ہو حیرانِ کدورت ہا — یاں جوششِ غبارِ دل، سامانِ صفائی ہے
* یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

ازبس کہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے م — جو داغ[1] نظر آیا، اک چشم نمائی ہے
ہنگامِ تصوّر ہوں دریوزہ گرِ بوسہ — یہ کاسۂ زانو بھی[2] اک جامِ گدائی ہے

وہ دیکھ کے حسن اپنا، مغرور ہوا، غالبؔ!
صد جلوۂ آئینہ، یک صبحِ جدائی ہے

دریوزۂ ساماں ہا، اے بے سروسامانی — ایجادِ گریباں ہا، در پردۂ عریانی
تمثالِ تماشا ہا، اقبالِ تمنّا ہا — عجزِ عرقِ شرمے، اے آئنہ حیرانی
دعوائے جنوں باطل، تسلیم عبث حاصل — پروازِ فنا مشکل، بیں عجزِ تن آسانی
بے گانگیِ خوہا، موجِ رمِ آہو ہا — دامِ گلۂ الفت، زنجیرِ پشیمانی
پروازِ تپش رنگی، گلزارِ ہمہ تنگی — خوں ہو قفسِ دل میں، اے ذوقِ[3] پرافشانی
سنگ آمد و سخت آمد، دردِ سرِ خودداری — معذورِ سبک ساری، مجبورِ گراں جانی

گلزارِ تمنّا ہوں، گلچینِ تماشا ہوں
صد نالہ اسدؔ، بلبل در بندِ زباں دانی

نظر بہ نقصِ گدایاں، کمالِ بے ادبی ہے — کہ خارِ خشک کو بھی دعویِ چمن نسبی ہے

۱۔ نخ = داغوں کا نظر آنا، اک
۲۔ ″ = ہے، یا — ۳۔ نخ = سعیِ

○ ۱۸۱۶ء

ہُوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ
لبِ قدح پہ کفِ بادہ، جوشِ تشنہ لبی ہے

خوشا[1]! وہ دل کہ سراپا طلسمِ بے خبری ہو
جنونِ[2] یاس والم، رزقِ مُدّعا طلبی ہے

*تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مِرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

چمن میں کس کی، یہ برہم ہوئی ہے بزمِ تماشا؟
کہ[3] برگ برگِ سمن، شیشہ ریزۂ حلبی ہے

*دلا! یہ درد والم بھی تو مُغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے، نہ آہِ نیم شبی ہے

امامِ[4] ظاہر و باطن، امیرِ صورت و معنی
علی، ولی، اسد اللہ، جانشینِ نبی ہے

دلا، عبث[5] ہے تمنائے خاطر افروزی
کہ بوسۂ لبِ شیریں[6] ہے اور گلو سوزی

طلسمِ آئنۂ زانوئے فکر ہے[7]، غافل
ہنوز حسن کو ہے، سعیِ جلوہ اندوزی

ہوئی ہے سوزشِ دل، بس کہ داغِ بے اثری
اُگی ہے دودِ جگر سے شبِ سیہ روزی

بہ پرفشانیِ پروانہ، چراغِ مزار!
کہ بعدِ مرگ بھی ہے لذّتِ جگر سوزی

تپش تو کیا، نہ ہوئی مشقِ پرفشانی[8] بھی
رہا میں ضعف سے شرمندۂ نو آموزی

۱۔ نخ = ے خوشا خیالِ کسانے کہ محوِ بے خبری ہیں
۲۔ ″ = حصول ۳۔ نخ = کہ برگ لالہ و گل
۴۔ ″ = ے اسد کو کیوں نہ ہو امیدِ لطفِ بندہ نوازی
۵۔ ″ = غلط ۶۔ نخ = ے گوں
۷۔ ″ = خود بینی ۸۔ ″ = یک پرافشاندن
* یہ اشعار پہلی مرتبہ متن ق میں درج ہوئے

○..... ۱۸۱۶ء

اسد، ہمیشہ پئے کفشِ پائے سیم تناں
شعاعِ مہر سے کرتا ہے چرخ زردوزی

خبر نگہ کو نگہ چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

نفس بہ نالہ رقیب و نگہ بہ اشک عدو
زیادہ اس سے گرفتار ہوں کہ تو جانے

بہ[1] کسوتِ عرقِ شرم قطرہ زن ہے خیال
مباد، حوصلہ معذورِ جستجو جانے

جنوں فسردۂ تمکیں ہے، کاش! عہدِ وفا
گدازِ حوصلہ کو پاسِ آبرو جانے

+نہ ہووے کیونکہ اُسے فرضِ قتلِ اہلِ وفا
لہو میں ہاتھ کے بھرنے کو جو وضو جانے

زباں سے عرضِ تمنائے خامشی معلوم
مگر وہ خانہ برانداز گفتگو جانے

مسیحِ کشتۂ الفت ببر علی خاں ہے
کہ جو، اسد، تپشِ نبضِ آرزو جانے

اگر گل حسن و الفت کی بہم جوشیدنی جانے
پرِ بلبل کے افسردن کو دامن چیدنی جانے

فسونِ حسن سے ہے، شوخیِ گلگونہ آرائی
بہار اُس کی کفِ مشاطہ میں بالیدنی جانے

نوائے بلبل و گل، پاسبانِ بے دماغی ہے[2]
بہ یک مژگانِ خوباں صد چمن خوابیدنی جانے

۱۔ نخ = ے تپش ہے شرم بقدرِ چکیدنِ عرقے
۲۔ ″ = ہا
+ یہ شعر پہلی بار حاشیہ ق میں بڑھایا گیا

○ ۱۸۱۶ء

نہ ہے! شبِ زندہ دارِ انتظارستاں کہ وحشت سے
مژہ پیچک میں مرکی سوزنِ آسا[1]، چیدنی جانے

خوشا! مستی[2]، کہ جوشِ حیرتِ اندازِ قاتل سے
نگہ، شمشیر میں جوں جوہر، آرامیدنی جانے

جفا شوخ و ہوس گستاخ مطلب ہے، مگر عاشق
نفس، در قالبِ خشتِ لحد دزدیدنی جانے

نوائے طائرانِ آشیاں گم کردہ آتی ہے
تماشا ہے کہ رنگِ رفتہ برگردیدنی جانے

اسدؔ، جاں نذرِ الطافے کہ ہنگامِ ہم آغوشی
زبانِ ہر سرِ مو، حالِ دل پرسیدنی جانے

گلستاں، بے تکلف[3] پیش پا افتادہ مضموں ہے
جو تو[4] باندھے کفِ پا پر حنا، آئینہ موزوں ہے

بہارِ گل دماغِ نشۂ ایجادِ مجنوں ہے
ہجومِ برق سے، چرخ و زمیں یک قطرۂ خوں ہے

ہجومِ[5] گریہ سوئے دل، خوشا! سرمایۂ طوفاں
پر انگشتِ حسابِ اشک، ناخن، نعل در آتش ہے

عدم وحشت سراغ و ہستی آئیں بندِ رنگینی
دماغِ دو جہاں پر سنبل و گل، یک شبے خوں ہے

تماشا ہے علاجِ بے دماغی ہائے دل، غافل
سُوَیدا مردمِ چشمِ پری، نظارہ افسوں ہے

فنا، کرتی ہے زائل سرنوشتِ کلفتِ[6] ہستی
سحر، از بہرِ شستِ و شوئے داغِ ماہ، صابوں ہے

اسدؔ، ہے آج مژگانِ تماشا کی حنا بندی
چراغانِ نگاہ و شوخیِ اشکِ جگر گوں ہے

۱۔ نخ = درپیچکِ مہ، سوزنِ آسا ۔ ۔ ۔ ۔
۲۔ " = شوقِ
۳۔ نخ = یک تماشا
۴۔ " = اگر
۵۔ " = رجوعِ
۶۔ " = کلفتِ اظہاری

○ ۱۸۱۶ء

صبح سے معلوم، آثارِ ظہورِ شام، ہے
غافلاں! آغازِ کار، آئینۂ انجام ہے

بس کہ[1] ہے صیّاد راہِ عشق میں محوِ کمیں
جادۂ رہ سر بسر، مژگانِ چشمِ دام ہے

بس کہ تیرے جلوۂ دیدار کا ہے اشتیاق
ہر بُتِ خُرشید[2] طلعت، آفتابِ بام ہے

مستعدِ قتلِ یک عالم ہے، جلّادِ فلک
کہکشاں، موجِ شفق میں تیغِ خوں آشام ہے

کیا کمالِ عشق نقص آبادِ گیتی میں ملے
پختگی ہائے تصوّر، یاں خیالِ خام ہے

ہو جہاں، وہ ساقیِ خُرشید[3] رو، مجلس فروز
واں، اسدؔ، تارِ شعاعِ مہر خطِّ جام ہے

دیکھتا ہوں وحشتِ شوقِ خروش آمادہ سے
فالِ رسوائی، سرشکِ سر بصحرا دادہ سے

دام گر سبزے میں پنہاں کیجئے طاؤس ہو
جوشِ نیرنگِ بہار عرضِ صحرا دادہ سے

آمدِ[4] سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے
م نقشِ پا، جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

بزمِ مے، وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا؟
م شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

خیمۂ لیلیٰ سیاہ و خانۂ مجنوں خراب
جوشِ ویرانی ہے عشقِ داغِ بیروں دادہ سے

بزمِ ہستی وہ تماشا ہے کہ جس[5] کو ہم، اسدؔ
دیکھتے ہیں چشم از خوابِ عدم نکشادہ سے

۱۔ نخ = بس کہ صیّاداں براہِ عشق ہیں صرفِ کمیں
۲۔ " = خورشید
۳۔ " = خورشید
۴۔ نخ = پا تراب سیلِ طوفانِ
۵۔ نخ = غالبؔ ہم جسے

○ ۱۸۱۶ء

اے خیالِ وصل، نادر ہے مئے آشامی تری
پختگی ہائے کبابِ دل ہوئی خامی تری

رَچ[1] گیا جوشِ صفا سے زلف کا اعضا میں عکس
ہے نزاکت جلوہ، اے ظالم، سیہ خامی تری

برگ ریزی ہائے گُل، ہے وضعِ زر افشاندنی
باج لیتی ہے گلستاں سے گل اندامی تری

بس کہ ہے عبرت ادیبِ یادگی ہائے ہوس
میرے کام آئی، دلِ مایوس ناکامی تری

ہم نشینیِ رقیباں، گرچہ ہے سامانِ رشک
لیکن اس سے ناگوارا تر ہے بدنامی تری

تجھ کو، اے غفلت نسب، پروائے مشتاقاں کہاں!
یاں نگہ آلودہ ہے دستارِ بادامی تری

سر بزانوے کرم رکھتی ہے شرمِ ناکسی
اے اسدؔ، بیجا نہیں ہے غفلت آرامی تری

چشمِ گریاں، بسملِ شوقِ بہارِ دید ہے
اشک ریزی عرضِ بالِ افشانیِ اُمید ہے

دامنِ گردوں میں رہ جاتا ہے ہنگامِ وداع
گوہرِ شب تاب، اشکِ دیدۂ خورشید[2] ہے

رتبۂ تسلیمِ خُلّت مشرباں، عالی[3] سمجھ
چشمِ قربانی، گلِ شاخِ ہلالِ عید ہے

کچھ نہیں حاصل تعلق میں بغیر از کشمکش[4]
اے خوشا! رندے کہ مرغِ گلشنِ تجرید ہے

کثرتِ اندوہ سے حیران و مضطر ہے اسدؔ
یا علی، وقتِ عنایات و دمِ تائید ہے

۱۔ نخ = چھا گیا فرطِ صفا
۲۔ نخ = خورشید
۳۔ ؍؍ = فردوس زیب
۴۔ ؍؍ = سوز و ساز

○ ۱۸۱۶ء

دلؔ[1] سراپا وقفِ سودائے نگاہِ تیز ہے
یہ زمیں مثلِ نیستاں، سخت ناوک خیز ہے

ہوسکے[2] کیا خاک دستِ و بازوئے فرہاد سے؟
بیستوں، خوابِ گرانِ خسروِ پرویز ہے

ان ستم کیشوں کے کھائے ہیں زبس تیرِ نگاہ
پردۂ بادام، یک غربالِ حسرت بیز ہے

خوں چکاں ہے جادہ، مانندِ رگِ سودائیاں
سبزۂ صحرائے الفت، نشترِ خوں ریز ہے

ہے بہارِ تیز رَو، گلگونِ نکہت پر سوار
یک شکستِ رنگِ گل، صد جنبشِ مہمیز ہے

کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل، کیوں نہ ہو؟ م
یعنی اِس بیمار کو نظّارے سے پرہیز ہے

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی م
وائے ناکامی! کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے

عارضِ گل دیکھ، روئے یار یاد آیا، اسدؔ م
جوششِ فصلِ بہاری، اشتیاق انگیز ہے

نظر پرستی و بے کاریِ خود آرائی
رقیبِ آئنہ ہے، حیرتِ تماشائی

زخود گزشتنِ دل، کاروانِ حیرت ہے
نگہ، غبارِ ادب گاہِ جلوہ فرمائی

نہیں ہے حوصلہ، پامردِ کثرتِ تکلیف
جنونِ ساختہ، حرزِ فسونِ دانائی

بچشم ور شدہ مژگاں، ہے جوہرِ[3] رگِ خواب
نہ پوچھ نازکیِ وحشتِ شکیبائی

خرابِ نالۂ بلبل، شہیدِ خندۂ گل
ہنوز دعویِ تمکین و بیمِ رسوائی

شکستِ سازِ خیال، آں سوئے گریوۂ[4] غم
ہنوز نالہ پَر افشانِ ذوقِ رعنائی

۱۔ نخ = ہے وہ مژہ برآہ رو بابیدن از دل تیز ہے
۲۔ نخ = ہے تیشۂ فولاد و دستِ بازوئے فرہاد کیا
۳۔ نخ = شوخی
۴۔ نخ = دل اُفتادن
م یہ اشعار پہلی بار متن میں درج ہوئے

○ ۱۸۱۶ء

ہزار قافلۂ آرزو، بیاباں مرگ   ہنوز محملِ حسرت بدوشِ خود رائی

وداعِ حوصلہ، توفیقِ شکوہ، عجزِ وفا
اسدؔ ہنوز، گمانِ غرورِ دانائی!

گدائے طاقتِ تقریر ہے، زباں، تجھ سے   کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے
فسردگی میں ہے فریادِ بے دلاں تجھ سے   چراغِ صبح و گلِ موسمِ خزاں تجھ سے
بہارِ حیرتِ نظارہ، سخت جانی ہے   حنائے پائے اجل، خونِ کشتگاں، تجھ سے
پری بہ شیشہ و عکسِ رخ اندر آئینہ   نگاہِ حیرتِ مشاطہ، خوں فشاں تجھ سے
طراوتِ سحر ایجادیِ اثر یک سو   بہارِ نالہ و رنگینیِ فغاں تجھ سے
چمن چمن گلِ آئینہ در کنارِ ہوس   امید، محوِ تماشائے گلستاں تجھ سے
نیاز، پردۂ اظہارِ خود پرستی ہے   جبینِ سجدہ فشاں تجھ سے، آستاں تجھ سے
بہانہ جوئیِ رحمت، کمیں گرِ تقریب   وفائے حوصلہ و رنجِ امتحاں تجھ سے

اسدؔ[1] طلسمِ قفس میں رہے، قیامت ہے!
خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے

شکلِ طاؤس، گرفتار بنایا ہے مجھے   ہوں وہ گلدام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے

۱۔ نخ = ے اسدؔ بموسمِ گلؒ در طلسمِ کنجِ قفس

○ ۱۸۱۶ء

پرِ طاؤس، تماشا نظر آیا ہے مجھے   ایک دل تھا کہ بصد رنگ دکھایا[1] ہے مجھے
عکسِ خط، تا سخنِ ناصحِ دانا سرسبز   آئنہ، بیضۂ طوطی نظر آیا ہے مجھے
سنبلستانِ جنوں ہوں، ستم نسبتِ زلف   موکشاں خانۂ زنجیر میں لایا ہے مجھے
گردباد، آئنۂ محشرِ خاکِ مجنوں   یک بیاباں دلِ بیتاب اٹھایا ہے مجھے
حیرتِ کاغذِ آتش زدہ ہے، جلوۂ عمر   تہِ[2] خاکسترِ صد آئنہ پایا ہے مجھے
لالہ و گل بہم آئینۂ اخلاقِ بہار   ہوں میں وہ داغ کہ پھولوں میں بسایا ہے مجھے
دردِ اظہارِ تپش، کسوتِ گل معلوم !   ہوں میں وہ چاک کہ کانٹوں سے سلایا ہے مجھے
بے دماغِ تپش و عرضِ[3] دو عالم فریاد   ہوں میں وہ خاک کہ ماتم میں اڑایا ہے مجھے
جامِ ہر ذرہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے   کس کا دل ہوں؟ کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

جوشِ فریاد سے لوں گا دیتِ خواب، اسدؔ
شوخیِ نغمۂ بیدلؔ نے جگایا ہے مجھے

باغ تجھ بن گلِ نرگس سے ڈراتا ہے مجھے   چاہوں گر سیرِ چمن، آنکھ دکھاتا ہے مجھے
ماہِ نو، ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے   عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے

۱۔ نخ = چشم
۲۔ ″ = ڈھونڈھ
۳۔ ″ = عجز

○ ۱۸۱۶ء

باغ[٥]، پاکرِ خفقانی، یہ ڈراتا ہے مجھے   م   سایۂ شاخِ گل، افعی نظر آتا ہے مجھے
نالہ، سرمایۂ یک عالم و عالم، کفِ خاک   م   آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے
جوہرِ تیغ بسر چشمۂ دیگر معلوم   م   ہوں میں وہ سبزہ کہ زہرابُ اگاتا ہے مجھے
مُدّعا، محوِ تماشائے شکستِ دل ہے   م   آئنہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے
شورِ تمثال ہے کس رشکِ حسن کا، یارب؟   آئنہ، بیضۂ بلبل نظر آتا ہے مجھے
حیرت[1] آئینۂ انجامِ جنوں ہوں جوں شمع   کس قدر داغِ جگر شعلہ اٹھاتا ہے مجھے
میں ہوں اور حیرت[2] جاوید، مگر ذوقِ خیال   بہ فسونِ نگہِ ناز ستاتا ہے مجھے
▭ زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے   م   دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

حیرتِ فکرِ سخن، سازِ سلامت ہے، اسدؔ
دل پسِ زانوے آئینہ بٹھاتا ہے مجھے

قتلِ عُشّاق نہ غفلت کشِ تدبیر آوے   یارب، آئینہ بہ طاقِ خمِ شمشیر آوے
بالِ طاؤس ہے رعنائیِ ضعفِ پرواز   کون ہے داغ کہ شعلے کا عناں گیر آوے
عرضِ حیرانیِ بیمارِ محبّت معلوم   عیسیٰ، آخر بکفِ آئینۂ تصویر آوے

۱۔ نخ = عبرت
۲۔ 〃 = حسرت
٥ یہ شعر پہلی بار متن قا میں درج ہوا
▭ یہ شعر م میں طبع ہوا

○ ۱۸۱۶ء

ذوقِ راحت اگر احرامِ تپش ہو، جوں شمع   پائے خوابیدہ، بہ دلجوئیِ شبگیر آوے
اُس بیاباں میں گرفتارِ جنوں ہوں کہ جہاں   موجۂ ریگ سے دل، پائے بہ زنجیر آوے
وہ گرفتارِ خرابی ہوں کہ فوّارہ[1] نمط   سیل، صیادِ کمیں خانۂ تعمیر آوے

سرِ معنی بہ گریبانِ شقِ خامہ، اسدؔ
چاکِ دل، شانہ کشِ طُرّۂ تحریر آوے

تشنۂ[2] خونِ تماشا جو وہ پانی مانگے   آئنہ، رخصتِ اندازِ روانی مانگے
رنگ[3] نے گل سے دمِ عرضِ پریشانیِ بزم   برگِ گل، ریزۂ مینا کی نشانی مانگے
زلفِ تحریرِ پریشانِ تقاضا ہے، مگر   شانہ ساں، مُو بہ زباں خامۂ مانی مانگے
آمدِ خط ہے، نہ کر خندۂ شیریں کہ مباد!   چشمِ مور، آئنۂ دل نگرانی مانگے
ہوں گرفتارِ کمیں گاہِ تغافل کہ جہاں   خوابِ صیاد سے، پرواز، گرانی مانگے
چشمِ پرواز و نفس خفتہ، مگر ضعفِ امید   شہپرِ کاہ، پئے مژدہ رسانی مانگے
تو وہ بدخو[4] کہ تحیّر کو تماشا جانے   م   غم[5] وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے
وحشتِ شورِ تماشا ہے کہ جوں نکہتِ گل   نمکِ زخمِ جگر بال فشانی مانگے

۱۔ نخ = جوں فوّارہ
۲۔ 〃 = چشمک
۳۔ 〃 = رنگ سے گل نے
۴۔ 〃 = افسوں
۵۔ 〃 = دل

○ ۱۸۱۶ء

نقشِ نازِ بُتِ طنّاز بآغوشِ رقیب ۔۔۔ پائے طاؤس، پئے خامۂ مانی مانگے
وہ تبِ عشق تمنّا ہے کہ پھر صورتِ شمع ۔۔۔ شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے
گر ملے حضرتِ بیدلؔ کا خطِ لوحِ مزار
اسدؔ، آئینۂ پردازِ معانی مانگے

۱۔ نخ = جوں رشتۂ شمع

۶۔ ملاحظہ فرمایئے یہ عبارت ص ۵۹۴ کے حاشیہ ۲ سے متعلق
'غالب اور شاہانِ تیموریہ' (ص ۹۶) میں درج ہے
"یہ قطعۂ تہنیّت' دہلی اردو اخبار کی ۳ دسمبر ۱۸۵۳ء کی اشاعت
میں شامل ہے۔ یہ بادشاہ کے غسلِ صحت کے موقع پر پڑھا گیا"
تاہم یہ پہلی بار کتابی شکل میں نسخۂ رام پور ثانی (قد) مکتوبہ
۱۸۵۵ء میں شامل ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس علالت سے شفایاب
ہونے کے بعد شاہ ظفر کا "شیوت کی طرف .... رجحان
ہوگیا تھا"

L

○ ۱۸۱۶ء

خوابِ جمعیّتِ مخمل ہے پریشاں مجھ سے ۔۔۔ رگِ بستر کو ملی شوخیِ مژگاں مجھ سے
غمِ عشّاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں ۔۔۔ کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے
کنجِ تاریک و کمیں گیریِ اختر شُمری ۔۔۔ عینکِ چشم بنا روزنِ زنداں مجھ سے
اے تسلّی، ہوسِ وعدہ فریب افسوں ہے ۔۔۔ ورنہ کیا ہو نہ سکے نالہ بہ ساماں مجھ سے
بستنِ عہدِ محبّت ہمہ نادانی تھا ۔۔۔ چشمِ نکشودہ رہا عقدۂ پیماں مجھ سے
آتش افروزیِ یک شعلۂ ایما تجھ سے ۔۔۔ چشمک آرائیِ صد شہرِ چراغاں مجھ سے
اے اسدؔ، دسترسِ وصلِ تمنّا معلوم
کاش! ہو قدرتِ برچیدنِ داماں مجھ سے

فرصتِ آئینۂ صد رنگ خود آرائی ہے ۔۔۔ روز و شب یک کفِ افسوسِ تماشائی ہے
وحشتِ زخمِ وفا دیکھ کہ سرتاسرِ دل ۔۔۔ بخیہ جوں جوہرِ تیغ، آفتِ گیرائی ہے
شمع آسا، چہ سرِ دعویٰ؟ وکو پائے ثبات؟ ۔۔۔ گلِ صد شعلہ بیک جیبِ شکیبائی ہے
نالہ خونیں ورق، و داغ گلِ مضمونِ شفق ۔۔۔ چمن آرائے قفس، وحشتِ تنہائی ہے
بوئے گل فتنۂ بیدار و چمن جامۂ خواب ۔۔۔ وصلِ ہر رنگ جنوں کسوتِ رسوائی ہے

۱۔ نخ = آرزو خانہ ۔۔۔ ۲۔ نخ = ہوا
۳۔ " = افشاں ۔۔۔ ۴۔ " = یک
۵۔ " = تپش

○ ۱۸۱۶ء

شرم، طوفانِ خزاں رنگِ طرب گاہِ بہار   بامہتابی[1] بکفِ چشمِ تماشائی ہے
باغِ خاموشیِ دل سے سخنِ عشق، اسد   نفسِ سوختۂ رمزِ چمن ایمائی ہے
اُگ[5] رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ   م   ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے   م   برقِ خرمنِ راحت، خونِ گرمِ دہقاں ہے
ہم[2] سے رنجِ بے تابی کس طرح اٹھایا جائے؟   م   داغ، پشتِ دستِ عجز، شعلہ خس بدنداں ہے
حیرتِ تپیدن[3] ہا، خوں بہائے دیدن ہا   رنگِ گل کے پردے میں آئنہ پرافشاں ہے
عشق کے تغافل سے ہرزہ گرد ہے عالم   روئے[4] شش جہت آفاق، پشتِ چشمِ زنداں ہے
غنچہ تا شگفتن ہا، برگِ عافیت معلوم!   م   باوجودِ دل جمعی، خوابِ گل پریشاں ہے
وحشت انجمن بے گل، دیکھ لالے کا عالم   مثلِ دودِ مجمر کے، داغ بال افشاں ہے
اے کرم نہ ہو غافل، ورنہ[6] ہے اسد بیدل   بے[7] گہر صدف گویا پشتِ چشمِ نیساں ہے

۱۔ نخ = گل مہتاب بکف
۲۔ ″ = یہ مطلعِ اوّل ہے اور یوں ہے ؎
داغ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بدنداں ہے
اے ہوسِ رعونت ہا، بکارِ عشق آساں ہے
۳۔ ″ = طپیدن ہا   ۴۔ نخ = سے گل بجوہ از لالہ، بزم سازِ بے تابی   ۵۔ نخ = ہا
۶۔ ″ = ورنہ عشق ہے بیدل   ۷۔ نخ = از گہر صدف خالی
٭ نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے متن سے غالب نے اس غزل کا مقطع ؎ باغِ خاموشیِ دل
۔۔۔۔۔۔۔ اسد حذف کر کے یہ مقطع شامل کر دیا۔ یہاں دونوں مقطعے دے
دیے گئے ہیں

○ ۱۸۱۶ء

جورِ زُلف کی تقریر، پیچ تابِ خاموشی   ہند میں اسد نالاں، نالہ در صفاہاں ہے

گریۂ سرشاریِ شوق بہ بیاباں زدہ ہے   قطرۂ خونِ جگر چشمکِ طوفاں زدہ ہے
گریہ بے لذتِ کاوش نہ کرے جرأتِ شوق[1]   قطرۂ اشکِ دل بر صفِ مژگاں زدہ ہے
بے تماشا نہیں جمعیتِ چشمِ بسمل   مژہ فالِ دو جہاں خوابِ پریشاں زدہ ہے
فرصتِ آئینہ و پروازِ عدم تا ہستی   یک شرر بالِ دل و دیدہ چراغاں زدہ ہے
نقشِ رنگینیٔ سعیِ قلمِ مانی ہے   بکمرِ دامنِ صد رنگِ گلستاں زدہ ہے
درسِ نیرنگ ہے کس موجِ نگہ[2] کا، یا رب؟   غنچہ، صد آئنہ زانوئے گلستاں زدہ ہے
سازِ وحشت رقمی ہا، کہ با ظہارِ اسد
دشت و رنگِ آئنہ صفحۂ افشاں زدہ ہے

خوابِ غفلت بہ کمیں گاہِ نظر پنہاں ہے   شام سایے میں بہ تاراجِ سحر پنہاں ہے
دو جہاں، گردشِ یک سبحۂ اسرارِ نیاز   نقدِ صد دل بگریبانِ سحر پنہاں ہے
خلوتِ دل میں نہ کر دخل بجز سجدۂ شوق   آستاں میں صفتِ آئنہ در پنہاں ہے
فکرِ پروازِ جنوں ہے، سببِ ضبط نہ پوچھ   اشک، جوں بیضہ، مژہ[3] سے تہِ پر پنہاں ہے

۱۔ نخ = نہ ہو جرأت کشِ شوق   ۲۔ نخ = عرض
۳۔ ″ ″ = زِ مژگاں تہِ پر

○ ۱۸۱۶ء

ہوش اے ہرزہ درا[1] تہمتِ بیدردی چند! نالہ، در گردِ تمنّا سے اثر پنہاں ہے

وہمِ غفلت، مگر، احرامِ فسردن باندھے ورنہ، ہر سنگ کے باطن[2] میں شرر پنہاں ہے

وحشتِ[3] دل ہے، اسدؔ، عالمِ نیرنگِ نشاط

خندۂ گل، بلبِ زخمِ جگر پنہاں ہے

دامانِ دل بہ وہمِ تماشا نہ کھینچیے اے مدّعی، خجالتِ بے جا نہ کھینچیے

گل، سربسر[4]، اشارۂ جیبِ دریدہ ہے نازِ بہار جز بہ تقاضا نہ کھینچیے

حیرت حجابِ جلوہ و وحشت غبارِ چشم[5] پائے نظر بہ دامنِ صحرا نہ کھینچیے

واماندگی بہانہ، و دل بستگی فریب دردِ طلب بہ آبلۂ پا نہ کھینچیے

*کرتے ہوئے تصوّرِ یار آئے ہے حیا کیا فائدہ کہ منّتِ بیگانہ کھینچیے

گر صفحے کو نہ دیجیے پروازِ سادگی جز خطِ عجز، نقشِ تمنّا نہ کھینچیے

دیدارِ دوستانِ لباسی ہے ناگوار صورت بہ کارخانۂ دیبا نہ کھینچیے

ہے بے خمار نشّۂ خونِ جگر، اسدؔ

دستِ ہوس بہ گردنِ مینا نہ کھینچیے

۱۔ نخ = سرا

۲۔ نخ = سینے

۳۔ ″ = ہے دردِ وحشت اسدؔ آئینۂ اظہارِ نشاط

۴۔ ″ = حشمک

۵۔ نخ = راہ

* یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

تا چند نازِ مسجد و بتخانہ کھینچیے جوں شمع، دل بخلوتِ جانانہ کھینچیے

بہزاد، نقشِ یک دلِ صد چاک عرض کر گر زلفِ یار کھینچ نہ سکے، شانہ کھینچیے

راحت کمینِ شوخیِ تقریبِ نالہ ہے پائے نظر بہ دامنِ افسانہ کھینچیے

زلفِ پری، بہ سلسلۂ آرزو رسا یک عمر، دامنِ دلِ دیوانہ کھینچیے

یعنی دماغِ غفلتِ ساقی رسیدہ تر خمیازۂ خمار سے پیمانہ کھینچیے

پروازِ آشیانۂ عنقائے ناز ہے بالِ پری بہ وحشتِ بیجا نہ کھینچیے

*عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیے

ہے ذوقِ گریہ، عزمِ سفر کیجیے، اسدؔ

رختِ جنونِ سیل بہ ویرانہ کھینچیے

*

آئینہ کیوں نہ دوں، کہ تماشا کہیں جسے م ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ہے انتظار سے شررِ آبادِ رستخیز مژگانِ کوہکن رگِ خارا کہیں جسے

حسرت[1] نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں م گلدستۂ نگاہ، سویدا کہیں جسے

کس فرصتِ وصال پہ ہے گل کو، عندلیب[2]! زخمِ فراق، خندۂ بے جا کہیں جسے

۱۔ نخ = ہے کرتا ہے گل، جنونِ تماشا کہیں جسے
گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

۲۔ ″ = اسے خدا

* یہ اشعار پہلی مرتبہ متن ق میں درج ہوئے

○ ۱۸۱۶ء

درکار ہے[1] شگفتنِ گل ہائے عیش کو م صبحِ بہار، پنبۂ مینا کہیں جسے
پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا! م افسونِ انتظار، تمنّا کہیں جسے
یارب[*]، ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو یہ محشرِ خیال کہ دنیا کہیں جسے
سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے، ڈالیے م وہ ایک مُشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے
ہے چشمِ تر میں، حسرتِ دیدار سے نہاں[۲] م شوقِ عناں گسیختہ، دریا کہیں جسے
غالب[*]، بُرا نہ مان، جو واعظ بُرا کہے م ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے؟

منت کشی میں حوصلہ بے اختیار ہے داماںِ صد کفن، تہِ سنگِ مزار ہے
کس کا سراغِ جلوہ ہے، حیرت کو، اے خدا؟ م آئینہ، فرشِ شش جہتِ انتظار ہے
عبرت طلب ہے، حلِّ معمائے آگہی شبنم، گدازِ آئینۂ اعتبار ہے
ہے ذرّہ ذرّہ، تنگیِ جا سے، غبارِ شوق م گر دام یہ ہے، وسعتِ صحرا شکار ہے
دل[٥] مدعی، و دیدہ بنا مدعی علیہ م نظّارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے
چھڑکے ہے شبنم، آئینۂ برگِ گل پہ، آب م اے عندلیب[!] وقتِ وداعِ بہار ہے
خجلت کشِ وفا کو[۳] شکایت نہ چاہیے اے[۴] مدعی، طلسمِ عرق بے غبار ہے

۱۔ نخ = ہے تار و پودِ فرشِ تبسم بہ بزمِ عیش ۲۔ نخ = اسد
۳۔ نخ = سے ۴۔ نخ = اے بے حیا
٥ یہ شعر پہلی بار متن ق ا میں درج ہوا
* یہ اشعار پہلی مرتبہ متن ق میں درج ہوئے

○ ۱۸۱۶ء

تپِ[٥] آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے م وہ آئے یا نہ آئے، پہ یاں انتظار ہے
کیفیتِ ہجومِ تمنا رسا، اسد
خمیازہ، ساغرِ مئے رنجِ خمار ہے

مستی، بہ ذوقِ غفلتِ ساقی، ہلاک ہے م موجِ شراب، یک مژۂ خوابناک ہے
کلفت، طلسمِ جلوۂ کیفیتِ دگر زنگار خوردہ[۱] آئنہ، یک برگِ تاک ہے
ہے عرضِ جوہرِ خط و خالِ ہزار عکس لیکن ہنوز دامنِ آئینہ پاک ہے
ہوں، خلوتِ فسردگیِ انتظار میں وہ بے دماغ جس کو ہوس[۲] بھی تپاک ہے
جُز[*] زخمِ تیغِ ناز، نہیں دل میں آرزو م جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے
جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں، اسد م صحرا ہماری آنکھ میں یک مُشتِ خاک ہے

حُسنِ بے پروا، خریدارِ متاعِ جلوہ ہے م آئنہ، زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
عجزِ دیدن ہا بناز، و نازِ رفتن ہا بچشم جادۂ صحرائے آگاہی، شعاعِ جلوہ ہے
اختلافِ رنگ و بو، طرحِ بہارِ بیخودی صُلحِ کُل، گردِ ادب گاہِ نزاعِ جلوہ ہے

۱۔ نخ = بستہ
۲۔ " = تمنا
٥ یہ شعر پہلی بار متن ق ا میں درج ہوا
* یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

تاکجا، اے آگہی، رنگ تماشا باختن؟ م چشمِ واگردیدہ، آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

حُسنِ خوباں بس کہ بے قدرِ تماشا ہے اسدؔ
آئنہ یک دست ردِّ امتناعِ جلوہ ہے

خود فروشی ہاے ہستی بس کہ جاے خندہ ہے ہر شکستِ[1] قیمتِ دل میں[2] صداے خندہ ہے
عرضِ[3] نازِ شوخیِ دنداں، براے خندہ ہے م دعوئ جمعیّتِ احباب، جاے خندہ ہے
ہے عدم میں غنچہ،[4] محوِ عبرتِ انجامِ گل م یک جہاں زانو تامّل، در قفاے خندہ ہے
کلفتِ افسردگی کو عیشِ بے تابی حرام م ورنہ[5] دنداں در دلِ افشردن، بناے خندہ ہے[6]
نقشِ عبرت در نظر، یا نقدِ عشرت در بساط دو جہاں وسعت بقدرِ یک فضاے خندہ ہے
°شورشِ باطن کے ہیں احباب منکر، ورنہ یاں م دل، محیطِ گریہ و لب آشناے خندہ ہے

جاے استہزا ہے، عشرت کوشیِ ہستی اسدؔ
صبح و شبنم، فرصتِ نشوونماے خندہ ہے

شوخیِ مضرابِ جولاں، آبیارِ نغمہ ہے برگ ریزِ ناخنِ مطرب، بہارِ نغمہ ہے

۱۔ نخ = تا ۲۔ نخ = ہا ۳۔ نخ = شوخیِ اظہارِ دنداں ہا
۴۔ ″ = ہیں عدم میں غنچہ ہا عبرت کشِ انجامِ گُل
۵۔ ″ = عیشِ بے تابی خرام کلفتِ افسردگی
۶۔ ″ = عرضِ ° یہ شعر پہلی بار متن قا میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

کس سے، اے غفلت، تجھے تعبیرِ آگاہی ملے؟ گوش ہا سیمابی، و دل بے قرارِ نغمہ ہے
سازِ عیشِ بے دلی ہے، خانہ ویرانی، مجھے سیل، یاں کوکِ صداے آبشارِ نغمہ ہے
سُنبلی خواں ہے، بذوقِ تارِ گیسوے دراز نالۂ زنجیرِ مجنوں، رشتہ دارِ نغمہ ہے
شوخیِ فریاد سے ہے پردۂ زنبور، گل کسوتِ ایجادِ بلبل، خار خارِ نغمہ ہے
نشّہ ہا، شادابِ رنگ، و ساز ہا، مستِ طرب م شیشۂ مے، سروِ سبزِ جویبارِ نغمہ ہے
*ہم نشیں، مت کہہ کہ "برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست" م واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

غفلت استعدادِ ذوق، و مدّعا غافل اسدؔ
پنبۂ گوشِ حریفاں، پود و تارِ نغمہ ہے

نشۂ مے، بے چمن، دودِ چراغِ کشتہ ہے جام، داغِ شعلہ اندودِ چراغِ کشتہ ہے
رحم کر، ظالم، کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے م نبضِ بیمارِ وفا، دودِ چراغِ کشتہ ہے
°دل لگی کی آرزو، بے چین رکھتی ہے ہمیں م ورنہ یاں بے رونقی، سودِ چراغِ کشتہ ہے
داغِ ربطِ[1] ہم ہیں اہلِ باغ، گر گل ہو شہید لالہ، چشمِ حسرت آلودِ چراغِ کشتہ ہے
شور ہے کس بزم کی عرضِ جراحت خانہ کا؟ صبح، یک زخمِ نمک سودِ چراغِ کشتہ ہے

۱۔ نخ = ہم دیگر ہیں
° یہ شعر پہلی بار متن قا میں درج ہوا
* یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

نامرادِ جلوہ، ہر[1] عالم میں حسرت گل کرے   لالہ، داغِ شعلہ فرسودِ چراغِ کشتہ ہے
ہو جہاں، تیرا دماغِ[2] نازِ مستِ بے خودی   خوابِ نازِ گلرخاں، دودِ چراغِ کشتہ ہے

ہے، دلِ افسردہ، داغِ[3] شوخیِ مطلبِ اسدؔ
شعلہ، آخر فالِ مقصودِ چراغِ کشتہ ہے

٥
تپش سے میری وقفِ کشمکش، ہر تارِ بستر ہے   م   مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے
بہ ذوقِ شوخیِ اعضا تکلف بارِ بستر ہے   معافِ پیچ تابِ کشمکش، ہر تارِ بستر ہے
خوشا[4]! اقبالِ رنجوری، عیادت کو تم آئے ہو   م   فروغِ شمعِ بالیں، طالعِ بیدارِ بستر ہے
معمائے تکلف، سر بمہرِ چشم پوشیدن[5]   گدازِ شمعِ محفل، پیچشِ طومارِ بستر ہے
مژہ فرشِ رہ و دل ناتوان و آرزو مضطر   بپائے خفتہ، سیرِ وادیِ پُر خارِ بستر ہے
سرشکِ سر بہ صحرا دادہ، نورالعینِ دامن[6] ہے   م   دلِ بے دست و پا افتادہ، برخوردارِ بستر ہے
بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطراب[7] شامِ تنہائی   م   شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر، تارِ بستر ہے

۱۔ نخ = در ہر رنگ
۲۔ 〃 = دماغِ خوے نازک نیم مست
۳۔ 〃 = داغ آرزوے شوخ اسدؔ
۴۔ 〃 = ے عبارت بس کہ تجھ سے گرمیِ بازارِ بستر ہے
۵۔ 〃 = بستن ہا
۶۔ 〃 = ہا
۷۔ 〃 = اضطرابِ وحشتِ شب ہا
٥ یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

ابھی[1] آتی ہے بو بالش سے اُس کی زلفِ مشکیں کی   م   ہماری دید کو، خوابِ زلیخا، عارِ بستر ہے
کہوں کیا، دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالبؔ   م   کہ بیتابی سے ہر یک تارِ بستر خارِ بستر ہے

خطر ہے، رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جاوے   م   غرورِ دوستی آفت ہے، تو دشمن نہ ہو جاوے
بپاسِ شوخیِ مژگاں سرِ ہر خار سوزن ہے   تبسم برگِ گُل کو، بخیۂ دامن نہ ہو جاوے
جراحت دوزیِ عاشق ہے جائے رحم، ترساں ہوں   کہ رشتہ، تارِ اشکِ دیدۂ سوزن نہ ہو جاوے
غضب شرم آفریں ہے رنگریزی ہائے خود بینی   سپیدیِ آئنے کی پنبۂ روزن نہ ہو جاوے
سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما غالبؔ   م   اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جاوے

نوائے خفتۂ الفت، اگر بیتاب ہو جاوے   پرِ پروانہ، تارِ شمع پر مضراب ہو جاوے
اگر وحشت عرق افشانِ بے پروا خرامی ہو   بیاضِ دیدۂ آہو کفِ سیلاب ہو جاوے
زبس[2] طوفانِ آب و گل ہے، غافل کیا تعجب ہے!   کہ ہر یک گردبادِ گلستاں گرداب ہو جاوے
اثر میں یاں تک اے دستِ دعا، دخلِ تصرف کر   کہ سجدہ، قبضۂ تیغِ خمِ محراب ہو جاوے
برنگِ گل، اگر شیرازہ بندِ بے خودی رہیے   ہزار آشفتگی مجموعۂ یک خواب ہو جاوے

۱۔ نخ = ے اسدؔ جوشِ بہارِ دیدۂ بیدار کے صدقے
یہ شعر م میں موجود ہے
۲۔ نخ = ے طراوت جوشیِ طوفانِ آب و گل سے ممکن ہے

○ ۱۸۱۶ء

نمک بر داغِ مشک آلودہ وحشت تماشا ہے　　سوادِ دیدۂ آہوشبِ مہتاب ہو جاوے

اسدؔ، باوصفِ مشقِ بے تکلّف خاک گردیدن
غضب ہے، گر غبارِ خاطرِ احباب ہو جاوے

دلِ بیمار از خود رفتہ، تصویرِ نہالی ہے　　کہ مژگاں ریشۂ دارِ نیستانِ شیرقالی ہے
سرورِ نشّۂ گردش اگر کیفیّت افزا ہو　　نہاں ہر گردِ بادِ دشت میں جامِ سفالی ہے
عروجِ نشّہ ہے سرتاقدم قدِّ چمن رویاں　　بجائے خود، وگرنہ، سرو بھی مینائے خالی ہے
ہُوا آئینہ، جامِ بادہ عکسِ روئے گلگوں سے　　نشانِ خالِ رخ، داغِ شرابِ پرتگالی ہے
بپائے خامۂ مو طے رہِ وصفِ کمر کیجے　　کہ تارِ جادۂ سرمنزلِ نازک خیالی ہے

اسدؔ اُٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش
لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

شبنم بہ گلِ لالہ، نہ خالی زِ ادا ہے　م　داغِ دلِ بے درد، نظرگاہِ حیا ہے
دل، خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ[1] دیدار　م　آئینہ، بدستِ بُتِ بدمستِ حنا ہے
تِمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق　م　آئینہ، بہ اندازِ گل، آغوش کشا ہے

۱۔ نخ = کثرتِ اظہار

○ ۱۸۱۶ء

قمری کفِ خاکستر، و بلبل قفسِ رنگ　م　اے نالہ! نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟
مجبوری و دعوائے گرفتاریِ الفت　م　دستِ[1] تہِ سنگ آمدہ، پیمانِ وفا ہے
سررشتۂ بیتابیِ دل، در گرہِ عجز　　پروازِ بہ خوں خفتہ و فریاد رسا ہے
اے پرتوِ خورشیدِ جہانتاب، ادھر بھی　م　سائے کی طرح، ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
معلوم[2] ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ　م　تیغِ ستم[3]، آئینۂ تصویر نما ہے
شعلے سے نہ ہوتی، ہوسِ شعلہ نے جو کی　م　جی، کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے
تو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو　م　معشوقی و بے حوصلگی، طرفہ بلا ہے
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　م　یارب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
*بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو، غالبؔ!　م　کوئی نہیں تیرا، تو، مری جان خدا ہے

زلفِ سیہ، افعی نظرِ بدقلمی ہے　　ہر چند خطِ سبز و زمرّد رقمی ہے
ہے مشقِ وفا، جانتے ہیں لغزشِ پا تک　　اے شمع، تجھے دعویِ ثابت قدمی ہے
ہے عرضِ شکستِ آئنہ جرأتِ عاشق　　حیرآہ کہ سرِ لشکرِ وحشت علمی ہے

۱۔ نخ = ہے دامن تہِ سنگ آمدہ احرامِ وفا ہے
۲۔ " = ہے ظاہر ہے اسدؔ حالِ شہیدانِ گذشتہ
۳۔ " = صنم
* یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا
▭ یہ اشعار گل میں موجود ہیں ۔ یہ غزل بعض اوراق کے نقصان کی وجہ سے ق میں دستیاب نہیں

○ ۱۸۱۶ء

واماندۂ ذوقِ طربِ وصل نہیں ہوں ۔۔۔ اے حسرتِ بسیار، تمنا کی کمی ہے

وہ پردہ نشیں، اور اسدؔ آئینۂ اظہار
شہرت چمنِ فتنۂ وعنقا ارمی ہے

اس قامتِ رعنا کی جہاں جلوہ گری ہے ۔۔۔ تسلیم فروشی، روشِ کبکِ دری ہے

شرمندۂ الفت ہوں مداوا طلبی سے ۔۔۔ ہر قطرۂ شربت مجھے اشکِ شکری ہے

سرمایۂ وحشت ہے، دلا، سایۂ گلزار ۔۔۔ ہر سبزۂ نوخاستہ یاں بالِ پری ہے

روشن ہوئی یہ بات دمِ نزع کہ آخر ۔۔۔ فانوسِ کفن بہرِ چراغِ سحری ہے

ہم آئے ہیں، غالبؔ رہِ اقلیمِ عدم سے
یہ تیرگیِ حال لباسِ سفری ہے

تاچند، نفس، غفلتِ ہستی سے برآوے ۔۔۔ قاصد تپشِ نالہ ہے، یارب، خبر آوے!

ہے طاقِ فراموشیِ سودائے دو عالم ۔۔۔ وہ سنگ کہ گلدستۂ جوشِ شرر آوے

درد، آئنہ کیفیتِ صد رنگ ہے، یارب ۔۔۔ خمیازہ طرب ساغرِ زخمِ جگر آوے

جمعیتِ آوارگیِ دید نہ پوچھو ۔۔۔ دل تا مژہ، آغوشِ وداعِ نظر آوے

۱۔ نخ = شوق

○ ۱۸۱۶ء

اے ہرزہ دری، منتِ تمکینِ جنوں کھینچ ۔۔۔ تا آبلہ محمل کشِ موجِ گہر آوے

وہ تشنۂ سرشارِ تمنا ہوں کہ جس کو ۔۔۔ ہر ذرّہ بہ کیفیتِ ساغر نظر آوے

زاہد کہ جنوں سبحۂ تحقیق ہے، یارب ۔۔۔ زنجیریِ صد حلقۂ بیرونِ در آوے

تمثالِ بتاں گر نہ رکھے پنبۂ مرہم ۔۔۔ آئینہ بہ عریانیِ زخمِ جگر آوے

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا م ۔۔۔ مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

ہر غنچہ، اسدؔ، بارگہِ شوکتِ گل ہے
دل فرشِ رہِ ناز ہے، بیدلؔ اگر آوے

نگاہ اُس چشم کی، افزوں کرے ہے ناتوانائی ۔۔۔ پرِ بالش ہے وقتِ دید مژگانِ تماشائی

شکستِ قیمتِ دل، آں سوئے عذرِ شناسائی ۔۔۔ طلسمِ ناامیدی ہے خجالت گاہِ پیدائی

پرِ طاؤس ہے نیرنگِ داغِ حیرت انشائی ۔۔۔ دو عالم دیدۂ بسمل چراغاں جلوہ پیمائی

تحیر ہے گریباں گیرِ ذوقِ جلوہ پیرائی ۔۔۔ ملی ہے جوہرِ آئینہ کو، جوں بخیہ گیرائی

شرارِ سنگ سے پادر حنا گلگونِ شیریں ہے ۔۔۔ ہنوز، اے تیشۂ فرہاد، عرضِ آتشیں پائی

غرورِ دستِ رد نے شانہ توڑا فرقِ ہدہد پر ۔۔۔ سلیمانی، ہے ننگِ بے دماغانِ خود آرائی

جنوں افسردہ و جاں ناتواں، اے جلوہ، شوخی کر ۔۔۔ گئی یک عمر خودداری باستقبالِ رعنائی

۱۔ نخ = تکلیفے
٥ یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

نگاہِ عبرت افسوں گاہ برق دگاہ مشعل ہے — ہوا ہر خلوت و جلوت سے حاصل ذوقِ تنہائی
جنونِ بیکسی ساغر کشِ داغِ پلنگ آیا — شرر کیفیتِ مے، سنگ[1] محو نازِ مینائی
خدایا، خوں ہو رنگِ امتیاز اور نالہ موزوں ہو — جنوں کو سخت بیتابی ہے تکلیفِ شکیبائی

خراباتِ جنوں میں ہے اسد، وقتِ قدح نوشی
بہ عشقِ ساقیِ کوثر، بہارِ بادہ پیمائی

غم و عشرت قدم بوسِ دلِ تسلیم آئیں ہے — دعائے مدعا گم کردگاں[2]، لبریز آمیں ہے
تماشا ہے کہ ناموسِ وفا رسوائے آئیں ہے — نفس تیری گلی میں خوں ہوا اور بازِ رنگیں ہے
لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی — م — قیامت، کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے
ہمارا دیکھنا گر ننگ ہے، سیرِ گلستاں کر — شرارِ آہ سے موجِ صبا، دامانِ گلچیں ہے
پیامِ تعزیت پیدا ہے اندازِ عیادت سے — شبِ ماتم، ترِ دامانِ دودِ شمعِ بالیں ہے
زبس[3] جز حسن، منتِ ناگوارا ہے طبیعت پر — کشادِ عقد، محوِ ناخنِ دستِ نگاریں ہے
نہیں ہے سرنوشتِ عشق، غیر از بے دماغی ہا — جبیں پر میری، مدِ خامۂ قدرت خطِ چیں ہے
بہارِ باغ، پامالِ خرامِ جلوہ فرمایاں — حنا سے دست و خونِ کشتگاں سے تیغ رنگیں ہے

۱۔ نخ = عرض
۲۔ ؍؍ = گم کردگان عشق
۳۔ ؍؍ = اسد

○ ۱۸۱۶ء

بیابانِ فنا ہے بعدِ صحرائے طلب[1] غالب — پسینہ توسنِ ہمت کا سیلِ خانۂ زیں ہے

محوِ آرامیدگی، سامانِ بیتابی کرے — چشم میں توڑے نمکداں، ناشکر خوابی کرے
آرزوئے خانہ آبادی نے ویراں تر کیا — کیا کروں گر سایۂ دیوار سیلابی کرے
نغمہ ہا، وابستۂ یک عقدۂ تارِ نفس — ناخنِ[2] تیغِ بتاں، شاید کہ مضرابی کرے
صبح[3] دم وہ جلوہ ریزِ بے نقابی ہو اگر — رنگِ رخسارِ گلِ خرشید[4] مہتابی کرے
زخم ہائے کہنۂ[5] دل رکھتے ہیں جوں مردگی — اے خوشا! گر آبِ تیغِ ناز تیزابی کرے

* بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالب، تو پھر
کیوں نہ دلی میں ہر اک ناچیز نوابی کرے

اے خوشا! وقتے کہ ساقی یک خمستاں وا کرے — تار و پودِ فرشِ محفل، پنبۂ مینا کرے
گر تبِ آسودۂ مژگاں تصرف وا کرے — رشتۂ پا، شوخیِ بالِ نفس پیدا کرے
گر دکھاؤں صفحۂ بے نقشِ رنگِ رفتہ کو[6] — دستِ ردّ، سطرِ تبسم یک قلم انشا کرے

۱۔ نخ = طلب تازی
۲۔ ؍؍ = ناخن مشکل کشا لاؤں ......
۳۔ ؍؍ = گر سحر ...... ہو اسد
۴۔ ؍؍ = خورشید
۵۔ ؍؍ = کہنہ برجا ماندہ
۶۔ ؍؍ = آہ
* یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

جو عزادارِ شہیدانِ نفس در دیدہ ہو　　نوحۂ ماتم بآوازِ پرِ عنقا کرے
حلقۂ[1] گردابِ جوہر کو بنا ڈالے تنور　　عکس گر طوفانیِ آئینۂ دریا کرے
یک درِ بر روے رحمت[2] بستہ دورِ شش جہت　　نا امیدی[3] ہے خیالِ خانہ ویراں کیا کرے
+ توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا؟　　آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

ناتوانی سے نہیں سر در گریبانی، اسدؔ
ہوں[4] سراپا یک خمِ تسلیم، جو مولا کرے

چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے　　م　صبح کے مانند، زخمِ دل، گریبانی کرے
۵ ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک　　م　آبگینہ، کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے
میکدہ گر چشمِ مستِ ناز[5] سے پاوے شکست　　م　موے شیشہ، دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے
خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد　　م　یک قلم منظور ہے، جو کچھ پریشانی کرے
ہاتھ پر گر ہاتھ مارے یار وقتِ قہقہہ　　کرمکِ شب تاب سا، مہر پر افشانی کرے
۵ جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال　　م　دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

۱۔ نخ = ۓ ہو تنورستاں طلسمِ حلقۂ گرداب ہا
۲۔ ״ = شفقت
۳۔ ״ = حسرتستاں
۴۔ ״ = ۓ جملہ تن ہوں یک خمِ تسلیم، جو آقا کرے
۵۔ ״ = یار
+ یہ شعر پہلی بار حاشیہ ق میں بڑھایا گیا
۵ یہ اشعار پہلی بار متن ق میں درج ہوئے

○ ۱۸۱۶ء

وقت اس افتادہ کا خوش، جو قناعت سے اسدؔ　　نقشِ پاے مور کو تختِ سلیمانی کرے

بہ نقصِ ظاہری رنگِ کمالِ طبع پنہاں ہے　　کہ بہرِ مدعاے دل، زبانِ لال، زنداں ہے
خموشی خانہ زادِ چشمِ بے پروا نگاہاں ہے　　غبارِ سرمہ یاں گردِ سوادِ نرگستاں ہے
صفاے اشک میں داغِ[1] جگر جلوہ دکھاتے ہیں　　پرِ طاؤس[2] گویا، برقِ ابرِ چشمِ گریاں ہے
بہ بوے[3] زلفِ مشکیں یہ دماغ، آشفتۂ رم ہیں　　کہ شاخِ آہواں، دودِ چراغِ آسا پریشاں ہے
تکلف برطرف، ہے جانستاں تر لطفِ بدخویاں[4]　　م　نگاہِ بے حجابِ ناز، تیغِ تیزِ عریاں ہے
اسدؔ، یہ فرطِ غم نے کی تلف کیفیتِ شادی　　م　کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

تمام اجزاے عالم صیدِ دامِ چشمِ گریاں ہے　　طلسمِ شش جہت، یک حلقۂ گردابِ طوفاں ہے
نہیں ہے مردنِ صاحب دلاں جز کسبِ جمعیت　　سُویدا میں نفس مانندِ خطِ نقطے[5] میں پنہاں ہے
غبارِ دشتِ وحشت، سرمہ سازِ انتظار آیا　　کہ چشمِ آبلہ میں طولِ میلِ راہ، مژگاں ہے
زبس[6] دوشِ رمِ آہو پہ ہے محمل تمنا کا　　جنونِ قیس سے بھی شوخیِ لیلیٰ نمایاں ہے

۱۔ نخ = داغِ جگر آئینہ پرتو ہیں
۲۔ ״ = ۓ پرِ طاؤس برقِ ابرِ چشمِ اشک باراں ہے
۳۔ ״ = ۓ بہ بوے زلفِ مشک افشاں ہیں رم افزوں آشفتن
۴۔ ״ = ۓ جہاں زندانِ مژ جستانِ دل ہاے پریشاں ہے
۵۔ ״ = در نقطہ
۶۔ ״ = ۓ طراز خانۂ محمل ہے بر دوشِ رمِ آہو
زِ وحشت ہاے مجنوں شوخیِ لیلیٰ نمایاں ہے

○ ۱۸۱۶ء

نقابِ یار ہے غفلت نگاہی اہلِ بینش کی[1] مژہ پوشیدنی ہا، پردۂ تصویرِ عریاں ہے

اسدؔ، بندِ قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ[2]
اگر وا ہو، تو دکھلا دوں کہ یک عالم گلستاں ہے

ہجومِ نالہ، حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے م خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے
▭ دل و دیں نقد لا ساقی، سے گر سودا کیا چاہے م کہ اس بازار میں ساغر، متاعِ دستگرداں ہے
▭ غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو م چراغِ روشن اپنا، قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے
کجا مے؟ کو عرق؟ سعیِ عروجِ نشۂ رنگیں تر خطِ رخسارِ ساقی، تا خطِ ساغر چراغاں ہے
رہا بے قدر دل، در پردۂ جوشِ ظہور آخر گل و نرگس بہم آئینہ و اقلیمِ کوراں ہے
تکلّف سازِ رسوائی ہے، غافل، شرمِ رعنائی دلِ خوں گشتہ، در دستِ حنا آلودہ عریاں ہے
تماشا، سرخوشِ غفلت ہے با وصفِ حضورِ دل ہنوز آئینہ، خلوت گاہِ نازِ ربطِ مژگاں ہے
تکلّف برطرف، ذوقِ زلیخا جمع کر، ورنہ پریشاں خوابِ آغوشِ وداعِ یوسفستاں ہے
اسدؔ، جمعیّتِ دل در کنارِ بے خودی خوشتر
دو عالم آگہی، سامانِ یک خوابِ پریشاں ہے

۱۔ نخ = غفلت نگاہی ہا بے بینندہ
۲۔ ″ = ے اسدؔ بند قبا ہے غنچۂ گلزار سامانی
اگر ہو وے شگفتن جوشش یک عالم گلستاں ہے
▭ یہ اشعار گل میں موجود ہیں۔ ف کے بعض اوراق تلف ہو چکے ہیں۔ اس لیے
یہ غزل دستیاب نہیں ہو سکی۔

○ ۱۸۱۶ء

تغافل مشربی سے، ناتمامی بس کہ پیدا ہے نگاہِ ناز، چشمِ یار[1] میں زُنّارِ مینا ہے
تصرّف وحشیوں میں ہے تصوّرہائے مجنوں کا سوادِ چشمِ آہو، عکسِ خالِ روئے لیلا ہے
محبّت، طرزِ پیوندِ نہالِ دوستی جانے دویدن، ریشہ ساں، مفتِ رگِ خوابِ زلیخا ہے
کیا یکسر گدازِ دل نیازِ جوششِ حسرت سُوَیدا، نسخۂ تہ بندیِ داغِ تمنّا ہے
ہجومِ[2] ریزشِ خوں کے سبب رنگ اُڑ نہیں سکتا حنائے پنجۂ صیّاد، مرغِ رشتہ برپا ہے
اسدؔ، گر نامِ[3] والائے علی تعویذِ بازو ہو
غریقِ بحرِ خوں، تمثال در آئینہ رہتا ہے

اثر سوزِ محبت کا، قیامت بے مُحابا ہے کہ رگ سے سنگ میں تخمِ شرر کا ریشہ پیدا ہے
نہاں ہے گوہرِ مقصود جیبِ خود شناسی میں کہ یاں غوّاص ہے تمثال، اور آئینہ دریا ہے
عزیزو[4]، ذکرِ وصلِ غیر سے مجھ کو نہ بہلاؤ کہ یاں[5] افسونِ خواب، افسانۂ خوابِ زلیخا ہے
تصوّر بہرِ تسکینِ تپیدن[6] ہائے طفلِ دل بباغِ[7] رنگ ہائے رفتہ، گلچینِ تماشا ہے

۱۔ نخ = درچشمِ بتاں
۲۔ ″ = ے نہیں ہوتا پریدن جلوہ رنگ از فرطِ خوں ریزی
۳۔ ″ = دانۂ دُرِ نجف
۴۔ ″ = ے عزیزاں گرچہ بہلاتے ہیں ذکرِ وصل سے لیکن
۵۔ ″ = مجھے
۶۔ ″ = طپیدن
۷۔ ″ = بیادِ

○ ۱۸۱۶ء

بہ سعیِ غیر ہے قطعِ لباسِ خانہ ویرانی[1]   کہ تارِ جادۂ رہ، رشتۂ دامانِ صحرا ہے

مجھے[2] شب ہائے تاریکِ فراق شعلہ رویاں میں   چراغِ خانۂ دل، سوزشِ داغِ تمنّا ہے

* ترے نوکر ترے در پر اسدؔ کو ذبح کرتے ہیں
ستمگر، ناخدا ترس، آشنا کُش، ماجرا کیا ہے؟

بہ بزمِ مے پرستی، حسرتِ تکلیفِ بے جا ہے   کہ جامِ[3] بادہ، کف برلب بتقریبِ تقاضا ہے

مری° ہستی، فضائے حیرت آبادِ تمنّا ہے   م   جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

نہ لائی شوخیِ اندیشہ، تابِ رنجِ[4] نومیدی   م   کفِ افسوس ملنا°[5]، عہدِ تجدیدِ تمنّا ہے

نشاطِ دیدۂ بینا ہے کو خواب؟ و چہ بیداری؟   بہم آوردہ مژگاں[6] رُوئے بر رُوئے تماشا ہے

نہ ہووے[7] آبلوں میں، گر، سرِشکِ دیدۂ نم سے   بجولاں گاہِ نومیدی[8]، نگاہِ عاجزاں پا ہے

وفائے° دلبراں ہے اتفاقی، ورنہ، اے ہمدم   م   اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے؟

۱۔ نخ = خانہ بر باداں
۲۔ ” = اسدؔ
۳۔ ” = ے کہ یاں کف برلبِ پیمانہ از جوشِ تقاضا ہے
۴۔ ” = درد
۵۔ ” = سودن
۶۔ ” = بوسۂ جیبِ تماشا
۷۔ ” = ے نہ ہو گر جوشِ اشک آئینۂ در آبلہ خفتن
۸۔ ” = مطلب ہا
* یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا
° یہ اشعار پہلی مرتبہ متن ق میں درج ہوئے

○ ۱۸۱۶ء

نگہ معمارِ حسرت ہا، چہ آبادی؟ چہ ویرانی؟   کہ مژگاں جس طرف وا ہو، بکف دامانِ صحرا ہے

بہ سختی ہائے قیدِ زندگی، معلوم آزادی   شرر بھی صیدِ دامِ[1] رشتۂ رگ ہائے خارا ہے

خزاں کیا؟ فصلِ گل کہتے ہیں کس کو؟ کوئی موسم ہو   م   وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

اسدؔ، پاسِ تمنّا سے[2] نہ رکھ امیدِ آزادی
گدازِ[3] ہر تمنّا آبیارِ صد تمنّا ہے

بہار پروردن سراسر لطف گستر سایہ ہے   پنجۂ مژگاں بہ طفلِ اشک دستِ دایہ ہے

فصلِ گل میں دیدۂ خونیں نگاہانِ جنوں   دولتِ نظّارۂ گل سے شفق سرمایہ ہے

شورشِ باطن سے یاں تک مجھ کو غفلت ہے کہ آہ!   شیونِ دل یک[4] سرودِ خانۂ ہمسایہ ہے

* کیوں نہ تیغِ یار کو مشاطۂ الفت کہوں؟   زخم مثلِ گُل سراپا کا مرے پیرایہ ہے

اے اسدؔ آباد ہے مجھ سے جہانِ شاعری   خامہ میرا تختِ سلطانِ سخن کا پایہ ہے

وہ نہا کر آبِ گُل سے سایۂ گُل کے تلے   بال کس گرمی سے سُکھلاتا تھا سُنبل کے تلے

کثرتِ جوشِ سُویدا سے نہیں تِل کی جگہ   خال کب مشاطہ دے سکتی ہے کاکُل کے تلے

۱۔ نخ = در بندِ دام   ۲۔ نخ = عبث
۳۔ ” = ے گدازِ آرزو ہا آبیارِ آرزو ہا ہے
۴۔ ” = جوں

* یہ شعر پہلے پہل متن ق میں درج ہوا   ▭ شعر م میں طبع ہوا

○ ۱۸۱۶ء

بس کہ خوباں باغ کو دیتے ہیں تقریبِ شکست　　بال اُگ جاتا ہے شیشے کا رگِ گُل کے تلے
ہے پر افشانِ طپیدن ہا بہ تکلیفِ ہوس　　ورنہ صد گلزار ہے یک بالِ بلبل کے تلے
پے بمقصد بُردنی ہے خضرِ مے سے اے اسدؔ　　جادۂ منزل ہے خطِّ ساغرِ مُل کے تلے

جوہرِ آئینہ ساں مژگاں بدل آسودہ ہے　　قطرہ[1] جو آنکھوں سے ٹپکا سو نگاہ آلودہ ہے
دامِ[2] گاہِ عجز میں سامانِ آسایش کہاں؟　　پر فشانی بھی[3] فریبِ خاطرِ آسودہ ہے
اے ہوس، عرضِ بساطِ ناز[4] مشتاقی نہ مانگ　　جوں[5] پرِ طاؤس، یکسر داغ مشکِ اندوہ ہے
ہے ریا کارِ تبہ بالاتر تصوّر کردنی　　تیرگی[6] سے داغ کی، مہ، سیمِ مس اندودہ ہے
کیا کہوں پرواز کی آوارگی کی کشمکش؟　　عافیت، سرمایۂ بال و پرِ نکشودہ ہے
پنبۂ مینا سے مے رکھ لو تم اپنے کان میں　　مے پرستاں، ناصحِ بے صرفہ گو بیہودہ ہے
جس* طرف سے آئے ہیں آخر اُدھر ہی جائیں گے　　مرگ سے وحشت نہ کر، راہِ عدم پیمودہ ہے
ہے سوادِ خط، پریشاں موئیِ اہلِ عزا　　خامہ میرا شمعِ قبرِ کشتگاں کا دودہ ہے
کثرتِ انشائے مضمونِ تحیّر سے، اسدؔ　　ہر سرِ انگشت، نوکِ خامۂ فرسودہ ہے

۱۔ نخ = ے قطرۂ اشک ترا دیدۂ نگاہ آلودہ ہے
۲۔ ″ = ے در طلسمِ عاجزی اے اضطراب آرام کو
۳۔ ″ = یا　　۴۔ نخ = نازِ مشتاقاں نہ پوچھ
۵۔ ″ = جوں پرِ طاؤس چندیں
۶۔ ″ = تیرگیِ داغ سے

* یہ شعر پہلے پہل متن ق میں درج ہوا

○ ۱۸۱۶ء

بہارِ تعزیت آبادِ عشق، ماتم ہے　　کہ تیغِ یار، ہلالِ مہِ محرّم ہے
نہ پوچھ٥ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا م　　کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے
یہ رہنِ ضبط ہے، آئینہ[1] بندیِ گوہر　　وگرنہ بحر میں ہر قطرہ چشمِ پُرنم ہے
چمن میں کون ہے طرز آفرینِ شیوۂ عشق؟　　کہ گل ہے بلبلِ رنگین و بیضہ شبنم ہے
اگر نہ ہووے رگِ خواب صرفِ شیرازہ　　تمام دفترِ ربطِ مزاج، درہم ہے
بہت٥ دلوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی م　　وہ اِک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے
اسدؔ بہ نازکیِ طبعِ آرزو انصاف!
کہ ایک وہمِ ضعیف و غمِ دو عالم ہے

عذارِ یار، نظر بندِ چشمِ گریاں ہے　　عجب کہ پرتوِ خور، شمعِ شبنمستاں ہے
ہجومِ[2] ضبطِ فغاں سے مری زبانِ خموش　　برنگِ بستہ[3]، بہ زہراب دادہ پیکاں ہے
قبائے جلوہ فزا[4] ہے، لباسِ عریانی　　بطرزِ گل، رگِ جاں مجھ کو تارِ داماں ہے
لبِ گزیدۂ معشوق ہے، دلِ افگار　　کہ بخیہ[5] جلوۂ آثارِ زخمِ دنداں ہے

۱۔ نخ = رنگِ نیاز
۲۔ ″ = ے زبان بکامِ خموشاں زخطِ تلخیِ ضبط
۳۔ ″ = پستہ
۴۔ ″ = نسب
۵۔ ″ = نشانِ جوہرِ شمشیر
٥ یہ اشعار پہلی بار متنِ ق میں درج ہوئے

○ ۱۸۱۶ء

کشودِ غنچۂ خاطر[1] عجب نہ رکھ غافل　　صبا خرامیِ خوباں بہار ساماں ہے
فغاں! کہ بہرِ شفا سے حصول ناشدنی　　دماغ، نازکشِ منّتِ طبیباں ہے
طلسمِ منّتِ یک خلق سے رہائی دی°　　جہاں جہاں مرے قاتل کا مجھ پہ احساں ہے
جنوں نے مجھ کو بنایا ہے مدّعی میرا°　　ہمیشہ ہاتھ میں میرے مرا گریباں ہے
اسد[2] کو زیست تھی مشکل، اگر نہ سن لیتا
کہ قتلِ عاشقِ دلدادہ تجھ کو آساں ہے

شفق، بدعویِ عاشق گواہِ رنگیں ہے　　کہ ماہ، وزدِ حنائے کفِ نگاریں ہے
کرے ہے، بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ　م　خطِ پیالہ، سراسر نگاہِ گلچیں ہے
عیاں ہے پائے حنائی برنگِ پرتوِ نور[3]　　رکاب، روزنِ دیوارِ خانۂ زیں ہے
جبینِ صبحِ امیدِ فسانہ گویاں پر　　درازیِ رگِ خوابِ بتاں خطِ چیں ہے
ہوا، نشانِ سوادِ دیارِ حسن، عیاں　　کہ خط، غبارِ زمیں خیزِ زلفِ مشکیں ہے
بجا ہے گر نہ سنے نالہ ہائے بلبلِ زار　م　کہ گوشِ گل، نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے
کبھی تو اس سرِ شوریدہ کی بھی داد ملے°　م　کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے

۱۔ نخ = دل
۲۔ ” = ہے اسد! جہاں کہ علی بر سر نوازش ہو
کشادِ عقدۂ دشوار کار آساں ہے
۳۔ ” = سے پرتوِ خورشید
° یہ اشعار پہلی بار متن وقا میں درج ہوئے

○..... ۱۸۱۶ء

نہ پوچھ کچھ سرو سامان و کاروبارِ اسد!　　جنوں معاملہ، بیدل، فقیرِ مسکیں ہے
اسد° ہے نزع میں، چل بے وفا! برائے خدا　م　مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

روتا ہوں بس کہ در ہوسِ آرمیدگی　　جوں گوہر، اشک کو ہے فرامش چکیدگی
برخاک اوفتادگیِ کشتگانِ عشق　　ہے سجدۂ سپاسِ بمنزل رسیدگی
انساں نیاز مندِ ازل ہے کہ جوں کماں　　مطلب ہے ربط سے رگ و پے کی خمیدگی
ہے بسملِ ادائے چمن عارضاں، بہار　　گلشن کو رنگِ گل سے ہے در خوں طپیدگی
دیکھا نہیں ہے ہم نے بعشقِ بتاں، اسد
غیر از شکستہ حالی و حسرت کشیدگی

عاشق، نقابِ جلوۂ جانانہ چاہیے　　فانوسِ شمع کو پرِ پروانہ چاہیے
ہے وصل، ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں　م　معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے
پیدا کریں* دماغِ تماشائے سرو و گل　　حسرت کشوں کو ساغر و مینا نہ چاہیے
دیوانگاں ہیں حاملِ رازِ نہانِ عشق　　اے بے تمیز، گنج کو ویرانہ چاہیے

° یہ شعر پہلی بار متن وقا میں درج ہؤا
* یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہؤا

○ ۱۸۱۶ء

*اُس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو، ہاں
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے

ساقی، بہارِ موسمِ گل ہے سرور بخش
پیماں سے ہم گزر گئے، پیمانہ چاہیے

جادو[1] ہے یار کی روشِ گفتگو، اسدؔ
یاں جُز فسوں نہیں، اگر افسانہ چاہیے

یوں، بعدِ ضبطِ اشک پھروں[2] گرد یار کے
پانی[3] پیے کسو پہ کوئی جیسے وار کے

سیماب پشت گرمیِ آئینہ دے ہے، ہم
حیراں کیے ہوئے ہیں، دلِ بے قرار کے

بعد از وداعِ یار، بخوں در تپیدہ[4] ہیں
نقشِ قدم ہیں ہم، کفِ پائے نگار کے

ظاہر ہے ہم سے کلفتِ بختِ سیاہ روز
گویا کہ تختۂ مشق ہیں خطِ غبار کے

حسرت سے دیکھ رہتے ہیں، ہم آب و رنگِ گل
مانندِ شبنم، اشک ہیں مژگانِ خار کے

آغوشِ[5] گل، کُشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب! چل کہ چلے دن بہار کے

*ہم مشقِ فکرِ وصل و غمِ ہجر سے، اسدؔ
لائق[6] نہیں رہے ہیں، غمِ روزگار کے

۱۔ نخ = جادو ہے طرزِ گفتگوے یار اے اسدؔ
۲۔ " = پھرا
۳۔ " = جس طرح پیوے پانی کوئی وار وار کے
۴۔ " = طپیدہ
۵۔ " = طرزِ گل شگفتہ کنارِ وداع ہے ‌‌ اے بلبلو! چلو کہ چلے دن بہار کے
۶۔ " = قابل
* یہ اشعار پہلی بار متنِ ق میں درج ہوئے

○ ۱۸۱۶ء

بہ فکرِ حیرتِ رم، آئنہ پرداز زانو ہے
کہ مشکِ نافہ تمثالِ سوادِ چشمِ آہو ہے

ترحّم ہیں ستم[1] کوشوں کے ہے، سامانِ خونریزی
سرشکِ چشمِ یار، آبِ دمِ شمشیرِ ابرو ہے

کرے ہے دستِ فرسودِ ہوس، وہمِ[2] توانائی
پرِ افشاندہ در کنجِ قفس، تعویذِ بازو ہے

ہوا، چرخِ خمیدہ، ناتواں بارِ علائق سے
کہ ظاہر، پنجۂ خُرشید[3]، دستِ زیرِ پہلو ہے

اسدؔ، تاکے طبیعت طاقتِ ضبطِ الم لاوے؟
فغانِ دل بہ پہلو، نالۂ بیمارِ بدخو ہے

بدستِ آوردنِ دل گوہرِ دریائے شاہی ہے
وگرنہ خاتمِ دستِ سلیماں فلسِ ماہی ہے

سخن تاریک طبعوں کا، ہے اظہارِ کثافت ہا
کہ زنگِ خانۂ فولاد، مانا ہے سیاہی ہے

خمیدن نشۂ مے میں، ہے شرمِ زشت اعمالی
دماغِ زہد میں آخر غرورِ بے گناہی ہے

نہیں ہے خالی آرایش سے بے سامانیِ عاشق
شکستِ حال، انداز آفرینِ کج کلاہی ہے

اسدؔ، خوباں بھی دورِ چرخ سے رنجیدہ خاطر ہیں
گریباں چاکیِ گل ہا نشانِ داد خواہی ہے

۱۔ نخ = ستم کوشاں
۲۔ " = تابِ پریدن ہا
۳۔ " = خورشید

○ ۱۸۱۶ء

نہ چھوڑ و محفلِ عشرت میں جا، اے میکشاں خالی | کہیں گاہِ بلا ہے، ہو گیا شیشہ جہاں خالی
نہ دوڑا ریشہ دیوانگی صحنِ بیاباں میں | کہ تارِ جادہ سے ہے لُجّۂ ریگِ رواں خالی
دکانِ ناوکِ تاثیر ہے، از خود تہی ماندن | سراسر عجز ہو، کر خانہ مانندِ کماں خالی
محبت، ہے نواسازِ فغاں در پردۂ دل ہا | کرے ہے مغز سے مانند نَے کے اُستخواں خالی
عبث ہے خطِّ ساغر جلوہ، طوقِ گردنِ قمری | مئے الفت سے ہے مینائے سروِ بوستاں خالی
نہ پھولو ریزشِ اعداد کی قطرہ فشانی پر | عزیزاں، ہے برنگِ صفر جامِ آسماں خالی

اسدؔ، ہنستے ہیں میرے گریہ ہائے زار پر مردُم
بھرا ہے دہر بے دردی سے، دل کیجے کہاں خالی

ہوا جب حسن کم، خط بر عذارِ سادہ آتا ہے | کہ بعد از صافِ مَے، ساغر میں دُردِ بادہ آتا ہے
نہیں ہے مزرعِ الفت میں حاصل غیرِ پامالی[1] | نظر دانہ، سرِ شکِ بر زمیں اُفتادہ آتا ہے
محیطِ دہر میں بالیدن، از ہستی[2] گزشتن ہے | کہ یاں ہر یک حبابِ آسا شکست آمادہ آتا ہے
دیارِ عشق میں جاتا ہے جو سوداگری ساماں | متاعِ زندگانی ہا بغاوت دادہ آتا ہے

اسدؔ، وارستگاں باوصفِ ساماں بے تعلق ہیں
صنوبر گلستاں میں بادلِ آزادہ آتا ہے

۱۔ نخ = جز تلف گشتن
۲۔ ” = خود واگزشتن

○ ۱۸۱۶ء

نگاہِ[1] ناز نے جب عرضِ تکلیفِ شرارت کی | دیا ابرو کو چھیڑا، اور اُس نے فتنے کو اشارت کی
روانی موجِ مے کی، گر خطِ جام آشنا ہووے | لکھے کیفیت اُس سطرِ تبسم کی عبارت کی
شہِ گل نے کیا جب بندوبستِ گلشن آرائی | عصائے سبز دے نرگس کو دی خدمت نظارت کی
نہیں[2] ریزش عرق کی، اب سے فوبانِ اعضا ہے | تبِ خجلت سے یہ نبضِ رگِ گل میں حرارت کی

زِ بس نکلا غبارِ دل بوقتِ گریہ[3] آنکھوں سے
اسدؔ کھائے ہوئے سُرمے نے آنکھوں میں بصارت کی

خدایا، دل کہاں تک دن بصد رنج و تعب کاٹے | خمِ گیسو ہو شمشیرِ سیہ تاب اور شب کاٹے!
کریں گر قدرِ اشکِ دیدۂ عاشق، خود آرایاں | صدف دندانِ گوہر سے بہ حسرت اپنے لب کاٹے
دریغا![4] وہ مریضِ غم کہ فرطِ ناتوانی سے | بقدرِ یک نفس جادہ، بصد رنج و تعب کاٹے
+یقیں ہے آدمی کو دستگاہِ فقر حاصل ہو | دمِ تیغِ توکل سے اگر پائے سبب کاٹے
ہوسے یہ رہرواں دل خستہ شرمِ نارسائی سے | کہ دستِ آرزو سے یک قلم پائے طلب کاٹے
اسدؔ[5] مجھ میں ہے اُس کے بوسۂ پا کی کہاں جرأت؟ | کہ میں نے دست و پا باہم بہ شمشیرِ ادب کاٹے

۱۔ نخ = ے نگاہِ سرمہ سا نے عرضِ تکلیفِ شرارت کی
بہ ابروئے خمِ تیغِ صفاہانی اشارت کی
۲۔ ” = ے ہوئی ریزش عرق کی جوششِ اسہالِ ذوبانی
۳۔ ” = اشکِ خاموشی
۴۔ ” = فغاں بر حالِ رنجورے
۵۔ ” = ے اسدؔ کو جرأتِ بوسیدنِ پائے چمن رویاں
+ یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھایا گیا

○ ۱۸۱۶ء

تماشاے جہاں مفتِ نظر ہے
کہ یہ گلزار باغِ رہ گذر ہے

جہاں شمعِ خموشی جلوہ گر ہے
پرِ پروانگاں بالِ شرر ہے

بہ جیبِ اشکِ چشمِ سرمہ آلود
مسی مالیدہ دندانِ گہر ہے

شفق ساں موجۂ خوں ہے رگِ خواب
کہ مژگانِ کشودہ نیشتر ہے

کرے ہے روے روشن آفتابی
غبارِ خطِ رُخ، گردِ سحر ہے

ہوئی یک عمر صرفِ مشقِ نالہ
اثر موقوف بر عمرِ دگر ہے

اسدؔ، ہوں میں پر افشانِ رمیدن
سوادِ شعر در گردِ سفر ہے

بس کہ زیرِ خاک باآبِ طراوت راہ ہے
ریشے سے ہر تخم کا دلو، اندرونِ چاہ ہے

عکسِ[۱] گل ہاے سمن سے چشمہ ہاے باغ میں[۱]
فلسِ ماہی آئنہ پردازِ داغِ ماہ ہے

واں[ا] سے ہے تکلیفِ عرضِ بیدماغی ہاے دل
یاں صریرِ خامہ مجھ کو نالۂ جانکاہ ہے

حسن و رعنائی میں وہمِ[۲] صد سرو گردن ہے فرق
سرو کے قامت پہ گل، یک دامنِ کوتاہ ہے

رشک[*] ہے آسایشِ اربابِ غفلت پر، اسدؔ
پیچ تابِ دل، نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

ا اور ب دو نہیں، اصل میں ایک ہی شعر ہے۔ ا کو بعد کی غزل میں بطور مقطع (ب) استعمال کر لیا گیا ہے، اسی لیے حاشیہ ق میں لکھا گیا مگر (ا) قلم زد ہونے سے رہ گیا۔

۱۔ نخ = ے چشم ہاے باغ میں از عکسِ گل ہاے سمن

۲۔ " = باہم

* یہ شعر پہلے پہل متن ق میں درج ہوا (دیکھو ا، ب) کے لیے دیکھیے ص ۲۸۹

○ ۱۸۱۶ء

اے اسدؔ، مایوس مت ہو از درِ شاہِ نجف
صاحب دل ہا وکیلِ حضرتِ اللہ ہے

بس کہ چشم از انتظارِ خوش خطاں بے نور ہے
یک قلم، شاخِ گلِ نرگس، عصاے کور ہے

بزمِ[+] خوباں بس کہ، جوشِ جلوہ سے پُر نور ہے
پشتِ دستِ عجز یاں ہر برگِ نخلِ طور ہے

ہوں، تصور ہاے ہمدوشی سے، بدستِ شراب
حیرتِ آغوشِ خوباں[۱]، ساغرِ بلور ہے

ہے عجب مُردوں کو غفلت ہاے اہلِ دہر سے
سبزہ جوں انگشتِ حیرت در دہانِ گور ہے

حسرت[۲] آبادِ جہاں میں ہے الم، غم آفریں
نوحہ گویا خانہ زادِ نالۂ رنجور ہے

کیا کروں؟ غم ہاے پنہاں لے گئے صبر و قرار
دزد گر ہو خانگی، تو پاسباں معذور ہے

ہے زبا اُفتادگیِ نشّہ بیماری مجھے
بے[۳] سخن، تبخالۂ لب دانۂ انگور ہے

جس[۴] جگہ ہو مسند آرا جانشینِ مصطفےٰ
اُس[۵] جگہ تختِ سلیماں، نقشِ پاے مور ہے

واں[+ب] سے ہے تکلیفِ عرضِ بیدماغی، اور، اسدؔ
یاں صریرِ خامہ مجھ کو نالۂ رنجور ہے

ا۔ب یہ دو نہیں، اصل میں ایک ہی شعر ہے۔ ا کو بعد کی غزل میں بطور مقطع (ب) استعمال کیا گیا ہے، اسی لیے حاشیہ ق میں لکھا گیا مگر (ا) قلم زد ہونے سے رہ گیا۔ ص ۲۸۸ پر

۱۔ نخ = صافی

۲۔ " = ے درد ہے غم آفریں در حسرت آباد جہاں
ہاے ماتم خانہ، زادِ نالۂ رنجور ہے

۳۔ " = در نظر

۴۔ " = ہو جہاں اورنگ آرا

۵۔ " = واں اسد

+ یہ اشعار حاشیہ ق میں ہیں

○ ۱۸۱۶ء

سوختگاں کی خاک میں ریزشِ نقشِ داغ ہے — آئنہ[1] نشانِ حالِ مثلِ گلِ چراغ ہے
لطفِ خمارِ مے کو ہے در دلِ ہمدگر اثر — پنبۂ شیشۂ شراب کفِ بلبِ ایاغ ہے
مُفتِ صفائے طبع ہے، جلوۂ[2] نازِ سوختن — داغِ دلِ سیہ دلاں، مردمِ چشمِ زاغ ہے
رنجشِ یارِ مہرباں، عیش و طرب کا ہے نشاں — دل[3] سے اٹھے ہے جو غبار، گردِ سوادِ باغ ہے
شعر کی فکر کو، اسدؔ، چاہیے ہے دل و دماغ
وائے[4]! کہ یہ فسردہ دل، بے دل و بے دماغ ہے

رباعیات

ہر چند کہ دوستی میں کامل ہونا — ممکن نہیں یک زبان و یک دل ہونا
میں تجھ سے، اور مجھ سے تُو پوشیدہ — ہے مفت، نگاہ کا مقابل ہونا

بعد از اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال — ایّامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال
آپہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم — م اے عمرِ گزشتہ! یک قدم استقبال

۱۔ نخ = آئینۂ بساطِ ناز
۲۔ 〃 = شوخیِ عرضِ سوختن
۳۔ 〃 = ہے گردِ کدورتِ بتاں، مثلِ غبارِ باغ ہے
۴۔ 〃 = عذر

○ ۱۸۱۶ء

شبِ زُلف و رُخِ عَرَق فشاں کا غم تھا — کیا شرح کروں؟ کہ طُرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح[1] تلک — م ہر[2] قطرۂ اشک، دیدۂ پُر نم تھا

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی — بیتابیِ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن، اے تجلّی، افسوس! — م تکرار روا نہیں، تو تجدید سہی

سامانِ ہزار جستجو، یعنی، دل! — ساغر کشِ خونِ آرزو، یعنی دل
پشت و رخِ آئنہ ہے، دین و دنیا — منظور ہے دو جہاں سے تُو، یعنی دل

اے کاش! بتاں کا خنجرِ سینہ شگاف — پہلوے حیات سے گزر جاتا صاف
اک تسمہ لگا رہا کہ تا روزے چند — رہیے نہ مشقّتِ گدائی سے مُعاف

اے کثرتِ فہم بے شمار اندیشہ — ہے اصلِ خرد سے شرمسار اندیشہ
یک قطرۂ خون و دعوتِ صد نشتر — یک وہم و عبادتِ ہزار اندیشہ

۱۔ نخ = تا بہ سحر
۲۔ 〃 = ہے ہر قطرۂ اشکِ چشم، چشمِ نم تھا

○ ۱۸۱۶ء

بے گریہ کمالِ ترجبینی ہے مجھے　　در بزمِ وفا خجل نشینی ہے مجھے
محرومِ صدا رہا بغیر ازیک تار　　ابریشمِ ساز، موے چینی ہے مجھے

گر جوہرِ امتیاز ہوتا ہم میں　　رسوا کرتے نہ آپ کو عالم میں
ہیں نامِ ونگیں، کمیں گہِ نقبِ شعور　　یہ چور پڑا ہے خانۂ خاتم میں

ہے خلقِ حسد قماش لڑنے کے لیے　　وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لیے
یعنی، ہر بار صورتِ کاغذِ باد [۲]　　ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے

گلخن، شررِ اہتمام بستر ہے آج　　یعنی تبِ عشق شعلہ پرور ہے آج
ہوں وردِ ہلاکِ نامہ بر سے بیمار　　قارورہ مرا خونِ کبوتر ہے آج

۱۔ رخ = نقش

۲۔ ″ = ے جوں کاغذِ باد کو ہوا وجہِ ہوس

۱۸۱۷ء　تا　۱۸۲۱ء

حاشیہ

نسخۂ بھوپال

(بخطِ غالبؔ)

۱۸۱۶ء

نسخۂ بھوپال

(مشمولہ نسخۂ حمیدیہ)

۱۸۲۱ء

○ ۱۸۱۶ء

بے گریہ کمالِ ترجبینی ہے مجھے　　در بزمِ وفا خجل نشینی ہے مجھے
محرومِ صدا رہا بغیر از یک تار　　ابریشمِ ساز، موئے چینی ہے مجھے

گر جوہرِ امتیاز ہوتا ہم میں　　رسوا کرتے نہ آپ کو عالم میں
ہیں نامِ ونگیں، کمیں گہِ نقبِ شعور　　یہ چور پڑا ہے خانۂ خاتم میں

ہے خلقِ حسد قماش لڑنے کے لیے　　وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لیے
یعنی[۱]، ہر بار صورتِ کاغذِ باد　　[۲] ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے

گلخن، شررِ اہتمام بستر ہے آج　　یعنی تبِ عشق شعلہ پرور ہے آج
ہوں وردِ ہلاکِ نامہ بر سے بیمار　　قارورہ مرا خونِ کبوتر ہے آج

۱۔ رخ: = نقش

۲۔ ؍؍ = ہے جوں کاغذِ باد کو ہوا وجہِ ہوس

۱۸۱۷ء　تا　۱۸۲۱ء

حاشیہ

نسخۂ بھوپال

(بخطِ غالبؔ)

۱۸۱۶ء

نسخۂ بھوپال

(مشمولۂ نسخۂ حمیدیہ)

۱۸۲۱ء

○ ... بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں م بوسے کو پوچھتا ہوں میں، مُنہ سے مجھے بتا کہ یوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا؟ کہ بن کہے م اُس کے ہر ایک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے م آئے وہ یاں، خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں

+غیر سے رات کیا بنی؟ یہ جو کہا، تو دیکھیے م سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

بزم میں اُس کے روبرو، کیوں نہ خموش بیٹھیے؟ م اُسکی تو خامشی میں بھی، ہے یہی مُدّعا کہ یوں

میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی" م سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

+مجھ سے کہا جو یار نے "جاتے ہیں ہوش کس طرح؟" م دیکھ کے میری بیخودی، چلنے لگی ہوا کہ یوں

+کب مجھے کوے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی؟ م آئنہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

+گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال م موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

جو یہ کہے کہ "ریختہ کیونکے ہو رشکِ فارسی؟" م گفتۂ[1] غالب ایکبار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

وہ فراق اور وہ وصال کہاں؟ م وہ شب و روز و ماہ[2] و سال کہاں؟

فرصتِ کاروبارِ شوق کِسے؟ م ذوقِ نظّارۂ جمال کہاں؟

دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا م شورِ سودائے خطّ و خال کہاں؟

۱۔ نخ ۔ ہے شعر اسؔد کے ایک دو پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں
۲۔ " " اور وہ سال ...
+ یہ اشعار پہلے پہل حاشیہ ق میں درج ہوئے

○ ... بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

تھی[1] وہ اک شخص کے تصوّر سے م اب وہ رعنائیِ خیال کہاں؟

ایسا آساں نہیں لہو رونا م دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں؟

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق م واں جو جاویں، گرہ میں مال کہاں؟

فلکِ سِفلہ بے مُحابا ہے اس ستمگر کو انفعال کہاں؟

بوسے میں وہ مضایقہ نہ کرے پر مجھے طاقتِ سوال کہاں؟

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں م میں کہاں اور یہ وبال کہاں؟

مضمحل ہو گئے قویٰ، غالب م وہ عناصر میں اعتدال کہاں؟

وارستہ اس سے ہیں کہ محبّت ہی کیوں نہ ہو م کیجیے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا م ہے دل پہ بار، نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ م ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

"پیدا ہوئی ہے" کہتے ہیں "ہر درد کی دوا" م یوں ہو، تو چارۂ غمِ اُلفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالا نہ بیکسی نے کسی[2] سے معاملہ م اپنے سے کھینچتا ہوں، خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی، بجاے خود اک محشرِ خیال م ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال م حاصل نہ کیجیے دہر سے، عبرت ہی کیوں نہ ہو

۱۔ نخ ۔ ہے تھی وہ خوباں ہی کے تصوّر سے ۲۔ نخ ۔ کسو
٥ یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا

○ ... بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

وارستگی بہانۂ بیگانگی[1] نہیں م اپنے سے کر، نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو
مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی م عمرِ عزیز[2] صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اُس فتنہ خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو م

سمجھاؤ اُسے، یہ وضع چھوڑے — جو چاہے کرے، پہ دل نہ توڑے[3]
تقریر کا اس کی حال مت پوچھ — معنی ہیں بہت، تو لفظ تھوڑے
نذرِ مژہ کر دل و جگر کو — چھیرے ہی سے جائیں گے یہ پھوڑے
عاشق کو یہ چاہیے کہ ہرگز — اندوہ سے [ڈر کے] منھ نہ موڑے
آجا لبِ بام، کوئی کب تک — دیوار سے اپنے سر کو پھوڑے
جاتے ہیں رقیب کو خط اُس کے — کاغذ کے دوڑتے ہیں گھوڑے
غم خوار کو ہے قسم کہ زنہار ق — غالبؔ کو نہ تشنہ کام چھوڑے
حسرت زدۂ طرب ہے یہ شخص — دم جب کہ بہ وقتِ نزع توڑے
پانی نہ چوائے اس کے منھ میں — گُل مے میں بھگو بھگو نچوڑے

۱۔ نخ = سنگین دلی ۲۔ نخ = ہر چند عمر
۳۔ = یہ غزل نخ کے حاشیے پر کسی دوسرے کے قلم سے، درج ہے اس لیے اسے ۱۸۱۶ء کے بعد کے کلام میں رکھا گیا۔ مگر غزل کا اسلوب غالبؔ کے اسلوب سے میل نہیں کھاتا۔ اگر یہ غالبؔ ہی کا کلام ہے تو ابتدائی مشق کا نمونہ سمجھنا چاہیے کیونکہ بیس سال کی عمر تک غالبؔ کے فکر و فن کی توانائی ظاہر ہو چکی تھی۔

○ ... بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے م جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے م پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے
حال[5] آں کہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ م غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے
کی اس نے گرم، سینۂ اہلِ ہوس میں جا م آوے نہ کیوں پسند، کہ ٹھنڈا مکان ہے
کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟ م بس چپ رہو، ہمارے بھی منھ میں زبان ہے
بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں م فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے
ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا! م کس سے کہوں کہ "داغ"، جگر کا نشان ہے
ہے بارے، اعتمادِ وفاداری اس قدر م غالبؔ[1] ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

دلّی[2] کے رہنے والو، اسدؔ کو ستاؤ مت
بیچارہ، چند روز کا یاں[3] مہمان ہے

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے! م کیا ہوئی، ظالم، تری غفلت شعاری ہائے ہائے!
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ م تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے!
کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال؟ م دشمنی اپنی تھی، میری دوست داری ہائے ہائے!

۱۔ نخ = ہم بھی اسی
۲۔ " = دہلی
۳۔ " = یہ
۵ یہ اشعار پہلی بار متن ق میں درج ہوئے

○ ... بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا؟ م عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے!
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی م یعنی، تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے!
گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا؟ م خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے!
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں م ختم ہے الفت کی، تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے!
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی م اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے!
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا! م دل پہ اک لگنے نہ پایا، زخمِ کاری ہائے ہائے!
کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال؟ م ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے!
گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال م ایک دل تس پر یہ نا امیدواری ہائے ہائے!
عشق نے پکڑا نہ تھا، غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ م رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے!

گر مصیبت تھی، تو غربت میں اٹھا لیتا، اسدؔ
میری دلّی[۱] ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے!

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی م میری وحشت، تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلّق ہم سے م کچھ نہیں ہے، تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟ م اے وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی

۱۔ نخ = دہلی
▭ یہ شعر م میں موجود ہے

○ ... بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے م غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو م آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی
عمر، ہر چند کہ ہے برق خرام م دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں م نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے، اے فلکِ ناانصاف م آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو، ڈالیں گے م بے نیازی، تری عادت ہی سہی
یار[۱] سے چھیڑ چلی جائے، اسدؔ م گر نہیں وصل، تو حسرت ہی سہی

چاہیے اچھوں[۲] کو، جتنا چاہیے م یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے
صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر م جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے
دل تو ہوا اچھا، نہیں ہے گر دماغ کچھ تو اسبابِ تمنّا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل؟ م بارے، اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
چاک مت کر جیب بے ایّامِ گل م کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے
دوستی[*] کا پردہ ہے، بیگانگی م منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

۱۔ نخ = ے چھیڑ خوباں سے ...۔
۲۔ " = خوباں
* یہ شعر پہلی بار آخرِ ق میں اضافہ ہوا

○ ... بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

اپنی، رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی م یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے
دشمنی* نے میری کھویا غیر کو م کس قدر دشمن ہے؟ دیکھا چاہیے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید م نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے
چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد م قطعہ آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے
غافل[1] ان مہ طلعتوں کے واسطے م چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

پھر کچھ اک، دل کو بے قراری ہے م سینہ، جویائے زخم کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن م آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز م پھر وہی پردۂ عماری ہے
چشم، دلّالِ جنسِ رسوائی م دل، خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی م وہی صد گونہ اشکباری ہے
دل، ہوائے خرامِ ناز سے پھر م محشرستانِ بے قراری ہے
جلوہ، پھر عرضِ ناز کرتا ہے م روزِ بازارِ جانسپاری ہے
پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں م پھر وہی زندگی ہماری ہے
پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز م قطعہ گرم، بازارِ فوجداری ہے

۱۔ نخ = یعنی
* یہ شعر پہلی بار آخرِ ق میں اضافہ ہوا

○ ... بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر م زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال م ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر[1] ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب م اشک باری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا م آج پھر اُس کی روبکاری ہے
بے خودی بے سبب نہیں غالب م کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

مدت[2] ہوئی ہے، یار کو مہماں کیے ہوئے م جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع، پھر جگرِ لخت لخت کو م عرصہ ہوا ہے، دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم م برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے
پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفس م مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق م سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل م سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے
باہمدگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب م نظّارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے م پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

۱۔ نخ = ہورہے ہیں ۔۔۔۔۔۔ بے قراری کا ۔۔۔۔۔۔؟
۲۔ نخ = نخ میں اس غزل کے صرف ۱۳ شعر حاشیے میں درج ہیں۔ مطلع اور پہلے دو شعر پہلی بار آخرِ ق میں اضافہ ہوئے اور چوتھا شعر پہلی بار متن قا میں درج ہوا

○ ... بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب م عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے
دوڑے ہے پھر، ہر ایک گل و لالہ پر خیال م صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا م جاں نذرِ دلفریبیِ عُنواں کیے ہوئے
مانگے ہے پھر، کسی کو لبِ بام پر، ہوس م زُلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر، کسی کو مقابل میں، آرزو م سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے
اِک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے، پھر، نگاہ م چہرہ، فروغِ مَے سے گلستاں کیے ہوئے
پھر، جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں م سر زیرِ بارِ منّتِ درباں کیے ہوئے
جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن م بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے
غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے م بیٹھے ہیں ہم تہیّۂ طوفاں کیے ہوئے

بے اعتدالیوں سے سُبک سب میں ہم ہوئے م جتنے زیادہ ہو گئے، اُتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا، دام، سخت قریب آشیاں[1] کے م اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
ہستی ہماری، اپنی فنا[2] پر دلیل ہے م یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے
سختی کشانِ عشق کی، پوچھے ہے کیا خبر م وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی ؟ کہ دہر میں م تیرے سوا بھی، ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

۱۔ نخ = آشیانہ
۲۔ ″ = کی

○ ... بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں م ہر چند اُس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
اللہ رے! تیری تندیِ خو، جس کے بیم[1] سے م اجزائے نالہ، دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے
اہلِ ہوس کی فتح ہے، ترکِ نبردِ عشق م جو پاؤں اُٹھ گئے، وہی اُن کے عَلَم ہوئے
نالے، عدم میں، چند ہمارے سپُرد تھے[5] م جو واں نہ کھنچ سکے، سو وہ یاں آ کے دم ہوئے
چھوڑی، اسدؔ، نہ ہم نے گدائی میں دل لگی م سائل ہوئے، تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی م لکھ دیجیو[2]، یارب، اُسے قسمت میں عدو کی
اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصوّر م دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی
کیوں ڈرتے ہو عشّاق کی بے حوصلگی سے؟ م یاں[3] تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی
اے بے خبراں، میرے لبِ زخمِ جگر پر م بخیہ جسے کہتے ہو شکایت ہے رفو کی
گو زندگیِ زاہدِ بے چارہ عبث ہے م اتنا ہے[4] کہ رہتی تو ہے تدبیر وضو کی
صد حیف! وہ ناکام کہ اک عمر سے، غالبؔ م حسرت میں رہے، ایک بتِ عربدہ جو کی
دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو م خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

۱۔ نخ = وہم
۲۔ ″ = یارب اسے لکھ دیجیو . . . . . .
۳۔ ″ = صاحب
۴۔ ″ = اتنا تو ہے
٥ یہ شعر پہلی بار متن قا میں درج ہوا

○ ... بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

روُنے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے م دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے
صرفِ بہاے مَے ہوے، آلاتِ میکشی م تھے یہ ہی دو حساب، سو یوں پاک ہو گئے
رسواے دہر گو ہوے، آوارگی سے، تم م بارے، طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے
کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر؟ م پردے میں گل کے، لاکھ جگر چاک ہو گئے
پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا؟ م آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے
کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا، ہم گلہ م کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے
پوچھے ہے کیا معاشِ جگر تفتگانِ عشق جوں شمع، آپ اپنی وہ خوراک ہو گئے
اس رنگ سے اُٹھائی کل اُس نے اسدؔ کی نعش[۲] م دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

قصائد

○ ... ۱۸۲۱ء

(۱)[۱]

سازِ یک ذرّہ نہیں فیضِ چمن سے، بے کار[۳] م سایۂ لالۂ بے داغ، سُوَیداے بہار
مستیِ بادِ صبا سے ہے، بہ عرضِ سبزہ م ریزۂ شیشۂ مے، جوہرِ تیغِ کُہسار

۱۔ نخ = میں، ہم
۲۔ نخ = لاش
= اِس غزل کا پانچواں شعر م میں موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ساتویں شعر کو جو قا کے متن میں ہے، منسوخ کر کے رکھا گیا ہو۔ تاہم میری راے میں دونوں اشعار کی جُداگانہ حیثیت ہے، اس لیئے دونوں ہی برقرار رکھے گئے
۱۔ ق = عنوان ہے "قصیدۂ حیدری بہ تمہیدِ بہارِ معفرت"

○ ... ۱۸۲۱ء

سنگ، یہ کارگہِ ربطِ نزاکت ہے، کہ ہے خندۂ بے خودیِ کبک، بدندانِ شرار
سبز ہے جامِ زُمرّد کی طرح، داغِ پلنگ م تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روے شرار
کشتۂ افعیِ زلفِ سیہِ شیریں کو بے ستوں سبزے سے ہے سنگِ زُمرّد کا مزار
حسرتِ جلوۂ ساقی ہے کہ ہر پارۂ ابر سینہ، بے تابی سے ملتا ہے بہ تیغِ کہسار
دشمنِ حسرتِ عاشق ہے، رگِ ابرِ سیاہ جس نے برباد کیا ریشۂ چندیں شبِ تار
مستیِ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت م کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار
کوہ و صحرا ہمہ، معموریِ شوقِ بلبل م راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار
چشم بر چشم چُنے ہے بہ تماشا، مجنوں ہر دو سو خانۂ زنجیر، نگہ کا بازار
خانۂ تنگ، ہجومِ دو جہاں کیفیت جامِ جمشید ہے یاں قالبِ خشتِ دیوار
سونپے ہے فیض ہوا صورتِ مژگانِ یتیم م سر نوشتِ دو جہاں ابر، بیک سطرِ غبار
کفِ ہر خاک بگردوں شدہ، قمری پرواز م دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ، طاؤس شکار
سنبل و دامِ کمیں خانۂ خوابِ صیّاد نرگس و جامِ سیہ مستیِ چشمِ بیدار
طرّہ ہا بس کہ، گرفتارِ صبا ہیں، شانہ زانوے آئنہ پر مارے ہے دستِ بے کار
بس کہ یک رنگ ہوا کرتی ہے ایجادِ نسیم لالے کے داغ سے، جوں نقطہ و خط سنبل زار
اے خوشا! فیضِ ہواے چمن نشو و نما بادہ پُرزور و نفس مست و مسیحا بیمار
کاٹ کر پھینکیے ناخن، تو بہ اندازِ ہلال م قوتِ نامیہ اُس کو بھی نہ چھوڑے بیکار
ہمت و نشو و نما میں یہ بلندی ہے کہ سرو پرِ قمری سے کرے صیقلِ تیغِ کُہسار

○ ... ۱۸۲۱ء

ہر کفِ خاک، جگر تشنۂ صد رنگ ظہور   غنچے کے میکدے میں مستِ تامّل ہے بہار
کس قدر عرض کروں ساغرِ شبنم، یارب؟   موجۂ سبزۂ نوخیز، ہے لبریزِ خمار
غنچۂ لالہ سیہ مستِ جوانی ہے ہنوز   شبنمِ صبح، ہوئی رعشۂ اعضائے بہار
جوشِ بیدادِ تپش سے ہوئی عریاں آخر   شاخِ گلبن پہ، صبا، چھوڑ کے پیراہنِ خار
سازِ عریانیِ کیفیّتِ دل ہے، لیکن   یہ مئے تند، نہیں موجِ خرامِ اظہار
موجِ مے پر ہے، براتِ نگرانیِ اُمیّد   گلِ نرگس سے کفِ جام پہ ہے چشمِ بہار
گلشن و میکدہ، سیلابیِ یک موجِ خیال   نشۂ و جلوۂ گل، بر سرِ ہم فتنۂ غبار
میکدے میں ہو، اگر، آرزوئے گل چینی   م   بھول جا یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار
موجِ گل ڈھونڈھ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ   م   گم کرے، گوشۂ میخانہ میں گر تو، دستار
پشتِ لب، تہمتِ خط کھینچے ہے بے جا یعنی   سبز ہے موجِ تبسّم بہ ہوائے گفتار
کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر   م   سبز، مثلِ خطِ نوخیز، ہو خطِّ پرکار
جائے حیرت ہے کہ گلبازیِ اندیشۂ شوق   اس زمیں میں نہ کرے سبز قلم کی رفتار

مطلعِ ثانی

لعل سی، کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ[1]   م   طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

۱۔ ق = مطلعِ ثانی کی شکل اصلاً یوں تھی ؎
لعل سی کی ہے بہ مدحِ چمن آرائے بہار

○ ... ۱۸۲۱ء

کسوتِ تاک میں ہے نشّۂ ایجادِ ازل   سُبحۂ عرضِ دو عالم، بکفِ آبلہ دار
بہ نظرگاہِ گلستانِ خیالِ ساقی   بیخودی، دامِ رگِ گل سے ہے پیمانہ شکار
بہ ہوائے چمنِ جلوہ، ہے طاؤس پرست   باندھے ہے بیرِ فلک موجِ شفق سے زنّار
یک چمن جلوۂ یوسف ہے بچشمِ یعقوب   لالہ ہا داغ برافگندہ، و گل ہا بے خار
بیضۂ قمری کے آئینے میں پنہاں صیقل   سروِ بیدل سے عیاں، عکسِ خیالِ قدِ یار
عکسِ موجِ گُل و سرشاریِ اندازِ حباب   نگہِ آئنہ، کیفیّتِ دل ہے دوچار
کس قدر سازِ دو عالم کو ملی جرأتِ ناز   کہ ہوا، ساغرِ بے حوصلۂ دل، سرشار
ورنہ وہ ناز ہے، جس گلشنِ بیداد سے تھا   طور، مشعل بکف از جلوۂ تنزیہِ بہار
سایۂ تیغ کو دیکھ اس کے، بہ ذوقِ یک زخم   سینۂ سنگ پہ کھینچے ہے الف، بالِ شرار
بت کدہ، بہرِ پرستش گریِ قبلۂ ناز   باندھے زنّارِ رگِ سنگ، میانِ کہسار
سُبحہ گرداں ہے اسی کی کفِ امید کا، ابر   بیم سے جس کے، صبا، توڑے ہے صد جا زنّار
رنگریزِ گل و جامِ دو جہاں ناز و نیاز   اولیّں دورِ امامت، طربِ ایجادِ بہار
جوشِ طوفانِ کرم، ساقیِ کوثر ساغر   نُہ فلک، آئنۂ ایجادِ کفِ گوہر بار
پہنے ہے پیرہنِ کاغذِ ابریِ نیساں   یہ تُنک مایہ، ہے فریادیِ جوشِ ایثار
وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیرِ سرا   م   چشمِ جبریل، ہوئی قالبِ خشتِ دیوار
فلک العرش، ہجومِ خمِ دوشِ مزدور   م   رشتۂ فیضِ ازل، سازِ طنابِ معمار
سبزۂ نُہ چمن، و یک خطِ پشتِ لبِ بام   م   رفعتِ ہمتِ صد عارف، و یک اوجِ حصار

○ ... ۱۸۲۱ء

واں کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ م | وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بے زار

پرِ یہ دولت، تھی نصیبِ نگہِ معنیِ ناز | کہ ہوا صورتِ آئینہ میں، جوہرِ بیدار

ذرّہ اس گرد کا خرشید کو، آئینۂ ناز م | گرد اس دشت کی، امید کو، احرامِ بہار

خاکِ صحرائے نجف، جوہرِ سیرِ عُرفا م | چشمِ نقشِ قدم، آئینۂ بختِ بیدار

اے خوشا! مکتبِ شوق و بلدستانِ مراد | سبقِ نازکی، ہے عجز کو صد جا تکرار

مشقِ نقشِ قدم، نسخۂ آبِ حیواں | جادۂ دشتِ نجف، عمرِ خضر کا طومار

جلوہ تمثال ہے، ہر ذرّۂ نیرنگ سواد | بزمِ آئینۂ تصویر نما، مشتِ غبار

دو جہاں طالبِ دیدار تھا، یارب کہ ہنوز | چشمکِ ذرّہ سے ہے گرم، نگہ کا بازار

ہے، نفس، مایۂ شوقِ دو جہاں ریگِ رواں | پائے رفتار کم، و حسرتِ جولاں بسیار

آفرینش کو ہے، واں سے طلبِ مستیِ ناز م | عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار

دشتِ الفت چمن، و آبلہ مہماں پرور | دلِ جبریل، کفِ پا پہ ملے ہے رخسار

یاں تک انصاف نوازی کہ اگر ریزۂ سنگ | بے خبر دے بکفِ پائے مسافر آزار

یک بیاباں تپشِ بالِ شرر سے، صحرا | مغزِ کہسار میں کرتا ہے فرو، نشترِ خار

فرش اس دشتِ تمنا میں نہ ہوتا، گر، عدل | گرمیِ شعلۂ رفتار سے جلتے خس و خار

ابرِ نیساں سے ملے موجِ گہر کا تاواں | خلوتِ آبلہ میں گم کرے، گر تو، رفتار

یک جہاں بسملِ اندازِ پرافشانی ہے | دام سے اُس کے، قضا کو ہے رہائی دشوار

موجِ طوفانِ غضب، چشمۂ چرخِ حباب | ذوالفقارِ شہِ مرداں، خطِ قدرت آثار

○ ... ۱۸۲۱ء

موجِ ابروئے قضا، جس کے تصوّر سے دو نیم | بیم سے جس کے، دلِ شحنۂ تقدیر فگار

شعلۂ تحریر سے اس برق کی، ہے کلکِ قضا | بالِ جبریل سے مسطر کشِ سطرِ زنہار

موجِ طوفاں ہو، اگر خونِ دو عالم ہستی | ہے حنا کو سرِ ناخن سے گزرنا دشوار

دشتِ تسخیر ہو، گر گردِ خرامِ دُلدُل | نعلِ در آتشِ ہر ذرّہ ہے، تیغِ کہسار

بالِ رعنائیِ دُم، موجۂ گلبندِ قبا | گردشِ کاسۂ سُم، چشمِ پری آئنہ دار

گردِ رہ اُس کی بھریں شیشۂ ساعت میں اگر | ہر نفس راہ میں لوٹے، نفسِ لیل و نہار

نرم رفتار ہو جس کوہ پہ وہ برق گداز | رفتنِ رنگِ حنا ہے، تپشِ بالِ شرار

ہے سراسر رویِ عالمِ ایجاد اُسے | جیبِ خلوت کدۂ غنچہ میں، جولانِ بہار

جس کے حیرت کدۂ نقشِ قدم میں، مانی | خونِ صد برق سے باندھے بکفِ دست نگار

ذوقِ تسلیمِ تمنّا سے بہ گلزارِ حضور | عرضِ تسخیرِ تماشا سے بہ دامِ اظہار

مطلعِ تازہ ہوا موجۂ کیفیّتِ دل[1] | جامِ سرشارِ مے و غنچۂ لبریزِ بہار

مطلعِ ثالث

فیض سے تیرے ہے، اے شمعِ شبستانِ بہار م | دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلزار

شکلِ طاؤس کرے، آئنہ خانہ پرواز م | ذوق میں جلوے کے تیرے بہ ہوائے دیدار

---

[1] ق: پورا عنوان یہ ہے "مطلعِ ثالث فی المدح الحاضر"

○ ... ۱۸۲۱ء

گردِ جولاں سے ہے تیری، بگریبانِ خرام   جلوۂ طور، نمک سودۂ زخمِ تکرار
جس چمن میں ہو، ترا جلوۂ محرم نواز   پرِ طاؤس، کرے گرم نگہ کا بازار
جس ادب گاہ میں تو آئنۂ شوخی ہو   جلوہ، ہے ساقیِ مخموریِ تابِ دیوار
تو وہ ساقی ہے کہ ہر موجِ محیطِ نیرنگ   کھینچے خمیازے میں تیرے لبِ ساغر کا خمار
گرد باد آئنہ فتراکِ دماغِ دل ہا   تیرا صحرائے طلب، محفلِ پیمانہ شکار
ذوقِ بے تابیِ دیدار سے تیرے ہے ہنوز   جوشِ جوہر سے دلِ آئنہ، گلدستۂ خار
تیری اولاد کے غم سے ہے، بروئے گردوں   م   سلکِ اختر میں مہِ نو، مژۂ گوہر بار
مدح میں تیری نہاں، زمزمۂ نعتِ نبی   م   جام سے تیرے عیاں، بادۂ جوشِ اسرار
ہم عبادت کو، ترا نقشِ قدم، مُہرِ نماز   م   ہم ریاضت کو، ترے حوصلے سے استظہار
تیرا پیمانۂ مے، نسخۂ ادوارِ ظہور   تیرا نقشِ قدم، آئینۂ شانِ اظہار
آیتِ رحمتِ حق، بسملۂ مصحفِ ناز   مسطرِ موجۂ دیباچۂ درسِ اسرار
قبلۂ نورِ نظر، کعبۂ اعجازِ مسیح   مژۂ دیدۂ نخچیر سے، نبضِ بیمار
تہمتِ بےخودیِ کفر نہ کھینچے، یارب   کمیِ ربطِ نیاز، وخطِ نازِ بسیار
ناز پروردۂ صد رنگِ تمنا ہوں، ولے   پرورش پائی ہے، جوں غنچہ، بہ خونِ اظہار
تنگیِ حوصلہ، گردابِ دو عالم آداب   دید یک غنچہ سے ہوں بسملِ نقصانِ بہار
رشکِ نظارہ تھی یک برقِ تجلی کہ ہنوز   تشنۂ خونِ دو عالم ہوں، بہ عرضِ تکرار
وحشتِ فرصتِ یک جیبِ کشش نے کھویا   صورتِ رنگِ حنا، ہاتھ سے دامانِ بہار

○ ... ۱۸۲۱ء

شعلہ آغاز، ولے حیرتِ داغِ انجام   موجِ مے لیک زسر تا قدم آغوشِ خمار
ہے اسیرِ ستمِ کشمکشِ دامِ وفا   دلِ وارستۂ ہفتاد و دو ملت بیزار
مژۂ خواب سے کرتا ہوں، بآسایشِ درد   بخیۂ زخمِ دلِ چاک، بہ یک دستہ شرار
محرمِ دردِ گرفتاریِ مستی معلوم   ہوں نفس سے، صفتِ نغمہ، بہ بندِ رگِ تار
تھا سرِ سلسلہ جنبانیِ صد عمرِ ابد   ساز ہا مفت، بہ ریشم کدۂ نالۂ زار
لیکن اس رشتۂ تحریر میں سرتاسرِ فکر   ہوں، بہ قدرِ عددِ حرفِ علی سبحہ شمار
جوہرِ دستِ دعا آئنہ، یعنی تاثیر   م   یک طرف نازشِ مژگان، و دگر سو غمِ خار
مردمک سے، ہو عزا خانۂ اقبالِ نگاہ   م   خاکِ در کی ترے، جو چشم، نہ ہو آئنہ دار
دشمنِ آلِ نبیؐ کو، بطرب خانۂ دہر   م   عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو، طاقِ دیوار
دوست اس سلسلۂ ناز کے، جوں سنبل و گل   ابرِ میخانہ کریں ساغرِ خورشید شکار
لنگرِ عیش پہ سرشارِ تماشائے دوام   کہ رہے خونِ خزاں سے بہ حنا پائے بہار
زلفِ معشوق کشش، سلسلۂ وحشتِ ناز   دلِ عاشق، شکن آموزِ خمِ طرّۂ یار
مے تمثالِ پری، نشۂ مینا آزاد   دلِ آئینہ طرب، ساغرِ بختِ بیدار
دیدِ تا دل، اسدؔ آئینۂ یک پرتوِ شوق   م   فیضِ معنی سے، خطِ ساغرِ راقم سرشار

(۲)

دہر، جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں م ہم کہاں ہوتے، اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں ؟
توڑے[1] ہے عجزِ تنک حوصلہ بر روئے زمیں سجدۂ تمثال وہ آئینہ، کہیں جس کو جبیں
توڑے ہے نالہ، سرِ رشتۂ پاسِ انفاس سر کرے ہے دلِ حیرت زدہ، شغلِ تسکیں
بے دلی ہائے تماشا، کہ نہ عبرت ہے، نہ ذوق م بیکسی ہائے تمنا، کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے، نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم م لغو ہے آئنۂ فرقِ جنون و تمکیں
یاس، تمثالِ بہار آئنۂ استغنا وہم، آئینۂ پیدائیِ تمثالِ یقیں
خوں ہوا، جوشِ تمنا سے، دو عالم کا دماغ بزمِ یاس آں سوئے پیدائیِ واخفا رنگیں
مثلِ مضمونِ وفا، باد بدستِ تسلیم م صورتِ نقشِ قدم، خاک بہ فرقِ تمکیں
خانہ ویرانیِ امید و پریشانیِ بیم جوشِ دوزخ، ہے خزانِ چمنِ خلدِ بریں
لافِ دانش غلط، و نفعِ عبادت معلوم م دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دنیا، وچہ دیں
بادِ افسانۂ بیمار ہے، عیسیٰ کا نفس استخواں ریزۂ موراں ہے، سلیماں کا نگیں
نقشِ معنی ہمہ، خمیازۂ عرضِ صورت م سخنِ حق ہمہ، پیمانۂ ذوقِ تحسیں
عشق، بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس م وصل، زنگارِ رخِ آئنۂ حسنِ یقیں
کوہ کن، گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب م بے ستوں، آئنۂ خوابِ گرانِ شیریں

[1] یہ مطلع بعد کا اضافہ ہے اور بقول مولانا عرشی، پہلے پہل قبا کے حاشیے میں درج ہوا لہ ق ۔ اس کا عنوان ہے " ایضاً د قصیدۂ حیدری ع فی المنقبت "

موجِ خمیازۂ یک نشّہ، چہ اسلام، وچہ کفر کجیِ یک خطِ مسطر، چہ توہّم، چہ یقیں
قبلہ و ابروئے بُت، یک رہِ خوابیدۂ شوق کعبہ و بت کدہ، یک محملِ خوابِ رنگیں
کس نے دیکھا، نفسِ اہلِ وفا آتش خیز؟ م کس نے پایا، اثرِ نالۂ دل ہائے حزیں ؟
عیشِ بسمل کدۂ عیدِ حریفاں معلوم خوں ہو آئینہ، کہ ہو جامۂ طفلاں رنگیں
سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں، لیکن م نہ سر و برگِ ستائش، نہ دماغِ نفریں
نزع مخمور ہوں اُس دید کی دُھن میں کہ مجھے رشتۂ سازِ ازل ہے، نگہِ بازپسیں
حیرت، آفت زدۂ عرضِ دو عالم نیرنگ مومِ آئینۂ ایجاد ہے، مغزِ تمکیں
وحشتِ دل سے پریشاں ہیں، چراغانِ خیال باندھوں ہوں آئنے پر چشمِ پری سے آئیں
کوچہ دیتا ہے پریشاں نظری پر، صحرا رمِ آہو کو ہے ہر ذرّے کی چشمک میں کمیں
چشمِ امید سے گرتے ہیں، دو عالم جوں اشک یاس بہ پیمانہ کشِ گریۂ مستانہ نہیں
کس قدر فکر کو ہے نالِ قلم موئے دماغ کہ ہوا خوں نگہِ شوق میں نقشِ تمکیں
عذرِ لنگ، آفتِ جولانِ ہوس ہے، یارب جل اُٹھے گرمیِ رفتار سے، پائے چوبیں
نہ تمنا، نہ تماشا، نہ تحیّر، نہ نگاہ گردِ جوہر میں ہے، آئنۂ دل پردہ نشیں
کھینچوں ہوں آئنے پر خندۂ گل سے مسطر نامہ، عنوانِ بیانِ دلِ آزردہ نہیں
رنجِ تعظیمِ مسیحا نہیں اٹھتا مجھ سے درد ہوتا ہے مرے دل میں، جو توڑوں بالیں
بس کہ گستاخیِ اربابِ جہاں سے ہوں ملول پرِ پروانہ، مری بزم میں ہے خنجرِ کیں
اے عبارت، تجھے کس خط سے ہے درسِ نیرنگ اے نگہ، تجھ کو ہے کس نقطے میں مشقِ تسکیں؟

○ ... ۱۸۲۱ء

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ! م یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں

جلوۂ ریگسِ رواں دیکھ کے گردوں ہر صبح خاک پر توڑے ہے آئینۂ نازِ پرویں

شورِ اوہام سے مت ہو شبِ خونِ انصاف گفتگو بے مزہ، و زخمِ تمنّا نمکیں

ختم کر ایک اشارت میں عباراتِ نیاز جوں مہِ نو، ہے نہاں گوشۂ ابرو میں جبیں

نقش "لاحول" لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر م "یا علی" عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

معنیِ لفظِ کرم، بسملۂ نسخۂ حسن قبلۂ اہلِ نظر، کعبۂ اربابِ یقیں

جلوہ رفتارِ سرِ جادۂ شرعِ تسلیم نقشِ پا جس کا ہے توحید کو معراجِ جبیں

کس سے ممکن ہے تری مدح، بغیر از واجب؟ م شعلۂ شمع، مگر شمع پہ باندھے آئیں

ہو، وہ سرمایۂ ایجاد، جہاں گرمِ خرام م ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں

مظہرِ فیضِ خدا، جان و دلِ ختمِ رسُل م قبلۂ آلِ نبیؐ، کعبۂ ایجادِ یقیں

نسبتِ نام سے اُس کے ہے یہ رتبہ کہ رہے م اَبَداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں

جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اس کا جس جا م وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

فیضِ خلق اُس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا م بوئے گُل سے نَفَسِ بادِ صبا عطر آگیں

بُرّشِ تیغ کا اُس کی، ہے جہاں میں چرچا م قطع ہو جائے نہ، سر رشتۂ ایجاد کہیں

کوہ کو، بیم سے اُس کے ہے جگر باختگی نہ کرے نذرِ صدا، ورنہ، متاعِ تمکیں

کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے م رنگِ عاشق کی طرح، رونقِ بت خانۂ چیں

وصفِ دُلدُل، ہے مرے مطلعِ ثانی کی بہار جنّتِ نقشِ قدم سے ہوں، ہیں اس کی گلچیں

○ ... ۱۸۲۱ء

مطلع[1]

گردِ رہ، سرمہ کشِ دیدۂ اربابِ یقیں نقشِ ہر گام، دو عالم صفہانِ زیرِ نگیں

برگِ گل کا، ہو جو طوفانِ ہوا میں عالم اُس کے جولاں میں نظر آئے ہے یوں دامنِ زیں

اُس کی شوخی سے بہ حیرت کدۂ نقشِ خیال فکر کو حوصلۂ فرصتِ ادراک نہیں

جلوۂ برق سے ہو جائے نگہ، عکس پذیر اگر آئینہ بنے حیرتِ صورت گرِ چیں

جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا! م وصّیِ[2] ختمِ رُسُل تو ہے، بفتوائے یقیں

ذوقِ گلچینیِ نقشِ کفِ پا سے تیرے عرش چاہے ہے کہ ہو درپہ ترے خاک نشیں

تجھ میں اور غیر میں نسبت ہے، ولیکن بہ تضاد وصیِ ختمِ رُسُل تو ہے باثباتِ یقیں

جسمِ اطہر کو ترے، دوشِ پیمبر، منبر م نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش، نگیں

تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جاں، کام و زباں م تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم، دست و جبیں

آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ م رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں

تیرے در کے لیئے اسبابِ نثار آمادہ م خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں

دادِ دیوانگیِ دل کہ ترا مدحت گر ذرّے سے باندھے ہے خُرشیدِ فلک پر آئیں

کس سے ہو سکتی ہے مدّاحیِ ممدوحِ خدا؟ م کس سے ہو سکتی ہے آرایشِ فردوسِ بریں؟

۱۔ ق = مطلعِ ثانی

۲۔ " = اصلاً یہاں مصرعِ ثانی یہ تھا ہے کہ تجھ سے ہے بہارِ چمنستانِ یقیں ۔ "وصیِ ختمِ رسُل..." والا مصرع اس سے آگے کا ایک شعر چھوڑ کر آتا ہے ۔ ملاحظہ کیجیے ۔

جنسِ[1] بازارِ معاصی، اسداللہ اسدؔ　م　کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب　م　ہے ترے حوصلۂ فضل پر از بس کہ، یقیں

دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول　م　کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار "آمیں"

غمِ شبیرؑ سے ہو سینہ یہاں تک لبریز　م　کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

طبع کو، الفتِ دُلدُل میں، یہ سرگرمیِ شوق　م　کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں

دلِ الفت نسب، و سینۂ توحید فضا　م　نگہِ جلوہ پرست، و نفسِ صدق گزیں

صرفِ اعدا، اثرِ شعلہ و دودِ دوزخ　م　وقفِ احباب، گل و سنبلِ فردوسِ بریں

(۳)

ؔ بہ گمانِ قطعِ زحمت نہ دوچارِ خامشی ہو　　کہ زبانِ سرمہ آلود، نہیں تیغِ اصفہانی

بہ فریبِ آشنائی، بہ خیالِ بے وفائی　　نہ رکھ آپ سے تعلق، مگر ایک بدگمانی

نظرے سوئے کہستاں نہیں غیرِ شیشہ ساماں　　جو گدازِ دل ہو مطلب، تو چمن ہے سنگ جانی

بہ فراز گاہِ عبرت، چہ بہار و کو تماشا؟　　کہ نگاہ ہے سیہ پوش بہ عزائے زندگانی

بہ فراقِ رفتہ یاراں، خط و حرف، مو پریشاں　　دلِ غافل از حقیقت ہمہ ذوقِ قصہ خوانی

ا۔ ق: یا علیؑ جنسِ معاصی......

ؔ اس قصیدے کے کل ۲۹ اشعار ہیں سے تین شعر غزل (دے جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی) کے طور پر الگ سے متداول دیوان میں درج ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ قصیدہ اب ۲۶ اشعار پر مشتمل ہے۔

تپشِ دلِ شکستہ، پئے عبرت آگہی ہے　　کہ نہ دے عنانِ فرصت بہ کشاکشِ زبانی

نہ وفا کو آبرو ہے، نہ جفا تمیز جُو ہے　　چہ حسابِ جانفشانی؟ چہ غرورِ دلستانی؟

بہ شکنجِ جستجو ہا، بہ سرابِ گفتگو ہا　　تگ و تازِ آرزو ہا، بہ فریبِ شادمانی

نہیں شاہراہِ اوہام، بجز آں سُوئے سیدن　　تری سادگی ہے، غافل، درِ دل پہ پاسبانی

چہ امید و ناامیدی؟ چہ نگاہ و بے نگاہی؟　　ہمہ عرضِ ناشکیبی؟ ہمہ سازِ جاں ستانی

اگر آرزو ہے راحت، تو عبث بہ خوں تپیدن　　کہ خیال ہو تعب کش بہ ہوائے کامرانی

شر و شورِ آرزو سے تب و تابِ عجز بہتر　　نہ کرے اگر ہوس پر، غمِ بیدلی، گرانی

ہوسِ فروختن ہا، تب و تابِ سوختن ہا　　سرِ شمع نقشِ پا ہے۔ بسپاسِ ناتوانی

شررِ اسیرِ دل کو ملے اوجِ عرضِ اظہار　　جو بہ صورتِ چراغاں کرے، شعلہ نردبانی

ہوئے مشقِ جرأتِ ناز، رہ و رسمِ طرحِ آداب　　خمِ پشت خوشنما تھا بہ گزارشِ جوانی

اگر آرزو رسا ہو، پئے دردِ دل دوا ہو　　وہ اجل کہ خوں بہا ہو، بہ شہیدِ ناتوانی

غمِ عجز کا سفینہ بہ کنارِ بیدلی ہے　　مگر ایک شہپرِ مور کرے سازِ بادبانی

مجھے انتعاشِ غم نے پئے عرضِ حال بخشی　　ہوسِ غزل سرائی، تپشِ فسانہ خوانی

دلِ ناامید کیونکر بہ تسلی آشنا ہو　　جو امیدوار رہیے، نہ بہ مرگِ ناگہانی

مجھے بادۂ طرب سے بہ خمارگاہِ قسمت　　جو ملی تو تلخ کامی، جو ہوئی تو سرگرانی

نہ ستم کر اب تو مجھ پر کہ وہ دن گئے کہ ہاں تھی　　مجھے طاقت آزمائی، تجھے الفت آزمائی

○ ... ۱۸۲۱ء

بہ ہزار امیدواری رہی ایک اشک باری — نہ ہوا حصولِ زاری، بجز آستیں فشانی

کروں عذرِ ترکِ صحبت سو کہاں وہ بیدماغی؟ — نہ غرورِ میرزائی، نہ فریبِ ناتوانی

ہمہ یک نفس تپش سے تب و تابِ ہجرت پوچھ — کہ ستم کشِ جنوں ہوں نہ بقدرِ زندگانی

کفِ موجۂ حیا ہوں بہ گزارِ عرضِ مطلب — کہ سرشکِ قطرہ زن ہے بہ پیامِ دل رسانی

یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالبؔ
کروں خوانِ گفتگو پر دل و جاں کی میہمانی

غزلیات

عالم، جہاں بعرضِ بساطِ وجود تھا — جوں صبح، چاکِ جیب مجھے تار و پود تھا

بازی خورِ فریب ہے، اہلِ نظر کا ذوق — ہنگامہ گرمِ حیرتِ بود و نمود تھا

عالم، ○ طلسمِ شہرِ خموشاں ہے سر بسر — یا میں غریبِ کشورِ گفت و شنود تھا

جز قیسؔ، اور کوئی نہ آیا بروئے کار م صحرا، مگر، بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست م ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

تھا خواب میں، خیال کو تجھ سے معاملہ م جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا، نہ سود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن، اسدؔ م سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

○ یہ شعر پہلے پہل متن قا میں درج ہوا

○ ... ۱۸۲۱ء

تنگیِ رفیقِ رہ تھی، عدم یا وجود تھا — میرا سفر بہ طالعِ چشمِ حسود تھا

تو یک جہاں قماشِ ہوس جمع کر، کہ میں — حیرت متاعِ عالمِ نقصان و سود تھا

گردش محیطِ ظلم رہا جس قدر، فلک — میں پائمالِ غمزۂ چشمِ کبود تھا

پوچھا تھا گرچہ یار نے احوالِ دل، مگر — کس کو دماغِ منّتِ گفت و شنود تھا

لیتا ہوں، مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز م لیکن یہی کہ "رفت" گیا اور "بود" تھا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی م میں، ورنہ، ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

خور، شبنم آشنا نہ ہوا، ورنہ میں، اسدؔ
سر تا قدم گزارشِ ذوقِ سجود تھا

کہتے ہو: "نہ دیں گے ہم" دل اگر پڑا پایا م دل کہاں کہ گم کیجے؟ ہم نے مدّعا پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا م آپ سے کوئی پوچھے "تم نے کیا مزا پایا؟"

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب؟ — ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

بے دماغِ خجلت ہوں رشکِ امتحاں تا کے؟ — ایک بیکسی، تجھ کو عالم آشنا پایا

سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری م حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

خاکبازیِ امید، کارخانۂ طفلی — یاس کو دو عالم سے لب بخندہ وا پایا

کیوں نہ وحشتِ غالبؔ باج خواہِ تسکیں ہو؟
کشتۂ تغافل کو خصمِ خوں بہا پایا

○ ... ۱۸۲۱ء

عشق سے طبیعت نے، زیست کا مزا پایا م درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل م خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا
فکرِ نالہ میں، گویا، حلقہ ہوں زسر تا پا عضو عضو، جوں زنجیر، یک دلِ صدا پایا
حالِ دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر یعنی م ہم نے بارہا ڈھونڈھا، تم نے بارہا پایا
شب نظارہ پرور تھا خواب میں خرام اُس کا صبح، موجۂ گل کو نقشِ بوریا پایا
جس قدر جگر خوں ہو، کوچہ دادنِ گل ہے زخمِ تیغِ قاتل کو طرفہ دلکشا پایا
ہے نگیں کی پاداری، نامِ صاحبِ خانہ ہم سے تیرے کوچے نے، نقشِ مدّعا پایا
دوستدارِ دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم م آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

نَے اسدؔ جفا سائل، نَے ستم جنوں مائل
تجھ کو جس قدر ڈھونڈھا، الفت آزما پایا

کارخانے سے جنوں کے بھی، میں عریاں نکلا میری قسمت کا نہ ایک آدھ گریباں نکلا
ساغرِ جلوۂ سرشار ہے، ہر ذرّۂ خاک شوقِ دیدار بلا آئنہ ساماں نکلا
زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی، یارب! م تیر بھی سینۂ بسمل سے پَر افشاں نکلا
بوے[1] گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل م جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا
کچھ کھٹکتا تھا مرے سینے میں لیکن آخر جس کو دل کہتے تھے، سو تیر کا پیکاں نکلا

۱؎ ق = ے عشرت ایجادیٔ بوے گل و دودِ چراغ

○ ... ۱۸۲۱ء

کس قدر خاک ہوا ہے دلِ مجنوں، یارب نقشِ ہر ذرّہ، سُویدائے بیاباں نکلا
دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا غالبؔ م آہ! جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا م ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
نہ ہوئی ہم سے رقم حیرتِ خطِ رخِ یار صفحۂ آئنہ، جولاں گہِ طوطی نہ ہوا
وسعتِ رحمتِ حق دیکھ کہ بخشا جاوے مجھ سا کافر کہ جو ممنونِ معاصی نہ ہوا
سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا م یہ زمرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں م وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل†، گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی م گر نفَس جادۂ سر منزلِ تقوی نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی م گوش، منّت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہوا
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے؟ م ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا
مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ م ناتوانی سے، حریفِ دمِ عیسی نہ ہوا

جب، بتقریبِ سفر، یار نے محمل باندھا م تپشِ شوق نے ہر ذرّے پہ اک دل باندھا
ناتوانی ہے تماشائیِ عمرِ رفتہ رنگ نے آئنہ آنکھوں کے مقابل باندھا
اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز م جوہرِ آئنہ کو طوطیِ بسمل باندھا
اصطلاحاتِ اسیرانِ تغافل مت پوچھ جو گرہ آپ نہ کھولی، اُسے مشکل باندھا

---

† یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھایا گیا

○ ... ۱۸۲۱ء

یاس و اُمیّد نے یک عربدہ میداں مانگا م عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا
نہ بندھے تشنگیِ شوق کے مضموں، غالب م گرچہ دل کھول کے، دریا کو بھی ساحل باندھا
نوکِ ہر خار سے تھا بس کہ سرِ دزدیِ زخم
جوں نمد، ہم نے کفِ پا پہ اسدؔ، دل باندھا

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا م قیسؔ، تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
دلِ حسرت زدہ، تھا مائدۂ لذّتِ درد م کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا
شورِ رسوائیِ دل دیکھ کہ یک نالۂ شوق لاکھ پردے میں چھپا، پر وہی عریاں نکلا
شوخیِ رنگِ حنا، خونِ وفا سے کب تک؟ آخر، اے عہد شکن، تو بھی پشیماں نکلا
جوہر ایجادِ خطِ سبز ہے، خود بینیِ حسن جو نہ دیکھا تھا، سو آئینے میں پنہاں نکلا
ہے نو آموزِ فنا، ہمّتِ دشوار پسند م سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا
میں بھی معذورِ جنوں ہوں، اسدؔ اے خانہ خراب
پیشوا لینے مجھے گھر سے بیاباں نکلا

نہ ہوگا، یک بیاباں ماندگی سے، ذوق کم میرا م حبابِ موجۂ رفتار ہے، نقشِ قدم میرا
رہِ خوابیدہ، تھی گردن کشِ یک درسِ آگاہی زمیں کو سیلیِ اُستاد ہے، نقشِ قدم میرا

له ق = دشوارِ شوق

○ ... ۱۸۲۱ء

محبّت تھی چمن سے لیکن اب یہ بیدماغی ہے م کہ موجِ بوئے گل سے، ناک میں آتا ہے، دم میرا
سراغِ آوارۂ عرضِ دو عالم شورِ محشر ہوں پر افشاں ہے غبار، آں سوئے صحرائے عدم میرا
نہ ہو وحشت کشِ درسِ سرابِ سطرِ آگاہی غبارِ راہ ہوں، بے مدّعا ہے پیچ و خم میرا
ہوائے صبح، یک عالم گریباں چاکیِ گل ہے دہانِ زخم پیدا کر، اگر کھاتا ہے غم میرا
اسدؔ، وحشت پرستِ گوشۂ تنہائیِ دل ہوں
برنگِ موجِ مے، خمیازۂ ساغر ہے، رم میرا

ضعفِ جنوں کو، وقتِ تپش، در بھی دور تھا اک گھر میں، مختصر سا بیاباں ضرور تھا
اے وائے غفلتِ نگہِ شوق! ورنہ یاں ہر پارہ سنگ، لختِ دلِ کوہِ طور تھا
درسِ تپش ہے برق کو اب جس کے نام سے وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلّص صبور تھا
شاید کہ مر گیا ترے رخسار دیکھ کر پیمانہ رات، ماہ کا لبریزِ نور تھا
آئینہ دیکھ، اپنا سا مُنہ لے کے رہ گئے م صاحب کو، دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
قاصد کو، اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے م اس کی خطا نہیں ہے، یہ میرا قصور تھا
+جنّت ہے تیری تیغ کے کشتوں کی منتظر جوہر سواد، جلوۂ مژگانِ حور تھا
ہر رنگ میں جلا اسدِ فتنہ انتظار
پروانۂ تجلّیِ شمعِ ظہور تھا

+ یہ شعر پہلی بار حاشیہ ق میں بڑھایا گیا

○ ... ۱۸۲۱ء

خود پرستی سے رہے باہمِ دگر ناآشنا   بیکسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا

آتشِ موئے دماغِ شوق ہے، تیرا تپاک   ورنہ ہم کس کے ہیں اے داغِ تمنا، آشنا؟

رشکٔ کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف! م عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا؟

بے دماغیِ شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہیں   یار تیرا جامِ مے، خمیازہ میرا آشنا

جوہرِ آئینہ جز رمزِ سرِ مژگاں نہیں   آشنا کی، ہمدگر سمجھے ہے ایما آشنا

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں، اجزائے بہار   سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل ناآشنا!

ذرّہ ذرّہ، ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے م گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلےٰ آشنا

شوقٔ، ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز م ذرّہ صحرا دستگاہ، و قطرہ دریا آشنا

میں اور ایک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے م عافیت کا دشمن، اور آوارگی کا آشنا

شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہ رہنا چاہیے م میرا زانو مونس، اور آئینہ تیرا آشنا

کوہ کن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا، اسد م سنگ سے سر مار کر، ہووے نہ پیدا آشنا

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا م تا محیطِ بادہ، صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا م جادہ، اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

□ عرشی صاحب نے پہلے مصرعے کی مماثلت کو دیکھتے ہوئے ان دونوں اشعار کو ایک ہی شعر مانا ہے۔ میری رائے میں ان اشعار کا الگ الگ درج کرنا ضروری ہے۔

+ یہ اشعار پہلی بار حاشیہ ق میں بڑھائے گئے

○ ... ۱۸۲۱ء

ہوں چراغانِ ہوس، جوں کاغذِ آتش زدہ   داغ، گرمِ کوششِ ایجادِ داغِ تازہ تھا

مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے؟ م خانۂ مجنونِ صحرا گرد، بے دروازہ تھا

پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حُسن م دست مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا

نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل، بہ باد م یادگارِ نالہ، اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

بے نوائی تر صدائے نغمۂ شہرت اسد
بوریا، یک نیستان عالم بلند آوازہ تھا

وہ مری چینِ جبیں سے، غمِ پنہاں سمجھا م رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

یک الف بیش نہیں، صیقلِ آئینہ ہنوز م چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ م اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

ہم نے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جوں شمع   شعلۂ عشق کو اپنا سر و ساماں سمجھا

تھا گریزاں مژۂ یار سے، دل، تا دمِ مرگ م دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بد خو ہوگا م نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی م ہر قدم، سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام م رُخ پہ ہر قطرہ عرق، دیدۂ حیراں سمجھا

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار، اسد؟ م غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

○ ...۱۸۲۱ء

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا م گہر میں محو ہوا، اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب م مگر، ستم زدہ ہوں، ذوقِ خامہ فرسا کا

+حنائے پائے خزاں ہے، بہار اگر ہے یہی م دوامِ کلفتِ خاطر ہے، عیش دنیا کا

ملی نہ وسعتِ جولانِ یک جنوں ہم کو عدم کو لے گئے دل میں غبارِ صحرا کا

مرا شمول ہر اک دل کے پیچ و تاب میں ہے میں مدعا ہوں تپش نامۂ تمنا کا

غمِ فراق میں تکلیفِ[1] سیرِ باغ نہ دو م مجھے، دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

+ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہوں م کرے ہے، ہر بنِ مو، کام چشمِ بینا کا

+دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے م ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا؟

نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے م مری نگاہ میں ہے جمع و خرج دریا کا

فلک[2] کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد، اسدؔ م جفا میں اس کی، ہے اندازِ کار فرما کا

کس کا خیال، آئینۂ انتظار تھا ہر برگِ گل کے پردے میں دل بیقرار تھا

کس کا جنونِ دید، تمنا شکار تھا آئینہ خانہ، وادیِ جوہر غبار تھا

جوں غنچہ و گل، آفتِ فالِ نظر نہ پوچھ پیکاں سے تیرے، جلوۂ زخم آشکار تھا

---

[1] ق = تکلیفِ سیرِ گل مت دو

[2] ق: میں پہلے یہ شعر یوں تھا: فلک کو دیکھ کے کرتا ہے تجھ کو یاد اسدؔ
اگرچہ گم شدہ ہے کار و بارِ دنیا کا

+ یہ اشعار پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھائے گئے

○ ...۱۸۲۱ء

+ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب م خونِ جگر، ودیعتِ مژگانِ یار تھا

اب میں ہوں اور ماتمِ[1] یک شہرِ آرزو م توڑا جو تو نے آئنہ، تمثال دار تھا

+کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو، پر اب م دیکھا، تو کم ہوئے پہ، غمِ روزگار تھا

دیکھی وفائے فرصتِ رنج و نشاطِ دہر خمیازہ، یک درازیِ عمرِ خمار تھا

+گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں م جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال م ہر ذرہ، مثلِ جوہرِ تیغ، آبدار تھا

صبحِ قیامت ایک دمِ گرگ تھی، اسدؔ
جس دشت میں وہ شوخِ دو عالم شکار تھا

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا م آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی م در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیِ شوق! کہ ہر دم مجھ کو م آپ جانا اُدھر، اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ، از بس کہ، تقاضائے نگہ کرتا ہے م جوہرِ آئنہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ م عیدِ نظارہ ہے، شمشیر کا عریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط م تو ہو اور آپ بصد رنگِ گلستاں ہونا

---

[1] ق = خونِ دو عالم معاملہ

+ یہ اشعار پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھائے گئے

○ ... ۱۸۲۱ء

عشرتِ پارۂ دل، زخمِ تمنّا کھانا م لذّتِ ریشِ جگر، غرقِ نمک داں ہونا
کی مرے قتل کے بعد، اُس نے جفا سے توبہ م ہائے! اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف! اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ م جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا م دل، جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز م پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنّا، یعنی م پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل م نالہ کرتا تھا، جگر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی م کیوں ترا راہ گزر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی م گھر ترا، خلد میں گر یاد آیا
آہ! وہ جرأتِ فریاد کہاں م دل[1] سے تنگ آ کے جگر یاد آیا
+پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال م دلِ گم گشتہ، مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے م دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں، اسدؔ م سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

---

1 ق = دل کے پردے میں

+ یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق پر بڑھایا گیا

○ ... ۱۸۲۱ء

تو دوست کسی کا بھی، ستمگر، نہ ہوا تھا م اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا مہِ نخشب کی طرح، دستِ قضا نے م خورشید، ہنوز، اُس کے برابر نہ ہوا تھا
توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے، ازل سے م آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم م میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
میں سادہ دل، آزردگیِ یار سے خوش ہوں م یعنی، سبقِ شوق مکرّر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی تُنک آبی سے ہوا خشک م میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
جاری تھی، اسدؔ، داغِ جگر سے مری تحصیل م آتش کدہ، جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

نَفَس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ م اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ
کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ م برنگِ خار، مرے آئنے سے جوہر کھینچ
تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار، اے دل م کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ
تری طرف ہے بہ حسرت، نظارۂ نرگس م بہ کوریِ دل و چشمِ رقیب، ساغر کھینچ
بہ نیم غمزہ، ادا کر حقِ ودیعتِ ناز م نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ
مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں م بہ روئے سُفرہ، کبابِ دلِ سمندر کھینچ
نہ کہہ کہ طاقتِ رسوائیِ وصال نہیں اگر یہی عرقِ فتنہ ہے، مکرّر کھینچ
جنونِ آئنہ، مشتاقِ یک تماشا ہے ہمارے صفحے پہ بالِ پری سے مسطر کھینچ
خمارِ منّتِ ساقی اگر یہی ہے، اسدؔ دلِ گداختہ کے میکدے میں ساغر کھینچ

○ ... ۱۸۲۱ء

حسن، غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد م بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
منصبِ شیفتگی کے، کوئی، قابل نہ رہا م ہوئی معزولیِ انداز و ادا، میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے م شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا، میرے بعد
خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر، یعنی م ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
درخورِ عرض نہیں، جوہرِ بیداد کو، جا م نگہِ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد
ہے جنوں اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع م چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا، میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق، م ہے مکرر لبِ ساقی میں صلا، میرے بعد
غم سے مرتا ہوں، کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی م کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد
+تھی، نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا، میرے بعد
تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ متفرق ہوے میرے رفقا، میرے بعد
آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا، غالبؔ م کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

بلا سے ہیں جو بہ پیشِ نظر در و دیوار م نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر، در و دیوار
وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ م کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار
نہیں ہے سایہ، کہ سن کر نویدِ مقدمِ یار م گئے ہیں چند قدم پیشتر، در و دیوار

+ یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھایا گیا

○ ... ۱۸۲۱ء

ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مئے جلوہ م کہ مست ہے ترے کوچے میں، ہر در و دیوار
جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار، تو آ م کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر، در و دیوار
ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے؟ م کہ گر پڑے نہ مرے پانو پر، در و دیوار
وہ آ رہا مرے ہمسائے میں، تو سائے سے م ہوئے فدا در و دیوار پر، در و دیوار
نظر میں کھٹکے ہے بِن تیرے، گھر کی آبادی م ہمیشہ روتے ہیں ہم، دیکھ کر، در و دیوار
نہ پوچھ بے خودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب م کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر، در و دیوار
نہ کہہ کسی سے کہ غالبؔ نہیں زمانے میں م حریفِ رازِ محبت، مگر، در و دیوار

لرزتا ہے مرا دل، زحمتِ مہرِ درخشاں پر م میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر
نہ چھوڑی حضرتِ یوسفؑ نے یاں بھی خانہ آرائی م سفیدی دیدۂ یعقوبؑ کی پھرتی ہے زنداں پر
دلِ خونیں جگر بے صبر و فیضِ عشق مستغنی! الٰہی یک قیامت خاور آ ٹوٹے بدخشاں پر
فنا تعلیمِ درسِ بے خودی ہوں اُس زمانے سے م کہ مجنوں "لام الف" لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
فراغت کس قدر رہتی مجھے، تشویشِ مرہم سے م بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر
نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا م کہ پشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مُہر عنواں پر
مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ، یاد آیا! م کہ فرقت میں تری، آتش برستی تھی گلستاں پر
بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا! م قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر
نہ لڑ ناصح سے، غالبؔ کیا ہوا گر اُس نے شدت کی م ہمارا بھی تو، آخر، زور چلتا ہے گریباں پر

ل ق : ے اسدؔ، اے بے تحمل! عربدہ بے جا ہے ناصح سے ؛ کہ آخر بے کسوں کا زور چلتا ہے گریباں پر

○ ... ۱۸۲۱ء

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں، فسونِ نیاز م دعا قبول ہو، یارب! کہ "عمرِ خضر دراز!"

نہ ہو، بہ ہرزہ، بیاباں نوردِ وہمِ وجود م ہنوز تیرے تصوّر میں ہے نشیب و فراز

فریبِ صنعتِ ایجاد کا تماشا دیکھ نگاہ عکس فروش، و خیال آئنہ ساز

وصالِ جلوہ تماشا ہے، پر دماغ کہاں؟ م کہ دیجے آئنۂ انتظار کو پرواز

ہنوز، اے اثرِ دید، ننگِ رسوائی نگاہ فتنہ خرام، و درِ دو عالم باز

+زبس کہ جلوۂ صیّاد حیرت آرا ہے اڑی ہے صفحۂ خاطر سے صورتِ پرواز

+ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزاں ہے کہ شیشہ نازک، و صہبا ہے آبگینہ گداز

+ہر ایک ذرّۂ عاشق ہے آفتاب پرست م گئی نہ خاک ہوئے پر، ہوائے جلوۂ ناز

+نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں، غالبؔ م جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

اسدؔ سے ترکِ وفا کا گماں وہ معنی ہے\
کہ کھینچیے پرِ طائر سے صورتِ پرواز

نہ گلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز م میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو اور آرایشِ خمِ کاکل[1] م میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

لافِ تمکیں، فریبِ سادہ دلی م ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

---

1 ق = گیسو\
+ یہ اشعار پہلی بار حاشیۂ ق میں اضافہ کیے گئے

○ ... ۱۸۲۱ء

ہوں گرفتارِ الفتِ صیّاد م ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وہ بھی دن ہو! کہ اُس ستم گر سے م ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں م جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گل باز

اے ترا غمزہ! یک قلم انگیز! م اے ترا ظلم! سر بسر انداز

تو ہوا جلوہ گر، مبارک ہو م ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا م میں غریب اور تو غریب نواز[1]

□ اسدؔ اللہ خاں تمام ہوا م اے دریغا، وہ رندِ شاہد باز!

زخم پر چھڑکیں کہاں، طفلانِ بے پروا نمک م کیا مزہ ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

گردِ راہِ یار، ہے سامانِ نازِ زخمِ دل م ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

مجھ کو ارزانی رہے! تجھ کو مبارک ہوجیو! م نالۂ بلبل کا درد، اور خندۂ گل کا نمک

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا؟ کہ آج م گردِ ساحل، ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے م دل طلب کرتا ہے زخم، اور مانگے ہے اعضا نمک

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ! م یاد کرتا ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جس جا نمک

---

1 ق یہ ہے یا علی! ایک نگاہ سوئے اسد\
پھر حاشیے پر اسی مصرع کو یوں لکھا ہے ــ\
نگہِ التفات سوئے اسد\
□ یہ شعر ق میں بھی نہیں ہے مگر متن م میں موجود ہے

○ ... ۱۸۲۱ء

غیر[+] کی منّت نہ کھینچوں گا، پئے توفیرِ درد! م زخم مثلِ خندۂ قاتل، ہے سرتاپا نمک
یاد ہیں، غالبؔ! تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں م زخم سے گرتا، تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک
اس عمل میں عیش کی لذت نہیں ملتی اسدؔ
زور نسبت مَے سے رکھتا ہے نصارا کا نمک

آہ کو چاہیے اک عمر، اثر ہوتے تک م کون جیتا ہے، تری زلف کے سر ہوتے تک؟
دامِ ہر موج میں ہے، حلقۂ صد کام نہنگ م دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہوتے تک
عاشقی صبر طلب، اور تمنا بیتاب م دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہوتے تک
تاقیامت شبِ فرقت میں گزر جائے گی عمر سات دن ہم پہ بھی بھاری ہیں سحر ہوتے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن م خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہوتے تک
پرتوِ خور سے، ہے شبنم کو فنا کی تعلیم م میں بھی ہوں، ایک عنایت کی نظر ہوتے تک
یک نظر بیش نہیں، فرصتِ ہستی، غافل م گرمیِ بزم ہے، اک رقصِ شرر ہوتے تک
غمِ ہستی کا، اسدؔ! کس سے ہو، جز مرگ، علاج؟ م شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

رہتے ہیں افسردگی سے سخت بیدردانہ، ہم شعلہ مانندِ سمندر، بلکہ آتش خانہ، ہم

+ یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھا گیا

○ ... ۱۸۲۱ء

حسرتِ عرضِ تمنّا یاں سے سمجھا چاہیے دو جہاں حشرِ زبانِ خشک ہیں، جوں شانہ، ہم
کشتیِ عالم بہ طوفانِ تغافل دے، کہ ہیں عالمِ آبِ گدازِ جوہرِ افسانہ، ہم
وحشتِ بے ربطیِ پیچ و خمِ ہستی نہ پوچھ
ننگِ بالیدن ہیں، جوں موئے سرِ دیوانہ، ہم

پاؤں میں جب وہ حنا باندھتے ہیں میرے ہاتھوں کو جدا باندھتے ہیں
آہ کا، کس نے اثر دیکھا ہے؟ م ہم بھی ایک اپنی ہوا باندھتے ہیں
حسنِ افسردہ دلی ہا رنگیں شوق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
تیرے بیمار پہ ہیں فریادی وہ جو کاغذ میں دوا باندھتے ہیں
قید میں بھی ہے، اسیری، آزاد چشمِ زنجیر کو وا باندھتے ہیں
شیخ جی، کعبے کا جانا معلوم آپ مسجد میں گدھا باندھتے ہیں
کس کا دل زلف سے بھاگا؟ کہ اسدؔ
دستِ شانہ بہ قفا باندھتے ہیں

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں م ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل، اے عمر م برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
قیدِ ہستی سے رہائی معلوم م اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

○ ... ۱۸۲۱ء

نشّۂ رنگ سے ہے، واشُدِ گُل م مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ م لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
اہلِ تدبیر کی واماندگیاں م آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
سادہ پُرکار ہیں خوباں، غالبؔ م ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

طاؤس نمط، داغ کے گر رنگ نکالوں — یک فردِ نسب نامۂ نیرنگ نکالوں
گو تیزیِ رفتار؟ کہ صحرا سے زمیں کو — جوں قمریِ بسمل، تپش آہنگ نکالوں
دامانِ شفق، طرفِ نقابِ مہِ نو ہے — ناخن کو جگر کاوی میں بے رنگ نکالوں
کیفیّتِ دیگر ہے، فشارِ دلِ خونیں! — یک غنچہ سے صد خُم مے گلرنگ نکالوں
پیمانۂ وسعت کدۂ شوق ہوں اے رشک — محفل سے مگر شمع کو دل تنگ نکالوں
گر ہو بلدِ شوق مری خاک کو وحشت — صحرا کو بھی گھر سے کئی فرسنگ نکالوں
فریاد! اسدؔ، غفلتِ رسوائیِ دل سے
کس پردے میں فریاد کی آہنگ نکالوں

کیا ضعف میں اُمّید کو دل تنگ نکالوں؟ — میں خار ہوں، آتش میں چبھوں، رنگ نکالوں
نے کوچۂ رسوائی و زنجیرِ پریشاں — کس پردے میں فریاد کی آہنگ نکالوں
یک نشوونما جا نہیں جولانِ ہوس کو — ہر چند بمقدارِ دلِ تنگ نکالوں

○ ... ۱۸۲۱ء

گر جلوۂ خُرشید خریدارِ وفا ہو — جوں ذرّہ، صد آئینۂ بے زنگ نکالوں
افسردۂ تمکیں ہے نفَس گرمیِ احباب — پھر شیشے سے عطرِ شررِ سنگ نکالوں
ضعف آئنہ پردازیِ دستِ دگراں ہے — تصویر کے پردے میں مگر رنگ نکالوں
ہے غیرتِ الفت کہ اسدؔ، اُس کی ادا پر
گر دیدہ و دل صلح کریں، جنگ نکالوں

بقدرِ لفظ و معنی، فکرت احرامِ گریباں ہیں — وگرنہ کیجیے جو ذرّہ عریاں، ہم نمایاں ہیں
عروجِ نشّۂ واماندگی پیمانہ محمل تر — برنگِ ریشۂ تاک آبلے جادے میں پنہاں ہیں
بہ وحشت گاہِ امکاں اتفاقِ چشم مشکل ہے — مہ و خُرشید باہم سازِ یک خوابِ پریشاں ہیں
طلسمِ آفرینش، حلقۂ یک بزمِ ماتم ہے — زمانے کے شبِ یلدا سے موے سر پریشاں ہیں
یہ کس بے مہر کی تمثال کا ہے جلوہ سیمابی — کہ مثلِ ذرّہ ہائے خاک آئینے پرافشاں ہیں
نہ انشا معنیِ مضموں، نہ املا صورتِ موزوں — عنایت نامہ ہائے اہلِ دنیا، ہرزہ عُنواں ہیں
+ مگر آتش ہمارا کوکبِ اقبال چمکاوے — وگرنہ مثلِ خارِ خشک، مردودِ گلستاں ہیں
اسدؔ، بزمِ تماشا میں تغافل پردہ داری ہے
اگر ڈھانپے تو آنکھیں ڈھانپ، ہم تصویرِ عریاں ہیں

+ یہ شعر پہلی بار حاشیہ ق میں بڑھایا گیا

○ ... ۱۸۲۱ء

ہم سے کھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن م ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

غرّۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو م اِس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں م رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ، ایک دن

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے م بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ، ایک دن

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں م ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

رنگِ طرب ہے صورتِ عہدِ وفا گرو
تھا کس قدر شکستہ کہ ہے جا بجا گرو

پروازِ نقد ، دامِ تمنائے جلوہ تھا
طاؤس نے اِک آئنہ خانہ رکھا گرو

عرضِ بساطِ انجمنِ رنگ مفت ہے
موجِ بہار رکھتی ہے اِک بوریا گرو

ہر ذرّہ خاک عرضِ تمنائے رفتگاں
آئینہ ہا شکستہ ، و تمثال ہا گرو

ہے تاک میں سکم ہوسِ صد قدح شراب
تسبیحِ زاہداں ، بکفِ مُدّعا گرو

برقِ آبیارِ فرصتِ رنگِ دمیدہ ہوں
جوں نخلِ شمع ، ریشے میں نشو و نما گرو

طاقت بساطِ دستگہِ یک قدم نہیں
جوں اشک جب تلک نہ رکھوں دست و پا گرو

ہے وحشتِ جنونِ بہار اس قدر کہ ہے
بالِ پری ، بہ شوخیِ موجِ صبا گرو

بے تاب سیرِ دل ہے ، سرِ ناخنِ نگار
یاں نعل ہے بہ آتشِ رنگِ حنا گرو

ہوں سخت جانِ کاوشِ فکرِ سخن اسدؔ
تیشے کی ، کوہسار میں ہے یک صدا گرو

○ ... ۱۸۲۱ء

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ
خانۂ آگہی خراب ! دل نہ سمجھ ، بلا سمجھ

ریگِ رواں و ہر تپش درسِ تسلّیِ شعاع
آئنہ توڑ اے خیال جلوے کو خوں بہا سمجھ

وحشتِ دردِ بیکسی بے اثر اس قدر نہیں
رشتۂ عمرِ خضر کو نالۂ نارسا سمجھ

شوقِ عناں گسل اگر درسِ جنوں ہوس کرے
جادۂ سیرِ دو جہاں یک مژہ خواب پا سمجھ

گاہ بخلد امیدوار ، گہ بہ جحیم بیم ناک
گرچہ خدا کی یاد ہے ، کلفتِ ماسوا سمجھ

شوخیِ حسن و عشق ہے آئنہ دارِ ہمدگر
خار کو بے نیامِ جاں ، ہم کو برہنہ پا سمجھ

اے بہ سرابِ حسنِ خلق تشنۂ سعیِ امتحاں
شوق کو منفعل نہ کر ، ناز کو التجا سمجھ

نغمۂ بے دلاں ، اسدؔ ، سازِ فسانگی نہیں
بسملِ دردِ خفتہ ہوں ، گریے کو ماجرا سمجھ

کلفتِ ربطِ این و آں غفلتِ مدّعا سمجھ
شوق کرے جو سرگراں محملِ خواب پا سمجھ

جلوہ نہیں ہے دردِ سر ، آئنہ صندلی نہ کر
عکس کجا ؟ و کو نظر ؟ نقش کو مدّعا سمجھ

حیرت اگر خرام ہے ، کارِ نگہ تمام ہے
گر کفِ دست بام ہے آئنے کو ہوا سمجھ

ہے خطِ عجزِ ما و تو ، اوّل درسِ آرزو
ہے یہ سیاقِ گفتگو ، کچھ نہ سمجھ ، فنا سمجھ

شیشہ شکستِ اعتبار ، رنگ بگردشِ اُستوار
گر نہ مٹیں یہ کوہسار آپ کو تو صدا سمجھ

نغمہ ہے محوِ ساز رہ ، نشّہ ہے بے نیاز رہ
رندِ تمام ناز رہ ، خلق کو پارسا سمجھ

جبرِ بی پہلوئے خیال ، رزقِ دو عالم احتمال
کل ہے جو وعدۂ وصال آج بھی اے خدا سمجھ

○ ... ۱۸۲۱ء

نَے سرو برگِ آرزو، نے رہ و رسمِ گفتگو ‏ اے دل و جانِ خلق، تو ہم کو آشنا سمجھ

لغزشِ پا کو ہے بَلد، نغمۂ "یا علیؑ مدد"
ٹوٹے گر آئنہ، اسدؔ، سُبحہ کو خوں بہا سمجھ

دل ہی نہیں کہ منّتِ درباں اُٹھائیے ‏ کس کو وفا کا سلسلہ جُنباں اُٹھائیے؟
تا چند داغ بیٹھیے، نقصاں اُٹھائیے؟ ‏ اب چار سوئے عشق سے دوکاں اُٹھائیے
صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھائیے ‏ م ‏ طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے
ہستی، فریب نامۂ موجِ سراب ہے ‏ یک عمر نازِ شوخیِ عُنواں اٹھائیے
ہے سنگ پر، براتِ معاشِ جنونِ عشق ‏ م ‏ یعنی، ہنوز منّتِ طِفلاں اٹھائیے
ضبطِ جنوں سے، ہر سرِ مو ہے ترانہ خیز ‏ یک نالہ بیٹھیے تو، نَیستاں اٹھائیے
نذرِ خراشِ نالہ، سرِ شکِ نمک اثر ‏ لطفِ کرم، بدولتِ مہماں اٹھائیے
دیوار، بارِ منتِ مزدور سے ہے خم ‏ م ‏ اے خانماں خراب، نہ احساں اٹھائیے
یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے ‏ م ‏ یا پردۂ تبسّمِ پنہاں اٹھائیے

انگور، سعیِ بے سروپائی سے سبز ہے
غالبؔ، بدوشِ دل خُمِ مستاں اُٹھائیے

ہے بزمِ بتاں میں سخن، آزردہ لبوں سے ‏ م ‏ تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

○ ... ۱۸۲۱ء

ہے دورِ قدح، وجہِ پریشانیِ صہبا ‏ م ‏ یک بار لگا دو خُمِ مَے میرے لبوں سے
رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں، زاہد ‏ م ‏ زنہار، نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے
بیدادِ وفا دیکھ، کہ جاتی رہی آخر ‏ م ‏ ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے
کیا پوچھے ہے برخود غلطی ہائے عزیزاں؟ ‏ خواری کو بھی اک عار ہے، عالی نسبوں سے
گو تم کو رضا جوئیِ اغیار ہے، لیکن ‏ جاتی ہے ملاقات کب ایسے سببوں سے؟

مت پوچھ، اسدؔ، غصّۂ کم فرصتیِ زیست
دو دن بھی جو کاٹے، تو قیامت تعبوں سے

غمِ دنیا سے گر پائی بھی، فرصت سر اٹھانے کی ‏ م ‏ فلک کا دیکھنا، تقریب تیرے یاد آنے کی
کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا، یارب؟ ‏ م ‏ قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے ‏ م ‏ ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی
انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا ‏ م ‏ اٹھے تھے سیرِ گل کو، دیکھنا شوخی بہانے کی
ہماری سادگی تھی، التفاتِ ناز پر مرنا ‏ م ‏ ترا آنا نہ تھا، ظالم، مگر تمہید جانے کی
لکد کوبِ حوادث کا تحمّل کر نہیں سکتی ‏ م ‏ مری طاقت کہ ضامن تھی، بتوں کے ناز اٹھانے کی
کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں، غالبؔ ‏ م ‏ بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

○ ... ۱۸۲۱ء

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی م
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں، وہ بھی

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے م
تکلف برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں، وہ بھی

+خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے؟ م
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں، وہ بھی

+نہ کرتا کاش! نالہ، مجھ کو کیا معلوم تھا، ہمدم م
کہ ہوگا باعثِ افزایشِ دردِ دروں، وہ بھی

مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے؟ م
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں، وہ بھی

نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ م
مرے دریاے بے تابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
کہیں ہو جاے جلد، اے گردشِ گردونِ دوں، وہ بھی

+نظر راحت پہ میری، کر نہ وعدہ شب کے آنے کا
کہ میری خواب بندی کے لیے ہوگا فسوں، وہ بھی

+ یہ اشعار پہلے پہل حاشیہ ق میں اضافہ کیے گئے

○ ... ۱۸۲۱ء

مرے دل میں ہے، غالبؔ، شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں م
خدا وہ دن کرے، جو اُس سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے م تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے
لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر م اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
کیجے بیاں سرورِ تبِ غم کہاں تلک؟ م ہر مُو، مرے بدن پہ، زبانِ سپاس ہے
ہے وہ، غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا م ہر چند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے
پی، جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب م اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
کیا غم ہے اس کو، جس کا علی سا امام ہو اتنا بھی، اے فلک زدہ، کیوں بے حواس ہے
ہر یک مکان کو ہے مکیں سے شرف، اسدؔ م مجنوں جو مر گیا ہے، تو جنگل اداس ہے

گر خامشی سے فائدہ اخفاے حال ہے م خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ؟ م دل، فردِ جمع و خرجِ زباں ہاے لال ہے
کس پردے میں ہے آئنہ پرداز؟ اے خدا م رحمت کہ عذر خواہِ لبِ بے سوال ہے
ہے ہے! خدا نخواستہ، وہ اور دشمنی م اے شوقِ منفعل، یہ تجھے کیا خیال ہے
مُشکیں، لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان م نافِ زمین ہے، نہ کہ نافِ غزال ہے
وحشت پہ میری، عرصۂ آفاق تنگ تھا م دریا، زمین کو عرقِ انفعال ہے

○ ... ۱۸۲۱ء

+ہستی کے مت فریب میں آجائیو، اسدؔ م عالم تمام، حلقۂ دامِ خیال ہے

پہلوتہی نہ کر غم و اندوہ سے، اسدؔ
دل وقفِ درد کر کہ فقیروں کا مال ہے

رفتارِ عمر، قطعِ رہِ اضطراب ہے م اس سال کے حساب کو، برق، آفتاب ہے
مینائے مے ہے، سروِ، نشاطِ بہار سے م بالِ تدرو، جلوۂ موجِ شراب ہے
+زخمی ہوا ہے، پاشنہ پائے ثبات کا م نے بھاگنے کی گوں، نہ اقامت کی تاب ہے
+جادادِ بادہ نوشیِ رنداں ہے، شش جہت م غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے
نظّارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا ؟ م جوشِ بہار، جلوے کو جس کے نقاب ہے
میں نامراد دل کی تسلّی کو کیا کروں م مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے
گزرا اسدؔ، مسرّتِ پیغامِ یار سے م قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے م نافہ، دماغِ آہوے دشتِ تتار ہے
دل مت گنوا، خبر نہ سہی، سیر ہی سہی م اے بے دماغ، آئنہ تمثال دار ہے
زنجیر یاد پڑتی ہے، جادے کو دیکھ کر اس چشم سے ہنوز نگہ یادگار ہے
بے پردہ، سوے وادیِ مجنوں گزر نہ کر م ہر ذرّے کے نقاب میں، دل بیقرار ہے

+ یہ اشعار پہلی بار حاشیہ ق میں بڑھائے گئے

○ ... ۱۸۲۱ء

سودائیِ خیال ہے، طوفانِ رنگ و بُو یاں ہے کہ داغِ لالہ، دماغِ بہار ہے
بھونچال میں گرا تھا یہ آئینہ طاق سے حیرت، شہیدِ جُنبشِ ابروے یار ہے
حیراں ہوں شوخیِ رگِ یاقوت دیکھ کر یاں ہے کہ صحبتِ خس و آتش برار ہے
اے عندلیب، یک کفِ خس بہرِ آشیاں م طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
غفلت کفیلِ عمر، و اسدؔ ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں، تجھے کیا انتظار ہے م

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ، اے آرزو خرامی م دل، جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
کرتے ہو شکوہ کس کا ؟ تم اور بے وفائی سر پیٹتے ہیں اپنا، ہم اور نیک نامی
صد رنگ گل کترنا، در پردہ قتل کرنا تیغِ ادا نہیں ہے پابندِ بے نیامی
اُسْ شمع کی طرح سے جس کو کوئی بُجھا دے م میں بھی، جلے ہوؤں میں، ہوں داغِ ناتمامی
طرفِ سخن نہیں ہے مجھ سے، خدا نہ کردہ ہے نامہ بر کو اس سے دعواے ہم کلامی
طاقت فسانۂ باد، اندیشہ شعلہ ایجاد اے غم، ہنوز آتش، اے دل، ہنوز خامی !
ہر چند عمر گزری آزردگی میں لیکن ہے شرحِ شوق کو بھی، جوں شکوہ، ناتمامی
ہے یاس میں اسدؔ کو ساقی سے بھی فراغت
دریا سے خشک گزری مستوں کی تشنہ کامی

٥ یہ شعر پہلے پہل متن ق میں درج ہوا

○ ... ۱۸۲۱ء

تغافل دوست ہوں، میرا دماغِ عجز عالی ہے م اگر پہلو تہی کیجے، تو جا میری بھی خالی ہے
بتانِ شوخ کا دل سخت ہوگا کس قدر، یارب! مری فریاد کو، کہسار، سازِ عجز نالی ہے
نشانِ بیقرارِ شوق، جز مژگاں نہیں باقی کئی کانٹے ہیں اور پیراہنِ شکلِ نہالی ہے
جنوں کر، اے چمن تحریرِ درسِ شغلِ تنہائی نگاہِ شوق کو، صحرا بھی دیوانِ غزالی ہے
سیہ مستی ہے اہلِ خاک کو ابرِ بہاری سے زمیں جوشِ طرب سے، جامِ لبریزِ سفالی ہے
رہا آباد عالم، اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے م بھرے ہیں جس قدر جام و سبو، میخانہ خالی ہے

اسدؔ، مت رکھ تعجب خردماغی ہائے منعم کا
کہ یہ نامرد بھی شیر افگنِ میدانِ قالی ہے

ہر قدم، دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے م میری رفتار سے، بھاگے ہے بیاباں مجھ سے
درسِ عنوانِ تماشا، بہ تغافل خوشتر م ہے نگہ، رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے
وحشتِ آتشِ دل سے، شبِ تنہائی میں م صورتِ دود، رہا سایہ گریزاں مجھ سے
اثرِ آبلہ سے، جادۂ صحرائے جنوں م صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
بیخودی، بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو! م پُر ہے سائے کی طرح، میرا شبستاں مجھ سے
شوقِ دیدار میں، گر تو مجھے گردن مارے م ہو نگہ، مثلِ گلِ شمع، پریشاں مجھ سے
بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت، ہے ہے! م سایہ خُرشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے
گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں، تجھ سے م آئنہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

○ ... ۱۸۲۱ء

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے، اسدؔ م ہے چراغاں، خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

وحشت کہاں کہ بے خودی انشا کرے کوئی؟ ہستی کو لفظِ معنیِ عنقا کرے کوئی
لختِ جگر سے ہے، رگِ ہر خار، شاخِ گُل م تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی
جو کچھ ہے، محوِ شوخیِ ابروئے یار ہے آنکھوں کو رکھ کے طاق پہ دیکھا کرے کوئی
°ہر سنگ و خشت، ہے صدفِ گوہرِ شکست م نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی
ہے، وحشتِ طبیعتِ ایجاد، یاس خیز م یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی
ناکامیِ نگاہ، ہے برقِ نظارہ سوز م تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
عرضِ سرِشک پر ہے، فضائے زمانہ تنگ صحرا کہاں کہ دعوتِ دریا کرے کوئی
°خوانا نہیں ہے خطِ رقمِ اضطرار کا تدبیرِ پیچ تابِ نفَس کیا کرے کوئی

وہ شوخ اپنے حسن پہ مغرور ہے، اسدؔ
دکھلا کے اس کو آئنہ توڑا کرے کوئی

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی م مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر م فرصت کہاں کہ تیری تمنّا کرے کوئی
عالم، غبارِ وحشتِ مجنوں ہے، سر بسر م کب تک خیالِ طرّۂ لیلیٰ کرے کوئی

° یہ اشعار پہلی بار متن تا میں درج ہوئے

○ ... ۱۸۲۱ء

افسردگی، نہیں طربِ انشائے التفات م ہاں، درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی
رونے سے، اے ندیم، ملامت نہ کر مجھے م آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی
تمثالِ جلوہ عرض کر، اے حسن، کب تلک آئینۂ خیال کو دیکھا کرے کوئی
چاکِ جگر سے، جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی م کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی
بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل م جب ہاتھ ٹوٹ جائیں، تو پھر کیا کرے کوئی
حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے، اسدؔ م پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے، شعلہ پاسبانی م تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی
مجھے اُس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی م کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی
یوں ہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب، ورنہ کہتا م کہ "مرے عدو کو، یا رب، ملے میری زندگانی"

آ، کہ مری جان کو قرار نہیں ہے م طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنت، حیاتِ دہر کے بدلے م نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے
گریہ نکالے ہے تیری بزم سے مجھ کو م ہائے! کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے
ہم سے عبث ہے، گمانِ رنجشِ خاطر م خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

▭ یہ اشعار نسخۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) کے ایک قصیدے کے ہیں۔ غالب نے وہیں سے الگ کر کے اپنے دیوان (اشاعتِ اوّل) میں بطورِ غزل شامل کر لیے۔

○ ... ۱۸۲۱ء

دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی م غیرِ گل! آئینۂ بہار نہیں ہے
قتل کا میرے کیا ہے عہد تو، بارے م وائے! اگر عہد اُستوار نہیں ہے
تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے، غالبؔ؟ م تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی، نہ سہی م امتحاں اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی
خار خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے م شوق، گلچینِ گلستانِ تسلی نہ سہی
مے پرستاں، خُمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے م ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی، نہ سہی
نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا م گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلی، نہ سہی
ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق م نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی، نہ سہی
نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا م گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی
عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو م نہ ہوئی، غالبؔ، اگر عمرِ طبیعی، نہ سہی

پھونکتا ہے نالہ ہر شب صورِ اسرافیل کی
ہم کو جلدی ہے، مگر تو نے قیامت ڈھیل کی
کی ہیں کس پانی سے یاں یعقوب نے آنکھیں سفید؟
ہے جو آبی پیرہن، ہر موجِ رودِ نیل کی
عرش پر تیرے قدم سے ہے، دماغِ گردِ رہ
آج تنخواہِ شکستن ہے کُلہ جبریل کی
مدعا در پردہ، یعنی جو کہوں باطل سمجھ
وہ فرنگی زادہ کھاتا ہے قسم انجیل کی
خیر خواہِ دید ہوں، از بہرِ دفعِ چشمِ زخم
کھینچتا ہوں اپنی آنکھوں میں سلائی نیل کی

○ ... ۱۸۲۱ء

نالہ کھینچا ہے، سراپا داغِ جرأت ہوں اسدؔ کیا سزا ہے میرے جرمِ آرزو تاویل کی؟

کیا ہے ترکِ دنیا کاہلی سے ہمیں حاصل نہیں بے حاصلی سے
خراجِ دیہہِ ویراں، یک کفِ خاک بیاباں خوش ہوں تیری عاملی سے
پَر افشاں ہو گئے شعلے ہزاروں رہے ہم داغ، اپنی کاہلی سے
خدا، یعنی پدر سے مہرباں تر پھرے ہم در بدر ناقابلی سے
اسدؔ قربانِ لطفِ جورِ بیدلؔ
خبر لیتے ہیں لیکن بیدلی سے

ربطِ تمیزِ اعیاں، دُردِ مئے صدا ہے اعمیٰ کو سرمۂ چشم، آوازِ آشنا ہے
موے دماغِ وحشت، سررشتۂ فنا ہے شیرازۂ دو عالم، یک آہِ نارسا ہے
دیوانگی ہے تجھ کو درسِ خرام دینا موجِ بہار، یکسر زنجیرِ نقشِ پا ہے
پروانے سے ہو، شاید، تسکینِ شعلۂ شمع آسایشِ وفاہا، بیتابیِ جفا ہے
اے اضطرابِ سرکش، یک سجدہ وار تمکیں میں بھی ہوں شمعِ کشتہ، گر داغ خوں بہا ہے
نے حسرتِ تسلّی، نے ذوقِ بے قراری یک درد و صد دوا ہے، یک دست صد دعا ہے
دریاے مے ہے ساقی، لیکن خمار باقی تا کوچہ وادنِ موجِ خمیازہ آشنا ہے
وحشت نہ کھینچ، قاتل، حیرت نفس ہے بسمل جب نالہ خوں ہو، غافل، تاثیر کیا بلا ہے

○ ... ۱۸۲۱ء

بت خانے میں اسدؔ بھی بندہ تھا گاہ گاہے حضرت چلے حرم کو، اب آپ کا خدا ہے

گر یاس سر نہ کھینچے، تنگی عجب فضا ہے وسعت گہِ تمنّا، یک بام و صد ہوا ہے
برہم زنِ دو عالم، تکلیفِ یک صدا ہے مینا شکستگاں کو کہسار خوں بہا ہے
فکرِ سخن، یک انشا زندانیِ خموشی دودِ چراغ، گویا، زنجیرِ بے صدا ہے
موزونیِ دو عالم، قربانِ سازِ یک درد مصراعِ نالۂ نے، سکتہ ہزار جا ہے
درسِ خرام تا کے خمیازۂ روانی؟ اس موجِ مے کو، غافل، پیمانہ نقشِ پا ہے
گردش میں لا، تجلّی، صد ساغرِ تسلّی! چشمِ تحیّر آغوش، مخمورِ مدّعا ہے
یک برگِ بے نوائی، صد دعوتِ نیستاں طوفانِ نالۂ دل، تا موجِ بوریا ہے
اے غنچۂ تمنّا، یعنی کفِ نگاریں دل دے، تو ہم بتا دیں مٹھی میں تیری کیا ہے
ہر نالۂ اسدؔ ہے مضمونِ داد خواہی
یعنی، سخن کو کاغذ احرامِ مدّعا ہے

ذوقِ خود داری، خرابِ وحشتِ تسخیر ہے آئنہ خانہ، مری تمثال کو زنجیر ہے
ذرّہ ذرّہ مجنوں کے کس کس داغ کو پردازِ عرض؟ ہر بیاباں، یک بیاباں حسرتِ تعمیر ہے
میکشِ مضموں کو حسنِ ربطِ خط کیا چاہیے؟ لغزشِ رفتارِ خامہ، مستیِ تحریر ہے
خانمانِ جبریاں غافل از معنی خراب! جب ہوئے ہم بے گنہ، رحمت کی کیا تقصیر ہے؟

○ ... ۱۸۲۱ء

چاہے گر جنّت، جز آدم وارثِ آدم نہیں — شوخیِ ایمانِ زاہد، سُستیِ تدبیر ہے

شب درازو آتشِ دل تیز، یعنی مثلِ شمع! — مہ، زسرتا ناخنِ پا، رزقِ یک شبگیر ہے

آب ہو جلتے ہیں، ننگِ ہمتِ باطل سے مرد

اشک پیدا کر، اسدؔ، گر آہ بے تاثیر ہے

رُباعیات

دل، سوزِ جنوں سے جلوہ منظر ہے آج — نیرنگِ زمانہ، فتنہ پرور ہے آج

یک تارِ نفَس میں، جوں طنابِ صبّاغ — ہر پارۂ دل، بہ رنگِ دیگر ہے آج

مشکل ہے، زبس، کلام میرا، اے دل — سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل

آساں کہنے کی، کرتے ہیں فرمائش [۲] — "گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل"

اِضافہ آخرِ نُسخۂ حمیدیہ

۱۸۲۲ء

تا

۱۸۲۶ء

مُتفرق

نسخۂ شیرانی

۱۸۲۶ء

○ ... ۱۸۲۱ء

چاہے گر جنّت، جز آدم وارثِ آدم نہیں　　شوخیِ ایمانِ زاہد، سستیِ تدبیر ہے
شب دراز و آتشِ دل تیز، یعنی مثلِ شمع!　　مہ، ز سرتا ناخنِ پا، رزقِ یک شبگیر ہے
آب ہو جلتے ہیں، ننگِ ہمتِ باطل ہے مرد
اشک پیدا کر، اسدؔ، گر آہ بے تاثیر ہے

رُباعیات

دل، سوزِ جنوں سے جلوہ منظر ہے آج　　نیرنگِ زمانہ، فتنہ پرور ہے آج
یک تارِ نفَس میں، جوں طنابِ صبّاغ　　ہر پارۂ دل، بہ رنگِ دیگر ہے آج

مشکل ہے، زبس، کلام میرا، اے دل　　سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی، کرتے ہیں فرمائش　　م　　"گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل"

اِضافہ آخرِ نسخۂ حمیدیہ

۱۸۲۲ء
تا
۱۸۲۶ء

مُتفرِق

نسخۂ شیرانی

۱۸۲۶ء

دھمکی میں مر گیا، جو نہ بابِ نبرد تھا م عشقِ نبرد پیشہ، طلب گارِ مرد تھا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا م اُڑنے سے پیشتر بھی، مرا رنگ زرد تھا
تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں م مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا
دل تا جگر، کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب م اس رہ گزر میں، جلوۂ گل، آگے گرد تھا
جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی م دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا
احباب، چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے م زنداں میں بھی، خیالِ، بیاباں نورد تھا
یہ لاشِ بے کفن، اسدِ خستہ جاں کی ہے م حق مغفرت کرے! عجب آزاد مرد تھا

محرم نہیں ہے تو ہی، نواہائے راز کا م یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا
رنگِ شکستہ، صبحِ بہارِ نظارہ ہے م یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا
تو اور سُوئے غیر نظرہائے تیز تیز! م میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا
صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا، وگرنہ میں م طُعمہ ہوں، ایک ہی نفسِ جاں گداز کا
ہیں بس کہ جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے م ہر گوشۂ بساط، ہے سر شیشہ باز کا
کاوش کا دل کرے ہے تقاضا، کہ ہے ہنوز م ناخن پہ قرض، اس، گرہِ نیم باز کا
تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا، اسدؔ م سینہ، کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

دوست، غمخواری میں میری سعی فرماویں گے کیا؟ م زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا؟

بے نیازی حد سے گزری، بندہ پرور، کب تلک م ہم کہیں گے حالِ دل، اور آپ فرماویں گے "کیا؟"
حضرتِ ناصح گر آویں، دیدہ و دل فرشِ راہ م کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاویں گے کیا
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں م عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لاویں گے کیا؟
گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا، یوں سہی م یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا؟
خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟ م ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبراویں گے کیا؟
ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت، اسدؔ م ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں، کھاویں گے کیا؟

عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا م درد کا حد سے گزرنا، ہے دوا ہو جانا
تجھ سے، قسمت میں مری، صورتِ قفلِ ابجد م تھا لکھا، بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
دل ہوا، کشمکشِ چارۂ زحمت میں، تمام م مٹ گیا، گھسنے میں، اس عُقدے کا وا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللہ اللہ م اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
ضعف سے، گریہ، مبدّل بدمِ سرد ہوا م باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال م ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
ہے مجھے، ابرِ بہاری کا برس کر کھُلنا م روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا
گر نہیں نکہتِ گُل کو ترے کوچے کی ہوس م کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا
تا کہ تجھ پر کھُلے اعجازِ ہوائے صیقل م دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا
بخشے ہے جلوۂ گل، ذوقِ تماشا، غالبؔ م چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

○ ...بعد از ۱۸۲۱ء (حاشیہ ق)

پھر ہُوا وقت کہ ہو بال کُشا موجِ شراب م دے بَطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب
پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن م سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب
جو ہوا غرقۂ مے، بختِ رسا رکھتا ہے م سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے، اگر م موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب
چار موج اُٹھتی ہے، طوفانِ طرب سے ہر سُو م موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب
جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز م دے ہے تسکیں، بدمِ آبِ بقا، موجِ شراب
بس کہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر م شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا، موجِ شراب
موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال م ہے تصوّر میں زبس جلوہ نما موجِ شراب
نشّے کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ م بس کہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب
ایک عالم پہ ہے طوفانیِ کیفیّتِ فصل م موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب
شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے، زہے! موسمِ گل م رہبرِ قطرہ بدریا ہے، خوشا! موجِ شراب
ہوش اُڑتے ہیں مرے، جلوۂ گل دیکھ، اسدؔ م پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت م پھر اک روز مرنا ہے، حضرت سلامت
جگر کو مرے، عشقِ خونابہ مشرب م لکھے ہے: "خداوندِ نعمت سلامت!"
دو عالم کی ہستی پہ خطِ فنا کھینچ   دل و دستِ اربابِ ہمّت سلامت!
علی الرّغمِ دشمن شہیدِ وفا ہوں م مبارک! مبارک! سلامت! سلامت!

○ ... بعد از ۱۸۲۱ء (حاشیہ ق)

نہیں گر بہ کامِ دلِ خستہ، گردوں   جگر خائیِ جوشِ حسرت سلامت!
نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی م تماشائے نیرنگِ صورت سلامت!
نہ اوروں کی سنتا، نہ کہتا ہوں اپنی   سرِ خستہ و شورِ وحشت سلامت!
وفورِ وفا ہے، ہجومِ بلا ہے   سلامت ملامت، ملامت سلامت!
نہ فکرِ سلامت، نہ بیمِ ملامت   زِ خود رفتگی ہائے حیرت سلامت!

رہے غالبؔ خستہ، مغلوبِ گردوں
یہ کیا بے نیازی ہے، حضرت سلامت؟

کب فقیروں کو رسائی بُتِ مے خوار کے پاس   تونبے بو دیجیے میخانے کی دیوار کے پاس
مژدہ، اے ذوقِ اسیری! کہ نظر آتا ہے! م دامِ خالی، قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس
جگرِ تشنۂ آزار، تسلّی نہ ہوا! م جوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس
مُند گئیں، کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے م خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
میں بھی رک رک کے نہ مرتا، جو زباں کے بدلے م دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس
دہنِ شیر میں جا بیٹھیے، لیکن اے دل م نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس
دیکھ کر تجھ کو، چمن بس کہ نمو کرتا ہے م خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس
مر گیا پھوڑ کے سر، غالبِ وحشی ہے ہے م بیٹھنا اُس کا وہ، آکر، تری دیوار کے پاس

○ ... بعد از ۱۸۲۱ء (حاشیہ ق)

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل ! م بلبل کے کاروبار پہ ہیں، خندہ ہائے گل

آزادیِ نسیم مبارک ! کہ ہر طرف م ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل

جو تھا، سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا م اے وائے ! نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

دیوانگاں کا چارہ فروغِ بہار ہے ہے شاخِ گل میں، پنجۂ خوباں بجائے گل

خوش حال اُس حریفِ سیہ مست کا کہ جو م رکھتا ہو، مثلِ سایۂ گل، سر بہ پائے گل

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے، بہار م میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

مژگاں تلک رسائیِ لختِ جگر کہاں ؟ لے وائے ! گر نگاہ نہ ہو آشنائے گل

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے م مینائے بے شراب، و دلِ بے ہوائے گل

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی م خوں ہے مری نگاہ میں، رنگِ ادائے گل

تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک م بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

غالبؔ، مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو م جس کا خیال، ہے گلِ جیبِ قبائے گل

اپنے[1] احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں؟ ہے حیا مانعِ اظہار، کہوں یا نہ کہوں؟

نہیں کرنے کا میں، تقریر ادب سے باہر میں بھی ہوں محرمِ اسرار، کہوں یا نہ کہوں؟

شکر سمجھو اسے، یا کوئی شکایت سمجھو اپنی ہستی سے ہوں بیزار، کہوں یا نہ کہوں؟

---

[1] یہ غزل دیوان نواب الٰہی بخش خاں معروف دہلوی متوفی ۱۸۲۶ء کے ایک مخمس میں ملتی ہے۔ قیاس ہے کہ یہ ۱۸۲۱ء کے بعد ہی کہی گئی ہوگی کیوں کہ یہ نخ (۱۸۱۶ء) اور ق (۱۸۲۱ء) دونوں میں شامل نہیں۔

○ ... بعد از ۱۸۲۱ء (حاشیہ ق)

اپنے دل ہی سے، میں احوالِ گرفتاریِ دل جب نہ پاؤں کوئی غم خوار، کہوں یا نہ کہوں؟

دل کے ہاتھوں سے، کہ ہے دشمنِ جانی میرا ہوں اک آفت میں گرفتار، کہوں یا نہ کہوں؟

میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غمّاز گوش ہیں درپسِ دیوار، کہوں یا نہ کہوں؟

آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے، تو اسدؔ
حسبِ حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں؟

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں م ایک چکّر ہے مرے پانو میں زنجیر نہیں

شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں م جادہ، غیر از نگہِ دیدۂ تصویر، نہیں

حسرتِ لذّتِ آزار رہی جاتی ہے م جادۂ راہِ وفا، جُز دمِ شمشیر، نہیں

رنجِ نومیدیِ جاوید گوارا رہیو ! م خوش ہوں، گر نالہ زبونی کشِ تاثیر، نہیں

سر کھجاتا ہے، جہاں زخم سر اچھا ہو جائے م لذّتِ سنگ، بہ اندازۂ تقریر، نہیں

آئنہ دام کو سبزے میں چھپاتا ہے عبث کہ پری زادِ نظر، قابلِ تسخیر، نہیں

مثلِ گل، زخم ہے میرا بھی سناں سے توام تیرا ترکش ہی کچھ آبستنیِ تیر، نہیں

جب کرم رخصتِ بے باکی و گستاخی دے م کوئی تقصیر، بجز خجلتِ تقصیر، نہیں

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا، غالبؔ؟ جس کا دیوان کم از گلشنِ [illegible]، نہیں

غالبؔ[1]، اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ م "آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ، نہیں"

---

[1] ق : ے ریختے کا وہ ظہوری ہے، بقولِ ناسخ

○ ... بعد از ۱۸۲۱ء (آخرِ ق)

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے م
میں اُسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے، یہی گرمی گر اندیشے میں ہے م
آبگینہ، تُندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

غیر کو، یارب، وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے؟ م
گر حیا بھی اُس کو آتی ہے، تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لَت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے م
دل کی وہ حالت، کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دورِ چشمِ بد تری بزمِ طرب سے! واہ، واہ! م
نغمہ ہو جاتا ہے، واں گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے، طرزِ تغافل، پردہ دارِ رازِ عشق م
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اُس کی بزم آرائیاں سن کر، دلِ رنجور یاں م
مثلِ نقشِ مُدّعائے غیر، بیٹھا جائے ہے

ہو کے عاشق، وہ پری رُخ اور نازک بن گیا م
رنگ کھُلتا جائے ہے، جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

○ ... بعد از ۱۸۲۱ء (آخرِ ق)

نقش کو اُس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں! م
کھینچتا ہے جس قدر، اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے

سایہ میرا، مجھ سے، مثلِ دود، بھاگے ہے اسدؔ! م
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے؟

مسجد کے زیرِ سایہ، خرابات چاہیے م بھوں پاس آنکھ، قبلۂ حاجات چاہیے
وہ بات چاہتے ہو کہ جو بات چاہیے صاحب کے ہم نشیں کو کرامات چاہیے
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی ایک اور شخص پر م آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے
دے داد، اے فلک دلِ حسرت پرست کی م ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے
سیکھے ہیں، مہ رُخوں کے لیے ہم مصوّری م تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے
مَے سے غرض نشاط ہے، کس روسیاہ کو؟ م اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

قطعہ

نشو و نما ہے اصل سے، غالبؔ فروع کو م خاموشی ہی سے نکلے ہے، جو بات چاہیے
ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا م ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
سر، پائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بے خودی م رُو، سُوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے
یعنی، بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات م عارف، ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

○ ...بعد از ۱۸۲۱ء (آخرِ ق)

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے م تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے
نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم م لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے
کثرت آرائیٔ وحدت ہے پرستاریٔ وہم م کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے
زندگی میں بھی، رہا ذوقِ فنا کا مارا نشّہ بخشا غضب اس ساغرِ خالی نے مجھے
ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا م عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے
بس کہ تھی فصلِ خزانِ چمنستانِ سخن رنگِ شہرت نہ دیا تازہ خیالی نے مجھے

جلوۂ خور سے، فنا ہوتی ہے شبنم غالبؔ
کھو دیا سطوتِ اسمائے جلالی نے مجھے

کبھی نیکی بھی، اُس کے جی میں، گر آ جائے ہے مجھ سے م
جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے مجھ سے
خدایا، جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے؟ م
کہ جتنا کھینچتا ہوں، اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے
وہ بدخو، اور میری داستانِ عشق طولانی م
عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے
اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے م
نہ پوچھا جائے ہے اس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے

○ ...بعد از ۱۸۲۱ء (آخرِ ق)

سنبھلنے دے مجھے، اے نا اُمیدی، کیا قیامت ہے م
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
تکلّف برطرف، نظّارگی میں بھی سہی، لیکن° م
وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے
ہوئے ہیں پانو ہی پہلے، نبردِ عشق میں، زخمی م
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے
قیامت ہے کہ ہووے مدّعی کا ہم سفر، غالبؔ م
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

وہ، آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے م ولے مجھے تپشِ دل، مجالِ خواب تو دے
کرے ہے قتل، لگاوٹ میں تیرا رو دینا م تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے
دکھا کے جنبشِ لب ہی، تمام کر ہم کو م نہ دے جو بوسہ، تو منہ سے کہیں جواب تو دے
پلا دے اوک سے، ساقی، جو ہم سے نفرت ہے م پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے
یہ کون کہوے ہے آباد کر ہمیں؟ لیکن کبھی زمانہ مرادِ دلِ خراب تو دے
اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے م کہا جو اس نے "ذرا میرے پانو داب تو دے"

° یہ شعر پہلے پہل متن قا میں درج ہوا

○ ... ۱۸۲۶ء

عشق، تاثیر سے نومید نہیں ؎ جاں سپاری، شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے ؎ جامِ مے، خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلّی تری، سامانِ وجود ؎ ذرّہ، بے پَرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رُسوا ہو جائے ؎ ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے ؎ غمِ محرومیِ جاوید نہیں
کہتے ہیں "جیتے ہیں امید پہ لوگ" ؎ ہم کو جینے کی بھی اُمّید نہیں
مَے کشی کو نہ سمجھ بے حاصل
بادہ، غالبؔ! عرقِ بید نہیں

دیوانگی سے، دوش پہ زُنّار بھی نہیں ؎ یعنی، ہمارے جَیب میں اک تار بھی نہیں
دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے ؎ دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں
ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے ؎ دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں ؎ طاقت بقدرِ لذّتِ آزار بھی نہیں
شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر، وبالِ دوش ؎ صحرا میں اے خدا، کوئی دیوار بھی نہیں
گنجایشِ عداوتِ اغیار یک طرف ؎ یاں دل میں ضعف سے، ہوسِ یار بھی نہیں
ڈر نالہ ہائے زار سے میرے، خدا کو مان ؎ آخر، نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں
دل میں ہے، یار کی صفِ مژگاں سے رُوکشی ؎ حال آنکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

○ ... ۱۸۲۶ء

اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے، اے خدا؟ ؎ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا ؎ دیوانہ گر نہیں ہے، تو ہُشیار بھی نہیں

مرے جہان کے، اپنی نظر میں خاک نہیں ؎ سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں
مگر غبار ہوئے پر، ہوا اڑا لے جائے ؎ وگرنہ تاب و تواں، بال و پر میں خاک نہیں
یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے؟ ؎ کہ غیرِ جلوۂ گل، رہگزر میں خاک نہیں
بھلا اُسے نہ سہی، کچھ مجھی کو رحم آتا ؎ اثر، مرے نفَسِ بے اثر میں خاک نہیں
خیالِ جلوۂ گُل سے خراب ہیں میکش ؎ شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں
ہوا ہوں، عشق کی غارت گری سے شرمندہ ؎ سوائے حسرتِ تعمیر، گھر میں خاک نہیں
ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے، اسدؔ ؎ کُھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

عجب نشاط سے جلّاد کے، چلے ہیں ہم آگے ؎
کہ اپنے سائے سے، سر، پانو سے ہے دو قدم آگے
قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت ؎
فقط "خراب" لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے
غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی ؎
وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذّتِ الم آگے

○ ...۱۸۲۶ء

خدا کے واسطے! داد اس جنونِ شوق کی دینا م
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے، ہم، آگے

یہ، عمر بھر، جو پریشانیاں اُٹھائی ہیں ہم نے م
تمھارے آئیو، اے طرّہ ہائے خم بہ خم، آگے

دل و جگر میں پَرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے م
ہم اپنے زعم میں، سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں، غالبؔ م
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے م نالہ، پابندِ نَے نہیں ہے
کیوں بوتے ہیں باغبان تونبے؟ م گر باغ گدائے مَے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شَے میں تو ہے م پر تجھ سی کوئی شَے نہیں ہے
ہاں، کھائیو مت فریبِ ہستی! م ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے
شادی سے گزر، کہ غم نہ ہووے م اُردی جو نہ ہو، تو دَے نہیں ہے
انجامِ شمارِ غم نہ پوچھو یہ مصرفِ تا بکَے نہیں ہے
کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد؟ م مَے ہے، یہ مگس کی قَے نہیں ہے
جس دل میں کہ "تا بکَے" سما جائے واں عزتِ تختِ کَے نہیں ہے

○ ...۱۸۲۶ء

ہستی ہے، نہ کچھ عدم ہے، غالبؔ م آخر تو کیا ہے، اَے نہیں ہے

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے[1] م کر گئی وابستۂ تن، میری عُریانی، مجھے
بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں م مرحبا! مَیں، کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے
کیوں نہ ہو بے التفاتی؟ اُس کی خاطر جمع ہے م جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے
میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی م لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے
بدگماں ہوتا ہے وہ کافر، نہ ہوتا کاشکے! م اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بُستانی مجھے
وائے! واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا م لے گیا تھا گور میں، ذوقِ تن آسانی مجھے
وعدہ آنے کا وفا کیجیے، یہ کیا انداز ہے؟ م تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے
ہاں، نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری، واہ، واہ! م پھر ہوا ہے تازہ، سودائے غزل خوانی مجھے
دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی م میرزا یوسفؔ ہے، غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

---

[1] اس غزل کے دو شعر، تیسرا (کیوں نہ ہو...) اور چوتھا (میرے غم خانے...) نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) میں موجود ہیں۔ اور جس غزل میں یہ دو شعر اضافہ کیے گئے ہیں۔ وہ اصلاً نسخ میں ہے اور اُس کی جداگانہ حیثیت ہے۔ اس لیے اصول کے مطابق اس غزل کو یہاں ہی رکھا جائے گا۔ تاہم مکمل غزل گلِ رعنا (تکمیل ۱۱ ستمبر ۱۸۲۸ء) میں شامل ہے۔ آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ نے متداول غزل کے باقی شعر اپنے بیمار بھائی یوسفؔ کی صحت یابی کی خبر (اپریل ۱۸۲۸ء) سن کر کلکتے کے قیام کے دوران میں فکر کیے ہونگے۔ چونکہ گلِ رعنا کلام کا انتخاب ہے اس لیے تین شعر (مطلع، مقطع اور پانچواں شعر) انتخاب نہیں کیے گئے

۱۸۲۷ء
تا
۱۸۲۸ء

نسخۂ شیرانی

(کلام مندرجۂ حواشی)

بعد از ۱۸۲۶ء

گلِ رعنا

(تکمیلِ تدوین ۱۱ر ستمبر)

۱۸۲۸ء

○ ... بعد از ۱۸۲۶ء (حاشیہ قا)

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا م وہ اک گلدستہ ہے ہم بےخودوں کے طاقِ نسیاں کا
بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوشہاے مژگاں کا؟ م کہ ہر یک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا
نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو م لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا
دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے م مرا ہر داغِ دل، اک تخم ہے سروِ چراغاں کا
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے م کرے جو پرتوِ خرشید، عالم شبنمستاں کا
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی م ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے، خونِ گرمِ دہقاں کا
اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ، ویرانی تماشا کر م مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
خموشی میں نہاں، خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں م چراغِ مردہ ہوں، میں بےزباں گورِ غریباں کا
ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے م دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا
بغل میں غیر کی، آج آپ سوتے ہیں کہیں، ورنہ م سبب کیا، خواب میں آکر تبسّم ہاے پنہاں کا؟
نہیں معلوم، کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا ! م قیامت ہے، سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا
نظر میں ہے ہماری، جادۂ راہِ فنا، غالبؔ م کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزاے پریشاں کا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ؟ م نہ ہو مرنا ، تو جینے کا مزا کیا ؟
تجاہل پیشگی سے مدّعا کیا ؟ م کہاں تک، اے سراپا ناز" کیا، کیا" ؟
نوازش ہاے بےجا دیکھتا ہوں م شکایت ہاے رنگیں کا گِلا کیا ؟
نگاہِ بےمحابا چاہتا ہوں م تغافل ہاے تمکیں آزما کیا ؟

○ ...بعد از ۱۸۲۶ء (حاشیہ قا)

فروغِ شعلۂ خس، یک نفس ہے م ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا ؟
نفس موجِ محیطِ بےخودی ہے م تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا ؟
دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے م غمِ آوارگی ہائے صبا کیا ؟
دلِ ہر قطرہ، ہے سازِ "انا البحر" م ہم اُس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا ؟
مُحابا کیا ہے ؟ میں ضامن، اِدھر دیکھ م شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا ؟
سُن، اے غارت گرِ جنسِ وفا، سُن م شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا ؟
کیا کس نے جگرداری کا دعویٰ ؟ م شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا ؟
یہ، قاتل، وعدۂ صبر آزما کیوں ؟ م یہ، کافر، فتنۂ طاقت رُبا کیا ؟
بلائے جاں ہے غالبؔ اُس کی ہر بات م عبارت کیا، اِشارت کیا، ادا کیا ؟

آبرو کیا خاک اُس گُل کی کہ گلشن میں نہیں ! م ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں
ضعف سے، اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں م رنگ ہو کر اُڑ گیا، جو خوں کہ دامن میں نہیں
ہو گئے ہیں جمع، اجزائے نگاہِ آفتاب م ذرّے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں
کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم، اندھیر ہے م پنبہ، نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں
رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے م انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں
زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن م غیر سمجھا ہے کہ لذّت، زخمِ سوزن میں نہیں
بس کہ ہیں، ہم، اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے م جلوۂ گُل کے سوا، گرد اپنے مدفن میں نہیں

○ ...بعد از ۱۸۲۶ء (حاشیہ قا)

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا م خوں بھی، ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں
لے گئی ساقی کی نخوت، قُلزُم آشامی مری م موجِ مے کی آج، رگ، مینا کی گردن میں نہیں
ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود م قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں
تھی وطن میں شان کیا، غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر م بےتکلّف، ہوں وہ مُشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

ذکر میرا، بہ بدی بھی، اُسے منظور نہیں م غیر کی بات بگڑ جائے، تو کچھ دور نہیں
وعدۂ سیرِ گلستاں ہے، خوشا ! طالعِ شوق م مژدۂ قتل مُقدّر ہے، جو مذکور نہیں
شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے، عالم م لوگ کہتے ہیں کہ ہے، پر ہمیں منظور نہیں
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن م ہم کو تقلیدِ تُنک ظرفیِ منصور نہیں
حسرت، اے ذوقِ خرابی، کہ وہ طاقت نہ رہی م عشقِ پُر عربدہ کی گوں، تنِ رنجور نہیں
میں جو کہتا ہوں کہ "ہم لیں گے قیامت میں تمھیں" م کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"
ظلم کر ظلم، اگر لطف دریغ آتا ہو م تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں
پیٹھ محراب کی قبلے کی طرف رہتی ہے محوِ نسبت ہیں، تکلّف ہمیں منظور نہیں
صاف دردی کشِ پیمانۂ جم ہیں، ہم لوگ م وائے! وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں
ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی، غالبؔ م میرے دعوے پہ یہ حجّت ہے کہ مشہور نہیں

نالہ، جُز حسنِ طلب، اے ستم ایجاد نہیں م ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں

○ ... بعد از ۱۸۲۶ء (حاشیہ قا)

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو، کیا خوب! م ہم کو تسلیم، نکو نامیِ فرہاد، نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم م دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
اہلِ بینش کو ہے، طوفانِ حوادث، مکتب م لطمۂ موج، کم از سیلیِ اُستاد نہیں
وائے، محرومیِ تسلیم، و بدا! حالِ وفا م جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں
رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے؟ م گر چراغانِ سرِ رہگزرِ باد نہیں
سبدِ گُل کے تلے بند کرے ہے گلچیں م مژدہ، اے مرغ، کہ گلزار میں صیّاد نہیں
نفی سے کرتی ہے، اثبات، تراوش، گویا م دی ہے جائے دہن، اس کو دمِ ایجاد، نہیں
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے، بہشت م یہی نقشہ ہے، ولے اس قدر آباد نہیں
کرتے کس مُنہ سے ہو غربت کی شکایت، غالبؔ م تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

واں پہنچ کر، جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو م صدرہ آہنگ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو
دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے م کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہم کو
ضعف سے، نقشِ پئے مور، ہے طوقِ گردن م تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو
جان کر کیجے تغافل، کہ کچھ اُمیّد بھی ہو م یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو
رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں م نالۂ مرغِ سحر، تیغِ دو دم ہے ہم کو
سر اُڑانے کے، جو، وعدے کو مکرّر چاہا م ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو"
دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ؟ ولیکن ناچار م پاسِ بے رونقیِ دیدہ، اہم ہے ہم کو

○ ... بعد از ۱۸۲۶ء (حاشیہ قا)

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو م ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو
لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھُلتا، یعنی م ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے، یہ شہر م عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع، غالبؔ م جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو
ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو
طاقتِ رنجِ سفر بھی نہیں پاتے اتنی ہجرِ یارانِ وطن کا بھی الم ہے ہم کو

لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی اُمید
جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

ظلمت کدے میں میرے، شبِ غم کا جوش ہے م اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال، نہ نظّارۂ جمال م مدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
ہو کر شہید عشق میں، پائے ہزار جسم ہر موجِ گردِ راہ، مرے سر کو دوش ہے
مَے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب م اے شوق، ہاں، اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے
گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا م کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

ے مقطعِ سلسلۂ شوق ...... یہ شعر، اور ے لیے جاتی ہے کہیں ......
(بجائے ے لائی ہے معتمد الدّولہ .....) یہ ترمیم، پہلے پہل گُل میں درج ہوئے

○ ... بعد از ۱۸۲۶ء (حاشیہ قا)

دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست م بزمِ خیال، میکدۂ بے خروش ہے

ق

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل ! م زنہار! اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو م میری سنو! جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی م مطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط م دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر، تو بزم میں م نَے وہ سُرور و سوز، نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی م اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے
▭ لطفِ خرامِ ساقی، و ذوقِ صدائے چنگ م یہ جنّتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
آتے ہیں غیب سے، یہ مضامیں خیال میں م غالبؔ، صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری م اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ م دیکھ خونابہ فشانی میری
کیا بیاں کرکے مرا روئیں گے یار؟ م مگر آشفتہ بیانی میری
ہوں زِ خود رفتۂ بیدائے خیال م بھول جانا ہے نشانی میری

▭ یہ شعر قا میں نہیں گل میں موجود ہے۔

○ ... بعد از ۱۸۲۶ء (حاشیہ قا)

متقابل ہے، مقابل میرا م رُک گیا، دیکھ روانی میری
قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں م سخت ارزاں ہے گرانی میری
گرد بادِ رہِ بیتابی ہوں م صرصرِ شوق، ہے بانی میری
دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا م کھل گئی ہیچمدانی میری
کر دیا ضعف نے عاجز، غالبؔ م ننگِ پیری ہے، جوانی میری

سادگی پر اس کی، مر جانے کی حسرت دل میں ہے م بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
▭ دیکھنا تقریر کی لذّت، کہ جو اُس نے کہا م میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
▭ گرچہ ہے کس کس برائی سے، ولے با ایں ہمہ م ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے
▭ بس ہجومِ نا امیدی، خاک میں مل جائے گی م یہ جو اک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
رنجِ رہ کیوں کھینچیے؟ واماندگی کو عشق ہے! م اٹھ نہیں سکتا، ہمارا جو قدم منزل میں ہے
جلوہ زارِ آتشِ دوزخ، ہمارا دل سہی م فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گل میں ہے؟
ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب م رحم کر اپنی تمنّا پر کہ کس مشکل میں ہے

▭ یہ اشعار قا میں نہیں گل میں موجود ہیں

بعد از ۱۱ ستمبر ۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۳ء

مُتفرق

نُسخۂ رام پور

(اوّل / قدیم)

۱۸۳۳ء

○ ...۲۹/۱۸۲۸ء

قطعہ

دیکھنے[1] میں ہیں گرچہ دو، پر ہیں یہ دونوں یار ایک — وضع میں گو ہوئی دو سر، تیغ ہے ذوالفقار ایک

ہم سخن و ہم زباں، حضرتِ قاسم[2] و طپاں[3] — ایک طپش کا جانشیں، درد کا یادگار ایک

نقدِ سخن کے واسطے، ایک عیارِ آگہی — شعر کے فن کے واسطے، مایۂ اعتبار ایک

ایک وفا و مہر میں، تازگیِ بساطِ دہر — لطف و کرم کے باب میں زینتِ روزگار ایک

گُل کدۂ تلاش کو، ایک ہے رنگ ایک بُو — ریختے کے قماش کو، پود ہے ایک تار ایک

مملکتِ کمال میں، ایک امیرِ نامور — عرصۂ قیل و قال میں، خسروِ نامدار ایک

گلشنِ اتفاق میں، ایک بہارِ بے خزاں — میکدۂ وفاق میں، بادۂ بے خمار ایک

زندۂ شوقِ شعر کو، ایک چراغِ انجمن — کشتۂ ذوقِ شعر کو، شمعِ سرِ مزار ایک

دونوں کے دل حق آشنا، دونوں رسولؐ پر فدا — ایک مُحبِّ چار یار، عاشقِ ہشت و چار ایک

جانِ وفا پرست کو، ایک شمیمِ نوبہار — فرقِ ستیزہ مست کو، ابرِ تگرگ بار ایک

لایا ہے، کہہ کے یہ غزل، شائبۂ ریا سے دُور
کر کے دل و زباں کو، غالبِ خاکسار، ایک

---

[1] یہ غزل قیامِ کلکتہ کے زمانے (تکمیلِ گلِ رعنا ۱۱ ستمبر ۱۸۲۸ء تا ستمبر ۱۸۲۹ء) میں کسی وقت کہی گئی ہوگی

[2] قاسم کا پورا نام مصلح الدولہ سید ابوالقاسم خاں (وقائع نگارِ سلطانی) تھا۔ ۱۲ دسمبر ۱۸۴۵ء کو مرضِ وبا (ہیضہ) انتقال کیا۔
(بحوالہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی۔ اشاعت دوم۔ ص ۴۰۷)

[3] طپاں۔ مرزا احمد بیگ۔ وفات ۵ مارچ ۱۸۳۴ء سے چند روز قبل
(بحوالہ غالب درونِ خانہ ص ۲۲۶)

○ ... ۱۸۲۸/۲۹ء

قطعہ

م[1]

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی | زیب دیتا ہے، اُسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے | ناطقہ، سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے
مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے | حرزِ بازوے شگرفانِ خود آرا کہیے
مِسّی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے | داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے | سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے | خالِ مشکینِ رُخِ دلکشِ لیلا کہیے
حجرُ الاسودِ دیوارِ حرم کیجیے فرض | نافہ، آہوے بیابانِ خُتن کا کہیے
وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق | رنگ میں، سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے
صَومعے میں، اسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز | میکدے میں، اُسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے
کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے | کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے؟

[1] یہ قطعہ کلکتے کے قیام کے دوران میں کہا گیا تھا۔ غالبؔ اواخرِ نومبر ۱۸۵۸ء میں مرزا حاتم علی مہر کو اس قطعے کے بارے میں لکھتے ہیں
"...... میں نے کلکتے نہیں کہا تھا۔ تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین صاحب ایک میرے دوست تھے، انھوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کفِ دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی تشبیہات نظم کیجیے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا اور صلے میں وہ ڈلی ان سے لی ...."

○ ... ۱۸۲۸/۲۹ء

کیوں اسے گوہرِ نایاب تصوّر کیجے؟ | کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے؟
کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلیٰ لکھیے؟ | کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلمیٰ کہیے؟

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض
اور اس چکنی سُپاری کو سویدا کہیے!

قطعہ

... ۱۸۳۳ء (قب)

م

کلکتے[1] کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں | اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے! ہائے!
وہ سبزہ زار ہاے مُطرّا کہ ہے غضب! | وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے! ہائے!
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر! | طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے! ہائے!
وہ میوہ ہاے تازۂ شیریں کہ واہ! واہ! | وہ بادہ ہاے نابِ گوارا کہ ہائے! ہائے!

غزلیات

مُند گئیں[2]، کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ
یار لائے مری بالیں پہ اسے، پر کس وقت! م

[1] یہ قطعہ کلکتے سے واپسی کے بعد کہا گیا، اسی لیے پہلی بار قب (بحوالہ نسخۂ عرشی) میں شامل ہوا
[2] یہ شعر پہلی بار قب (بحوالہ نسخۂ عرشی) میں درج ہوا مگر اسی مفہوم کا ایک شعر حاشیہ ق میں پہلے موجود ہے ؎
مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں، ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
اور لطف یہ ہے کہ یہ دونوں شعر دیوانِ غالبؔ متداول کے لیے منتخب ہوئے ہیں

○ ...۱۸۳۳ء (قب[1])

لو، ہم مریضِ عشق کے بیمار دار ہیں م اچھا اگر نہ ہو، تو مسیحا کا کیا علاج

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر؟ م جلتا ہوں، اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے م سرگرمِ نالہ ہائے شرربار دیکھ کر
کیا آبروئے عشق، جہاں عام ہو جفا؟ م رُکتا ہوں، تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
آتا ہے میرے قتل کو، پر جوشِ رشک سے م مرتا ہوں، اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق م لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر
وا حسرتا! کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ م ہم کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھ کر
بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ م لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر
زُنّار باندھ، سُبحۂ صد دانہ توڑ ڈال م رہرو چلے ہے، راہ کو ہموار دیکھ کر
ان آبلوں سے پانو کے گھبرا گیا تھا میں م جی خوش ہوا ہے، راہ کو پُر خار دیکھ کر
کیا بدگماں ہے مجھ سے، کہ آئینے میں مرے م طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی، نہ طور پر م دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
سر پھوڑنا وہ، غالبِ شوریدہ حال کا م یاد آگیا مجھے، تری دیوار دیکھ کر

۱۔ بحوالہ نسخۂ عرشی

○ ...۱۸۳۳ء (قب[1])

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا، وطن سے دُور م رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا م رکھ لیجو، میرے دعویِ وارستگی کی شرم

مہرباں ہو کے بُلا لو مجھے، چاہو جس وقت م میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے؟ م بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو، ستمگر، ورنہ م کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں م کبھی صبا کو، کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئے گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے م کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو م یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
ترے جواہرِ طرفِ کُلہ کو کیا دیکھیں؟ م ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

واں اُس کو ہولِ دل ہے، تو یاں میں ہوں شرمسار م یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
اپنے کو دیکھتا نہیں، ذوقِ ستم تو دیکھ م آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

رہیے اب ایسی جگہ چل کر، جہاں کوئی نہ ہو م ہم سخن کوئی نہ ہو، اور ہم زباں کوئی نہ ہو

۱۔ بحوالہ نسخۂ عرشی

○ ...۱۸۳۳ء (قب[1])

رہیے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے م کوئی ہم سایہ نہ ہو، اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار، تو کوئی نہ ہو تیمار دار م اور اگر مر جائیے، تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر، سو ہے م

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے م

دل سے، تری نگاہ، جگر تک اتر گئی م دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا! لذتِ فراغ م تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں؟ م اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں م بارے اب اے ہوا، ہوسِ بال و پر گئی
دیکھو تو، دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا م موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی م اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا م مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا م کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

[1] بحوالہ نسخۂ عرشی

○ ...۱۸۳۳ء (قب[1])

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں، تمھیں م وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی؟

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے م جاں، کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے
سایے کی طرح ساتھ پھریں، سرو و صنوبر م تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے
تب نازِ گراں مایگیِ اشک بجا ہے م جب لختِ جگر، دیدۂ خونبار میں آوے
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر! م کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے
اس چشمِ فسوں گر کا، اگر پائیے، اشارہ م طوطی کی طرح آئنہ گفتار میں آوے
کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے، یارب م اک آبلہ پا وادیِ پُرخار میں آوے
مر جاؤں نہ کیوں رشک سے؟ جب وہ تنِ نازک م آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار میں آوے
غارت گرِ ناموس، نہ ہو، گر ہوسِ زر م کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے
تب چاکِ گریباں کا مزا ہے، دلِ ناداں! م جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے
آتش کدہ ہے سینہ مرا، رازِ نہاں سے م اے وائے! اگر معرضِ اظہار میں آوے
گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے م جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

رباعیات

۱

آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال م ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی م لڑکوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال

[1] بحوالہ نسخۂ عرشی

○ ...۱۸۳۳ء (قبل)[۱]

۲

دل، سخت نژند ہوگیا ہے، گویا ۔۔۔ اُس سے گلہ مند ہوگیا ہے، گویا

پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں ۔۔۔ ۴ غالبؔ، منہ بند ہوگیا ہے، گویا

۳

دُکھ، جی کے پسند ہوگیا ہے غالبؔ ۔۔۔ دل، رُک رُک کر، بند ہوگیا ہے، غالبؔ

واللہ، کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں! ۔۔۔ ۴ سونا، سوگند ہوگیا ہے، غالبؔ

۱۔ بحوالہ نسخۂ عرشی

۱۸۳۴ء تا ۱۸۴۷ء

مُتفرِّق

اِنتخابِ غالبؔ	۱۸۳۶ء
نسخۂ بدایوں	۱۸۳۸ء
پہلا مطبوعہ ایڈیشن	۱۸۴۱ء
نسخۂ ولیسنہ	۱۸۴۵ء
نسخۂ کریم الدّین (کراچی)	۱۸۴۵ء
دوسرا مطبوعہ ایڈیشن	۱۸۴۷ء

○ ...۱۸۳۵ء

غزلیات

اور تو رکھنے کو ہم دہر میں کیا رکھتے تھے　فقط اک شعر میں اندازِ رسا رکھتے تھے
اس کا یہ حال کہ کوئی نہ ادا سنج ملا　آپ لکھتے تھے ہم اور آپ اٹھا رکھتے تھے
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ　م　ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے[1]

○ ...۱۸۳۸ء (قبا)

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پانو　م　رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو
دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو　م　ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو
بھاگے تھے ہم بہت سو اُسی کی سزا ہے یہ　م　ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو
مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور　م　تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو
اللہ رے! ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ　م　ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو
ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف　م　اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو
بیچارہ کتنی دور سے آیا ہے، شیخ جی　کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پانو[2]

---

[1] گلشنِ بے خار مولفہ آخر ۱۲۵۰ھ (اپریل ۱۸۳۵ء) میں صرف یہی شعر (مقطع) پایا جاتا ہے مگر قبا میں یہ تینوں شعر ایک ساتھ درج ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے اوپر کے دو شعر بھی اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں شعر قطعہ بند ہیں۔

[2] یہ شعر م میں مطبوعہ موجود ہے مگر بعد میں حذف کر دیا گیا۔ تذکرہ سراپا سخن میں پانو والی ردیف میں درج ہے۔ عرشی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ قبا میں بھی موجود ہے۔

○ ...۱۸۳۸ء (قبا)

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں؟　م　دُکھتے ہیں آج اُس بُتِ نازک بدن کے پانو
غالبؔ مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو؟　م　پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

قطعہ

...بعد از ۱۸۳۸ء (حاشیہ قبا)

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری　م　کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی، جانے دو، مل جاؤ　م　قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں: "کیوں ہم نہ کہتے تھے"؟

غزلیات

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے، جا　م　سُن لیتے ہیں، گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالبؔ، ترا احوال سُنا دیں گے ہم اُن کو　م　وہ سُن کے بُلا لیں، یہ اجارا نہیں کرتے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے　م　مرتے ہیں، ولے اُن کی تمنّا نہیں کرتے
در پردہ اُنھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی　م　ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے
یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے　م　غالبؔ کو بُرا کہتے ہو، اچھّا نہیں کرتے

○ ... بعد از ۱۸۳۸ء (حاشیہ قبا)

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے م میرا ذمّہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے
کیا تعجّب ہے، کہ اُس کو دیکھ کر آجائے رحم؟ م واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے
منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب م کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے
یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں م زلف گر بن جاؤں، تو شانے میں اُلجھا دے مجھے

رُباعیات

(۱)

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جمجاہ نے دال م ہے لطف و عنایتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال، بے بحث و جدال م ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

... (بعد از ۱۸۳۸ء-حاشیہ قبا) ۱۸۴۱ء (م) (۲)

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم م آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں، سافل و عالی باہم م ہے اب کے شبِ قدر و دِوالی باہم

غزل

... ۱۸۴۵ء

نویدِ[1] امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لیے م رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

[1] غزل میں نواب تجمّل حسین خاں فرخ آبادی سے متعلق مدحیہ اشعار ہیں۔ نواب صاحب کا انتقال ۹ نومبر ۱۸۴۶ء کو ہوا تھا۔ غزل نسخۂ کراچی مکتوبہ ۳۰ اگست ۱۸۴۵ء میں نہیں ہے لہٰذا اسے ۳۰ اگست ۱۸۴۵ء تا ۹ نومبر ۱۸۴۶ء کی فکر کردہ تسلیم کرنا چاہیے ۔ دیوان ذوق مرتبہ آزاد میں درج ہے کہ یہ غزل نواب اصغر علی خاں نسیم رام پوری مقیم دہلی کے طرحی مشاعرہ منعقدہ ۱۸۴۵ء میں پڑھی گئی تھی۔ ذوق، مومن، داغ وغیرہ بھی موجود تھے۔ گویا مشاعرہ ۱۸۴۵ء میں بعد از ۳۰ اگست منعقد ہوا تھا۔ ظاہر ہے غزل بھی اسی زمانے میں کہی گئی ہو گی

○ ... ۱۸۴۵ء

بلا سے، گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے م رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کے لیے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں رُوشناسِ خلق، اے خضر م نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے
رہا بلا میں بھی، میں مبتلائے آفتِ رشک م بلائے جاں ہے، ادا تیری اک جہاں کے لیے
فلک نہ دور رکھ اُس سے مجھے، کہ میں ہی نہیں م دراز دستیِ قاتل کے امتحاں کے لیے
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر م کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئے م اُٹھا اور اُٹھ کے قدم، میں نے پاسباں کے لیے
بہ قدرِ شوق نہیں، ظرفِ تنگنائے غزل م کچھ اور چاہیے وسعت، مرے بیاں کے لیے
دیا ہے خلق کو بھی، تا اُسے نظر نہ لگے م بنا ہے عیش تجمّل حسین خاں کے لیے
زباں پہ بارِ خدایا، یہ کس کا نام آیا؟ م کہ میرے نُطق نے بوسے مری زباں کے لیے
نصیرِ دولت و دیں اور مُعینِ ملّت و ملک م بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لیے
زمانہ، عہد میں اُس کے، ہے محوِ آرایش م بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے
ورق تمام ہوا، اور مدح باقی ہے م سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے
ادائے خاص سے، غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا م صلائے عام ہے، یارانِ نکتہ داں کے لیے

قطعہ

... ۱۸۴۷ء (م)

نہ پوچھ اس کی حقیقت، حضورِ والا نے م مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خُلد سے باہر م جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

○ ۱۸۴۷ء...

غزلیات

جس دن سے کہ ہم غمزدہ زنجیر بپا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں[1]

۱۸۴۷ء... (م)

کی وفا ہم سے، تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں ۔ ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے ۔ کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انھیں کچھ نہ کہو ۔ جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں
دل میں آجائے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غش سے ۔ اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں
ہے پرے سرحدِ ادراک سے، اپنا مسجود ۔ قبلے کو، اہلِ نظر، قبلہ نُما کہتے ہیں
پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے ۔ خارِ رہ کو ترے، ہم مہر گیا کہتے ہیں
اک شرر دل میں ہے، اُس سے کوئی گھبرائے گا کیا؟ ۔ آگ مطلوب ہے ہم کو، جو ہوا کہتے ہیں
دیکھیے، لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ ۔ اُس کی ہر بات پہ، ہم "نامِ خدا" کہتے ہیں
وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید ۔ "مرگیا غالبِ آشفتہ نوا" کہتے ہیں

---

[1] یہ ہنگامی مطلع عہدِ اسیری کی یادگار ہے۔ دیکھیے کلامِ (گھنشیام لال) عاصی مطبوعہ ۱۹۳۹ء، آبِ حیات از آزاد میں پہلا مصرعہ یوں ہے ـــ
ہم غمزدہ جس دن سے گرفتارِ بلا ہیں

○ ۱۸۴۷ء... (م)

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں ۔ اک چھیڑ ہے، وگرنہ مُراد امتحاں نہیں
کس منہ سے شکر کیجیے اِس لطفِ خاص کا؟ ۔ پُرسش ہے، اور پائے سخن درمیاں نہیں
ہم کو ستم عزیز، ستم گر کو ہم عزیز ۔ نامہرباں نہیں ہے، اگر مہرباں نہیں
بوسہ نہیں، نہ دیجیے، دُشنام ہی سہی ۔ آخر زباں تو رکھتے ہو تم، گر دہاں نہیں
ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے ۔ ہر چند پشت گرمیِ تاب و تواں نہیں
جاں مطربِ ترانۂ "ھَل مِن مَزید" ہے ۔ لب پردہ سنجِ زمزمۂ "اَلاَماں" نہیں
خنجر سے چیر سینہ، اگر دل نہ ہو دو نیم ۔ دل میں چُھری چبھو، مژہ گر خونچکاں نہیں
ہے ننگِ سینہ، دل اگر آتش کدہ نہ ہو ۔ ہے عارِ دل، نفس اگر آذر فشاں نہیں
نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب ۔ سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں
کہتے ہو "کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں؟" ۔ گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں
پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی ۔ رُوح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں
جاں ہے بہائے بوسہ، ولے کیوں کہے ابھی؟ ۔ غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

ملتی ہے خوئے یار سے، نارِ التہاب میں ۔ کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہانِ خراب میں؟ ۔ شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
تا پھر نہ انتظار میں، نیند آئے عمر بھر ۔ آنے کا عہد کر گئے، آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے، خط اک اور لکھ رکھوں ۔ میں جانتا ہوں، جو وہ لکھیں گے جواب میں

... ۱۸۴۷ء (م)

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟ م ساقی نے کچھ مِلا نہ دیا ہو شراب میں

جو مُنکرِ وفا ہو، فریب اُس پہ کیا چلے؟ م کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے؟ م ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں؟

میں اور حظِّ وصل، خدا ساز بات ہے م جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندرِ نقاب کے م ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ، ایک چُرانا نگاہ کا م لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ، دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے! م جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر، مدّعا طلبی میں نہ کام آئے! م جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالبؔ چھُٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی م پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہ تاب میں

کل کے لیے، کر آج نہ خسّت شراب میں م یہ، سُوءِ ظن ہے، ساقیِ کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند م گستاخیِ فرشتہ، ہماری جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع؟ م گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں، دیکھیے، تھمے م نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

اُتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے م جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شُہود و شاہد و مشہود ایک ہے م حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر م یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

○ ... ۱۸۴۷ء (م)

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی م ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرایشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز م پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود م ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

غالبؔ ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست م مشغولِ حق ہوں، بندگیِ بوتراب میں

بعد از ۱۸۴۷ء

۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۲ء

مُتفرّق

نسخۂ لاہور

۱۸۵۲ء

○ ...بعد از ۱۸۴۷ء[1]

قطعہ

۴

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر — اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ — فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

تیرا اندازِ سخن، شانۂ زلفِ الہام — تیری رفتارِ قلم، جنبشِ بالِ جبریل

تجھ سے عالم پہ کھُلا رابطۂ قربِ کلیم — تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

بہ سخن، اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ — بہ کرم، داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل

ق تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر — تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر — زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

تیری دانش، مری اصلاحِ مفاسد کی رہین — تیری بخشش مرے انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترحّم، مرے جینے کی نوید — تیرا اندازِ تغافل، مرے مرنے کی دلیل

---

[1] عرشی صاحب (دیوانِ غالب طبع دوم مرتبہ عرشی ص ۱۳۲) لکھتے ہیں کہ غالب کی زندگی میں چھپے ہوئے دیوانِ غالب کے دوسرے ایڈیشن، مملوکہ رضا لائبریری رامپور" کے آخری سادہ اوراق پر میرزا صاحب کا وہ کلام نقل کیا گیا ہے جو انھوں نے اس دیوان کی اشاعت کے بعد کہا تھا۔" اتفاق سے میرے غالب کلکشن میں بھی، غالب کی زندگی میں چھپے ہوئے دوسرے ایڈیشن کا نسخہ موجود ہے اور اس کے آخر میں بھی تقریباً وہی تمام کلام کسی نامعلوم شخص کے قلم سے درج ہے جس کی نشاندہی عرشی صاحب نے کی ہے بلکہ میرے نسخے میں کچھ کلام زائد ہے میں نے اسے بھی شامل کر لیا ہے۔ ایسے کلام کو ۱۸۴۷ء کے بعد چند ہی سالوں کے دوران میں کا کہا ہوا کہنا چاہیے۔ اس نسخے میں جو کلام "بعد از ۱۸۴۷ء" کے عنوان سے درج ہے وہ یہی کلام ہے۔

○ ... بعد از ۱۸۴۷ء

بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں ق چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے، سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل
تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل
دُرِ معنی سے، مرا صفحہ، لقا کی داڑھی غمِ گیتی سے، مرا سینہ، عَمر کی زنبیل
فکر میری، گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر کِلک میری، رقم آموزِ عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدّق، توضیح میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل
نیک ہوتی مری حالت، تو نہ دیتا تکلیف جمع ہوتی مری خاطر، تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں، خستہ نوازی میں یہ دیر؟
کعبۂ امن و اماں، عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل؟

غزلیات

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں! م گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا؟
ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں م وہ دن گئے کہ اپنا، دل سے جگر جدا تھا
درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے، تو جانوں م جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی تو، ویراں ہوتا م بحر گر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا
تنگیِ دل کا گلہ کیا؟ یہ وہ کافر دل ہے م کہ اگر تنگ نہ ہوتا، تو پریشاں ہوتا

○ ... بعد از ۱۸۴۷ء

بعدِ یک عمرِ وَرَع، بار تو دیتا، بارے م کاش! رضواںؔ ہی درِ یار کا درباں ہوتا

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا م آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بے جا ہے، مجھے اپنی تباہی کا گلہ م اُس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو، تو پتا بتلا دوں م کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا؟
قید میں ہے، ترے وحشی کو، وہی زلف کی یاد م ہاں کچھ اک رنجِ گراں باریِ زنجیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے، تو کیا؟ م بات کرتے، کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا
یوسفؔ اُس کو کہوں، اور کچھ نہ کہے، خیر ہوئی م گر بگڑ بیٹھے، تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا
دیکھ کر غیر کو، ہو کیوں نہ، کلیجا ٹھنڈا؟ م نالہ کرتا تھا، ولے طالبِ تاثیر بھی تھا
پیشے میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہادؔ کو نام م ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا
ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا، نہ سہی م آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق م آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟
ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو، غالبؔ م کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا م اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جیے ہم، تو یہ جان، جھوٹ جانا م کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا م کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر اُستوار ہوتا

○ ... بعد از ۱۸۴۷ء

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو م یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح؟ م کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا م جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گُسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے م غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے؟ شبِ غم بُری بلا ہے م مجھے کیا بُرا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رُسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا م نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا
اُسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا م جو دوئی کی بو بھی ہوتی، تو کہیں دوچار ہوتا
یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان، غالبؔ! م تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

نہ تھا کچھ، تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خدا ہوتا م ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں، تو کیا ہوتا؟
ہوا جب غم سے یوں بے حِس، تو غم کیا سر کے کٹنے کا؟ م نہ ہوتا گر جُدا تن سے، تو زانو پر دھرا ہوتا
ہوئی مدّت کہ غالبؔ مر گیا، پر یاد آتا ہے م وہ ہر اک بات پر کہنا کہ "یوں ہوتا، تو کیا ہوتا"

گھر جب بنا لیا ترے در پر، کہے بغیر م جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر، کہے بغیر؟
کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن م جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر، کہے بغیر؟
کام اُس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں م لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر
جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے، وگرنہ ہم م سر جائے یا رہے، نہ رہیں پر کہے بغیر

○ ... بعد از ۱۸۴۷ء

چھوڑوں گا میں نہ اُس بُتِ کافر کا پوجنا م چھوڑے نہ خلق، گو، مجھے کافر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ، ولے گفتگو میں کام م چلتا نہیں ہے، دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو م بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
بہرا ہوں میں، تو چاہیے دُونا ہو التفات م سنتا نہیں ہوں بات، مکرّر کہے بغیر
غالبؔ، نہ کر حضور میں تو بار بار عرض م ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر، کہے بغیر

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو م مجھ کو بھی پوچھتے رہو، تو کیا گناہ ہو
بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے م قاتل اگر رقیب ہے، تو تم گواہ ہو
کیا وہ بھی بے گنہ کُش و حق ناسپاس ہیں؟ م مانا کہ تم بشر نہیں، خُرشید و ماہ ہو
اُبھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار م مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب میکدہ چُھٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید م مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
سُنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست م لیکن خدا کرے، وہ ترا جلوہ گاہ ہو
غالبؔ بھی گر نہ ہو، تو کچھ ایسا ضرر نہیں م دنیا ہو، یارب، اور مرا بادشاہ ہو

تسکیں کو ہم نہ روئیں، جو ذوقِ نظر ملے م حورانِ خلد میں تری صورت، مگر، ملے
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن، بعدِ قتل م میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے؟
ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم م ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے، جس قدر ملے

○ ... بعد از ۱۸۴۷ء

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن اے ندیم م میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے
تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا م فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں م جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
اے ساکنانِ کوچۂ دلدار، دیکھنا م تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

کوئی دن گر زندگانی اور ہے م اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟ م سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں م پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
دے کے خط، مُنہ دیکھتا ہے نامہ بر م کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
قاطعِ اعمار ہیں، اکثر نجوم م وہ بلائے آسمانی اور ہے
ہو چکیں، غالبؔ، بلائیں سب تمام م ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کوئی اُمید بر نہیں آتی م کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن مُعیّن ہے م نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی، حالِ دل پہ ہنسی م اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد م پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں م ورنہ، کیا بات کر نہیں آتی

○ ... بعد از ۱۸۴۷ء

کیوں نہ چیخوں؟ کہ یاد کرتے ہیں م میری آواز، گر، نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا م بُو بھی، اے چارہ گر! نہیں آتی
ہم وہاں ہیں، جہاں سے ہم کو بھی م کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی م موت آتی ہے، پر نہیں آتی
کعبے کس مُنہ سے جاؤگے، غالبؔ؟ م شرم تم کو مگر نہیں آتی

دلِ ناداں، تجھے ہوا کیا ہے؟ م آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
ہم ہیں مشتاق، اور وہ بیزار م یا الٰہی، یہ ماجرا کیا ہے؟
میں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہوں م کاش! پوچھو کہ "مدّعا کیا ہے"

ق

جب کہ تجھ بِن نہیں، کوئی موجود م پھر یہ ہنگامہ، اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ م غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟ م نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ م ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمّید م جو نہیں جانتے، وفا کیا ہے؟
"ہاں، بھلا کر، ترا بھلا ہوگا!" م اور درویش کی صدا کیا ہے؟

○ ... بعد از ۱۸۴۷ء

جان تم پر نثار کرتا ہوں م میں نہیں جانتا، دعا کیا ہے؟
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ م مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟

حُسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال، اچھا ہے م اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ م جی میں کہتے ہیں کہ "مفت آئے تو مال اچھا ہے"
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا م ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال، اچھا ہے
بے طلب دیں تو مزا اُس میں سوا ملتا ہے م وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق م وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
دیکھیے پاتے ہیں عُشّاق بتوں سے کیا فیض م اک برہمن نے کہا ہے کہ "یہ سال اچھا ہے"
ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا م جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال، اچھا ہے!
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے م کام اچھا ہے وہ، جس کا کہ مآل اچھا ہے
خضر سلطاں[1] کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز م شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

---

[1] بہادر شاہ ظفرؔ کے ۱۶ ار بیٹوں میں سے آٹھویں بیٹے اور غالبؔ کے شاگرد۔ ۲۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کو میجر ہڈسن کی گولی کا نشانہ بنے (بہادر شاہ ظفرؔ۔ از اسلم پرویز ص ۱۷۵)۔ وفات کے وقت عمر ۲۶ سال سے متجاوز نہیں تھی۔ (تلامذۂ غالبؔ طبعِ دوم ص ۱۷۴)۔ اس طرح سالِ ولادت ۱۸۳۱ء ہوا۔

جناب مالک رام نے لکھا ہے کہ "خالقِ اکبر" سے یہاں اس شعر میں اکبر شاہ ثانی کی طرف اشارہ ہے جو خضر سلطان کے دادا تھے۔ اور جو ۱۸۰۶ء سے ۱۸۳۷ء تک حکمران رہے۔ میری رائے میں اس کا مطلب بیش از بیش یہ نکل سکتا ہے کہ کبھی یہ شعر غالبؔ نے ۱۸۳۱ء میں شہزادہ خضر سلطان کی ولادت (تازہ نہال) پر کہہ کر حافظے میں رکھا ہوگا۔ جب برسوں (۱۸۴۷ء کے) بعد اس زمین میں غزل کہی تو اسی میں اس شعر کو بھی شامل کر دیا۔

○ ... بعد از ۱۸۴۷ء

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن م دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے م
یہ بھی مت کہہ، کہ جو کہیے، تو گِلا ہوتا ہے
پُر ہوں میں، شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا م
اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے
گو سمجھتا نہیں پر حُسنِ تلافی دیکھو م
شکوۂ جَور سے، سرگرمِ جفا ہوتا ہے
عشق کی راہ میں، ہے چرخِ مُکوکب کی وہ چال م
سُست رَو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد؟ کہ ہم م
آپ اُٹھا لاتے ہیں، گر تیر خطا ہوتا ہے
خوب تھا، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بد خواہ م
کہ بھلا چاہتے ہیں، اور بُرا ہوتا ہے
نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا، اور اب م
لب تک آتا ہے، جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

○ ... بعد از ۱۸۴۷ء

ق

خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن م
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اے شہنشاہِ کواکب سپہ مہرِ عَلَم! م
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے م
تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال م
آستاں پر ترے، مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں، آئینِ غزل خوانی میں م
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

رکھیو غالبؔ، مجھے اس تلخ نوائی میں معاف م
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے؟" م تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟
نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا م کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے؟
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے م وگرنہ خوفِ بدآموزیِ عدو کیا ہے؟
چپک رہا ہے بدن پر لہو سے، پیراہن م ہمارے جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے؟

○ ... بعد از ۱۸۴۷ء

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا م کریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے؟
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل م جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے؟
وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز م سوائے بادۂ گلفامِ مُشک بو کیا ہے؟
پیوں شراب اگر خُم بھی دیکھ لوں دو چار م یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے؟
رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی م تو کس اُمید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے؟
ہوا ہے شہ کا مُصاحب، پھرے ہے اتراتا م وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے؟

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی م میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی م ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر م دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے م وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ م کچھ نہ سمجھے، خُدا کرے کوئی
نہ سُنو، گر بُرا کہے کوئی م نہ کہو، گر بُرا کرے کوئی
روک لو، گر غلط چلے کوئی م بخش دو، گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند؟ م کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے! م اب کسے رہنما کرے کوئی
جب توقع ہی اُٹھ گئی، غالبؔ م کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

○ ... بعد از ۱۸۴۷ء

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے م بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہوا کیے

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا م میں اور جاؤں در سے ترے بِن صدا کیے؟

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجّادہ رہن مے م مُدّت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر م حضرت بھی کل کہیں گے کہ "ہم کیا کیا کیے"

مقدور ہو، تو خاک سے پوچھوں کہ "اے لئیم م تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے؟"

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو؟ م کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو م دینے لگا ہے بوسہ، بغیر التجا کیے

ضد کی ہے اور بات، مگر خو بری نہیں م بھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

غالبؔ، تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا م مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

میں اُنہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں م چل نکلتے، جو مے پیے ہوتے

قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو م کاشکے! تم مرے لیے ہوتے

میری قسمت میں غم، گر، اتنا تھا م دل بھی یارب، کئی دیے ہوتے

آ ہی جاتا وہ راہ پر، غالبؔ! م کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

... ۲۲ [۲۱] فروری ۱۸۴۸ء[1]

ذکر اُس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا م بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے "تلاشِ غالبؔ" از ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ص ۱۳۳۔ مضمون "حادثۂ اسیری اور غالبؔ (ایک غزل کا زمانۂ تصنیف)"۔

○ ... ۲۲ [۲۱] فروری ۱۸۴۸ء

مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں، یارب م آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے م عرش سے اِدھر ہوتا، کاشکے! مکاں اپنا

دے وہ جس قدر ذلّت ہم ہنسی میں ٹالیں گے م بارے، آشنا نکلا، اُن کا پاسباں، اپنا

دردِ دل لکھوں کب تک؟ جاؤں اُن کو دکھلادوں م انگلیاں فِگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا

گھستے گھستے مٹ جاتا، آپ نے عبث بدلا م ننگِ سجدہ سے میرے، سنگِ آستاں اپنا

تا کرے نہ غمّازی، کرلیا ہے دشمن کو م دوست کی شکایت میں، ہم نے ہم زباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے؟ کس ہنر میں یکتا تھے؟ م بے سبب ہوا، غالبؔ! دشمن آسماں اپنا

○ ... ۱۸۴۹ء

قطعہ

مژدہ! اے رہروانِ راہِ سخن م پایہ سنجانِ دست گاہِ سخن[1]

طے کرو راہِ شوق زُودا زُود م آن پہنچی ہے منزلِ مقصود!

پاس ہے اب، سوادِ اعظمِ نثر م دیکھیے، چل کے، نظمِ عالمِ نثر

سب کو اُس کا سواد ارزانی! م چشمِ بینش ہو جس سے نورانی

یہ تو دیکھو کہ کیا نظر آیا م جلوۂ مدّعا نظر آیا

ہاں، یہی شاہراہِ دہلی ہے م مطبعِ بادشاہِ دہلی ہے

منطبع ہو رہی ہے بہ پنج آہنگ م گل و ریحان و لالہ رنگا رنگ

---

[1] منظوم اشتہار (اسعد الاخبار آگرہ ۔ ۱۲ مارچ ۱۸۴۹ء)۔ یہ اشتہار غالبؔ کے شاگرد غلام نجف خاں کے نام سے چھپا تھا

○ ...۱۸۴۹ء

ہے یہ وہ گلشنِ ہمیشہ بہار   بارور جس کا سرو، گل بے خار
نہیں اس کا جواب، عالم میں   نہیں ایسی کتاب، عالم میں
اس سے اندازِ شوکتِ تحریر   اخذ کرتا ہے آسماں کا دبیر
مرحبا! طرزِ نغز گفتاری   حبذا! رسم و راہِ نثّاری
نثر مدحت سرائے ابراہیم   ہے مقرّر جو، اب، پئے تعلیم
اُس کے فقروں میں کون آتا ہے؟   کیا کہیں، کیا وہ راگ گاتا ہے
تین نثروں سے کام کیا نکلے؟   اُن کے پڑھنے سے نام کیا نکلے؟
ورزشِ قصّۂ کہن کب تک؟   داستانِ شہِ دکن کب تک؟
تا کجا درسِ نثر ہائے کہن؟   تازہ کرتا ہے دل کو تازہ سخن
تھے ظہوری و عرفی و طالب   اپنے اپنے زمانے میں غالب
نہ ظہوری ہے اور نہ طالب ہے   اسداللہ خانِ غالب ہے
قول حافظ کا ہے بجا، اے دوست   "ہر کرا پنج روز نوبتِ اوست"
کل وہ سرگرمِ خود نمائی تھے   شمعِ بزمِ سخن سرائی تھے
آج یہ قدر دانِ معنی ہے   بادشاہِ جہانِ معنی ہے
نثر اس کی، ہے کارنامۂ راز   نظم اس کی، نگارنامۂ راز
دیکھو اس دفترِ معانی کو   سیکھو آئینِ نکتہ دانی کو
اس سے جو کوئی بہرہ ور ہو گا   سینہ گنجینۂ گہر ہو گا

○ ...۱۸۴۹ء

ہو سخن کی جسے طلب گاری   کرے اس نسخے کی خریداری
آج جو دیدہ ور کرے درخواست   تین بھیجے روپے، وہ بے کم و کاست
منطبع جب کہ ہو چکے گی کتاب   زرِ قیمت کا ہو گا اور حساب
چار سے، پھر نہ ہو گی کم قیمت   اس سے لیویں گے، کم نہ ہم، قیمت
جس کو منظور ہو کہ زر بھیجے   احسن اللہ خاں کے گھر بھیجے
وہ بہارِ ریاضِ مہر و وفا   جس کو کہتے ہیں عمدۃ الحکما
میں جو ہوں درپئے حصولِ شرف   نام عاصی کا ہے غلام نجف
ہے یہ، القصّہ، حاصلِ تحریر   کہ نہ ارسالِ زر میں ہو تاخیر

چشمۂ انطباع جاری ہے
ابتدائے ورق شماری ہے

غزلیات

○ ...۱۸۴۹ء (آخرِ ما)

حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں   م   مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں   م   ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار   م   اے کاش! جانتا نہ ترے رہ گزر کو میں
ہے کیا جو کس کے باندھیے؟ میری بلا ڈرے   م   کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں؟
لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ "یہ بے ننگ و نام ہے"   م   یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

○ ... ۱۸۴۹ء (آخرِ ما)

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رَو کے ساتھ　م　پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار　م　کیا پوجتا ہوں اُس بُتِ بیداد گر کو میں؟

پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوے یار　م　جاتا، وگرنہ، ایک دن اپنی خبر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا　م　سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں

غالبؔ، خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز　م　دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں[1]

... ۱۸۵۰ء (آخرِ ما)

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں　م　خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مُدام سے گھبرا نہ جاے دل؟　م　انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب، زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟　م　لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے　م　آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟　م　لعل و زمُرّد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟　م　رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لیے؟　م　کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں؟

غالبؔ، وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا　م　وہ دن گئے کہ کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں"[2]

---

[1] نواب علی بہادر، والیِ باندہ، اگست ۱۸۴۹ء میں حاکم باندہ ہوئے۔ وفات ۱۸۷۳ء

[2] غالبؔ ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو بادشاہ کے باقاعدہ ملازم ہوئے تھے

○ ... ۱۸۵۰ء

رباعیات[1]

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری　　کہتے ہیں وہ مجھ کو رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی؟　　شیعی کیوں کر ہو، ماوَرَا النّہری؟

اصحاب کو جو کہ ناسزا کہتے ہیں　　سمجھیں تو ذرا دل میں کہ کیا کہتے ہیں
سمجھا تھا نبیؐ نے ان کو اپنا ہمدم　　ہے ہے! نہ کہو کسے بُرا کہتے ہیں

یارانِ رسولؐ، یعنی اصحابِ کبار　　ہیں گرچہ بہت، خلیفہ اُن میں ہیں چار
ان چار میں ایک سے ہو جس کو انکار　　غالبؔ، وہ مسلمان نہیں ہے زنہار

یارانِ نبیؐ میں تھی لڑائی کس میں؟　　الفت کی نہ تھی جلوہ نمائی کس میں؟
وہ صدق، وہ عدل، وہ حیا اور وہ علم　　بتلاؤ کوئی کہ تھی برائی کس میں؟

یارانِ نبیؐ سے رکھ تولّا، باللہ!　　ہر یک ہے کمالِ دیں میں یکتا باللہ!
وہ دوست نبیؐ کے اور تم ان کے دشمن　　لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ!

---

[1] یہ پانچوں رباعیاں سید الاخبار دہلی، جلد ۸ شمارہ ۲۸ - ۱۶ نومبر ۱۸۵۰ء میں شائع ہوئی تھیں

○ ... ۱۸۵۱ء

غزلیات

منظور تھی یہ شکل تجلّی کو، نور کی　م　قسمت کھُلی، ترے قد و رخ سے، ظہُور کی

اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں　م　پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

واعظ، نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو　م　کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل، کہ کیوں اُٹھا؟　م　گویا، ابھی سُنی نہیں آوازِ صُور کی

آمد بہار کی ہے، جو بلبل ہے نغمہ سنج　م　اُڑتی سی اک خبر ہے، زبانی طُیور کی

گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں　م　کعبے سے اُن بتوں کو بھی، نسبت ہے دُور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب؟　م　آؤ نہ، ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اِس قدر　م　کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

غالبؔ اگر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں　م　حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی[1]

---

[1] بادشاہ کی اپنی صحت بھی خراب تھی چنانچہ "دسمبر ۱۸۵۱ء میں ریذیڈنٹ دہلی نے رپورٹ بھیجی کہ بادشاہ بیمار اور زندگی سے بیزار ہے، اور حج کے لیے مکّہ معظمہ جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ غالباً غالبؔ نے اسی موقعہ پر کہا تھا سے

غالبؔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی"

(آثارِ غالبؔ از شیخ محمد اکرام ص ۹۸)

غزل کی فکر کا زمانہ بھی آخرِ ۱۸۵۱ء ہی ہونا چاہیے

○ ... ۱۸۵۱ء

یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وہ آئے"[1]　م　کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مو آئے

ہُوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت　م　کچھ کہہ نہ سکوں، پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

ہے[2] زلزلہ و صرصر و سیلاب کا عالم　م　آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین　م　ہاں مُنہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

جلّاد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھگڑتے　م　ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

ہاں اہلِ طلب، کون سنے طعنۂ نایافت؟　م　دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے

اپنا وہ نہیں شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں　م　اُس در پہ نہیں بار، تو کعبے ہی کو ہو آئے

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر　م　اچھے رہے آپ اُس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے، غالبؔ!　م　ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

قصیدہ[3]

... ۱۸۵۲ء (ق ج)

م

ہاں، مہِ نو، سُنیں ہم اُس کا نام　م　جس کو تو جھُک کے، کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح　م　یہی انداز اور یہی اندام

بارے، دو دن کہاں رہا غائب؟　م　بندہ عاجز ہے، گردشِ ایّام

---

[1] نادراتِ غالبؔ ص ۱۲ اور دہلی اردو اخبار، جلد ۱۳ نمبر ۱۹، ص ۴، مورخہ ۱۱ مئی ۱۸۵۱ء

[2] ج میں ہے "ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم" ہے مگر انتخابِ غالبؔ (رخ) مکتوبہ ۱۸۶۶ء میں غالبؔ نے اسے اوپر کے مصرعے سے بدل دیا تھا

[3] ق ج = "در مدح شہنشاہ جم جاہ سلیمان بارگاہ سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی"

○ ... ۱۸۵۲ء (تج)

اُڑ کے جاتا کہاں ؟ کہ تاروں کا   آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا ! اے سرورِ خاصِ خواص   حبّذا ! اے نشاطِ عامِ عوام
عذر میں ، تین دن نہ آنے کے   لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا   صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا   تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے ؟   مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام ؟
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں   ایک ہی ہے امید گاہِ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش   غالبؔ اُس کا ، مگر نہیں ہے ، غلام ؟
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو   تب کہا ہے بہ طرزِ استفہام
مہرِ تاباں کو ہو تو ہو ، اے ماہ   قُربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

ق

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا ؟   جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام
جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو   پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن ، ماہتاب بن ، میں کون ؟   مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو اِنعام
میرا اپنا جُدا معاملہ ہے   اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص   گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ   کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام ؟

○ ... ۱۸۵۲ء (تج)

جب کہ چودہ منازلِ فلکی   کر چکے قطع ، تیری ، تیزیِ گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر   کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز   اپنی صورت کا ، اک بلوریں جام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا   توسنِ طبع چاہتا تھا لگام
زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام   غزل   تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام
مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں ؟   غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام
بوسہ کیسا ؟ یہی غنیمت ہے   کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام
کعبے میں جا ، بجائیں گے ناقوس   اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
اُس قدح کا ، ہے ، دَور مجھ کو نقد   چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ وام
بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار   دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام
چھیڑتا ہوں کہ ، اُن کو غصہ آئے   کیوں رکھوں ، ورنہ ، غالبؔ اپنا نام ؟
کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ   اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام !
کون ہے ؟ جس کے در پہ ناصیہ سا   ہیں مہ و مہر و زُہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا ، تو مجھ سے سُن   نامِ شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل ، بہادر شاہ   مظہرِ ذوالجلال والاکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف   نو بہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز   جس کا ہر قول ، معنیِ الہام

○ ...۱۸۵۲ء (قج)

بزم میں، میزبانِ قیصر و جم — رزم میں، اوستادِ رستم و سام
اے ترا لطف، زندگی افزا! — اے ترا عہد، فرخی فرجام
چشمِ بد دور! خسروانہ شکوہ — لوحش اللہ! عارفانہ کلام
جاں نثاروں میں تیرے، قیصرِ روم — جرعہ خواروں میں تیرے، مرشدِ جام
وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے — ایرج و تور و خسرو و بہرام
زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے — گیو و گودرز و بیژن و رہام
مرحبا موشگافیِ ناوک! — آفریں آب داریِ صمصام!
تیر کو تیرے، تیرِ غیر، ہدف — تیغ کو تیری، تیغِ خصم، نیام

ق

رعد کا، کر رہی ہے کیا، دم بند! — برق کو دے رہا ہے کیا الزام
تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا — تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

ق

فنِ صورت گری میں، تیرا گرز — گر نہ رکھتا ہو دست گاہِ تمام
اس کے مضروب کے سر و تن سے — کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام؟
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے — صفحہ ہائے لیالی و ایام
اور ان اوراق میں بہ کلکِ قضا — مجملاً مندرج ہوئے احکام
لکھ دیا شاہدوں کو "عاشق کش" — لکھ دیا عاشقوں کو "دشمن کام"

○ ...۱۸۵۲ء (قج)

آسماں کو، کہا گیا کہ کہیں — "گنبدِ تیز گردِ نیلی فام"
حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں — خال کو "دانہ" اور زلف کو "دام"
آتش و آب و باد و خاک نے لی — وضعِ سوز و نم و رم و آرام
مہرِ رخشاں کا نام "خسروِ روز" — ماہِ تاباں کا اسم "شحنۂ شام"
تیری توقیعِ سلطنت کو بھی — دی بدستور، صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے، بموجبِ حکم — اس رقم کو دیا طرازِ دوام
ہے ازل سے روائیِ آغاز — ہو ابد تک رسائیِ انجام

قصیدہ

م

صبح دم، دروازۂ خاور کھلا — مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں — شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود — صبح کو، رازِ مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکا، یہ بازی گر کھلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا، رات کو — موتیوں کا، ہر طرف، زیور کھلا
صبح آیا، جانبِ مشرق، نظر — اک نگارِ آتشیں رخ، سر کھلا
تھی نظر بندی، کیا جب ردِ سحر — بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

○ ...۱۸۵۲ء (قچ)

لا کے، ساقی نے صبوحی کے لیے
رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تاجِ زرّیں، مہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے مُنہ پر کھلا

شاہِ روشن دل، بہادر شہ، کہ ہے
رازِ ہستی اُس پہ سرتاسر کھلا

وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں
مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے
عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام
اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

رُوشناسوں کی جہاں فہرست ہے
واں لکھا ہے، چہرۂ قیصر کھلا

ق

توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب
تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا

نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب
تو کہے، بُت خانۂ آذر کھلا

مجھ پہ، فیضِ تربیت سے شاہ کے
منصبِ مہر و مہ و محور کھلا

لاکھ عقدے دل میں تھے، لیکن ہر ایک
میری حدِّ وُسع سے باہر کھلا

تھا، دلِ وابستہ، قفلِ بے کلید
کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیونکر کھلا؟

باغِ معنی کی، دکھاؤں گا بہار
مجھ سے، گر، شاہِ سخن گستر کھلا

ہو جہاں گرمِ غزلخوانی نَفَس
لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

○ ... ۱۸۵۲ء (قچ)

غزل

کُنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
کاش کے! ہوتا قفس کا در کھلا

ہم پکاریں اور کھلے، یوں کون جائے؟
یار کا دروازہ پاویں، گر، کھلا

ہم کو ہے اُس رازداری پر گھمنڈ
دوست کا، ہے رازِ دشمن پر کھلا

واقعی، دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم، لیکن، داغ سے بہتر کھلا

ہاتھ سے رکھ دی، کب ابرو نے کماں؟
کب کمر سے، غمزے کی خنجر کھلا

مفت کا، کس کو بُرا ہے، بدرقہ
رہروی میں، پردۂ رہبر کھلا

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک؟
آگ بھڑکی، مینہ اگر دم بھر کھلا

نامے کے ساتھ آ گیا پیغامِ مرگ
رہ گیا، خط میری چھاتی پر، کھلا

دیکھیو، غالبؔ سے گر اُلجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر، ہوا مدحت طرازی کا خیال
پھر، مہ و خورشید کا دفتر کھلا

خامے سے پائی، طبیعت نے، مدد
بادباں بھی، اٹھتے ہی لنگر، کھلا

مدح سے، ممدوح کی دیکھی شکوہ
یاں، عَرَض سے، رتبۂ جوہر کھلا

مہر کانپا، چرخ چکّر کھا گیا
بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب
اب، عُلوِ پایۂ منبر کھلا

سکّۂ شہ کا، ہوا ہے روشناس
اب، عیارِ آبروے زر کھلا

○ ۱۸۵۲... ء (قچ)

شاہ کے آگے دھرا ہے آئنہ — اب مآلِ سعی اسکندر کھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے — اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا
ہو سکے کیا مدح؟ ہاں، اک نام ہے — دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا
فکر اچھی، پر ستایش ناتمام — عجزِ اعجازِ ستایش گر کھلا
جانتا ہوں، ہے خطِ لوحِ ازل — تم پہ، اے خاقانِ نام آور، کھلا
تم کرو صاحب قرانی، جب تلک — ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

سہرا[1] ۱۸۵۲... ء

خوش ہو، اے بخت، کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ، شہزادہ جواں بخت کے سر پر، سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے، پر اے طرفِ کلاہ!
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر، سہرا

[1] مرزا جواں بخت کی "شادی کی تاریخیں یکم و دوم ماہ اپریل ۱۸۵۲ء بتائی جاتی ہیں

○ ۱۸۵۲... ء

ناؤ بھر کر ہی، پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ، کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اِس انداز کا گز بھر سہرا
رخ پہ دولھا کے جو، گرمی سے پسینا ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر، سہرا
یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا، آن کے دامن کے برابر، سہرا
جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے، پھولوں کا بھی ایک مقرر، سہرا
جب کہ اپنے میں سماویں نہ، خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر، سہرا؟
رخِ روشن کی دمک، گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر، سہرا؟
تار ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گرانباریِ گوہر، سہرا؟

○ ...۱۸۵۲ء

ہم سخنِ فہم ہیں، غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں، اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھ کر سہرا

قطعہ

م

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری، ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رَو ہوں، اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں؟
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے، شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ؟ ہاں اس سے مدّعا
جُز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زِ رہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اُس سے قطعِ محبّت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو، تو روسیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

قسمت بُری سہی، پہ طبیعت بُری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب، خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے[1]

[1] جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے، یہ قطعہ (معذرت نامہ) شہزادہ جواں بخت کے سہرے کے مقطع کی وضاحت میں کہا گیا تھا، اس لیے اِسے سہرے کے فوراً بعد درج کیا گیا ہے۔ قطعہ دہلی اردو اخبار جلد ۱۴ نمبر ۱۳ مورخہ ۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا تھا

○ ...۱۸۵۲ء

سہرا

چرخ تک دھوم ہے، کس دھوم سے آیا سہرا!
چاند کا دائرہ لے، زہرہ نے گایا سہرا[1]

جسے کہتے ہیں خوشی، اُس نے بلائیں لے کر
کبھی چوما، کبھی آنکھوں سے لگایا سہرا

رشک سے لڑتی ہیں آپس میں اُلجھ کر لڑیاں
باندھنے کو جو ترے سر پہ اُٹھایا سہرا

صاف آتی ہیں نظر آبِ گہر کی لہریں
جنبشِ بادِ سحر نے جو ہلایا سہرا

○ ...۱۸۵۲ء (ق)

غزلیات

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھُلا م
رکھیو، یارب، یہ درِ گنجینۂ گوہر کھُلا

شب ہوئی، پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھُلا م
اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھُلا

گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب م
آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھُلا

گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں، گو نہ پاؤں اُس کا بھید م
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھُلا

ہے خیالِ حُسن میں حسنِ عمل کا سا خیال م
خلد کا اک در ہے، میری گور کے اندر کھُلا

[1] یہ اس سہرے کے اشعار ہیں جو میاں غلام نظام الدین ابن میاں غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب کی شادی کے موقع پر کہے گئے تھے۔ روایت کے مطابق یہ سہرا شہزادہ جواں بخت (فروری۔ مارچ ۱۸۵۲ء) کے سہرے کے بعد کہا گیا ہے کیونکہ راوی کا کہنا ہے کہ یہ اول الذکر سہرے سے بہتر ہے۔ تفصیل کے لیے ناصر نذیر فراق کی 'لال قلعہ کی ایک جھلک'، بار سوئم، ص (۳۴۶) 'رسومِ دہلی'، ص ۱۱۷ (طبع رام پور۔ ۱۹۶۵ء) از سیّد احمد دہلوی ملاحظہ کیجیے

○ ... ۱۸۵۲ء (قج)

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں م زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

در پہ رہنے کو کہا، اور کہہ کے کیسا پھر گیا! م جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم؟ ہے بلاؤں کا نزول م آج اُدھر ہی کو رہے گا، دیدۂ اختر کھلا

کیا رہوں غربت میں خوش، جب ہو حوادث کا یہ حال م نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

اُس کی اُمت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند؟ م واسطے جس شہ کے، غالبؔ! گنبدِ بے در کھلا

ہے بس کہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور م کرتے ہیں محبّت، تو گزرتا ہے گماں اور

یارب، وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات م دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ابرو سے ہے کیا، اس نگہِ ناز کو، پیوند؟ م ہے تیر مقرّر، مگر اس کی ہے کماں اور

تم شہر میں ہو، تو ہمیں کیا غم؟ جب اُٹھیں گے م لے آئیں گے بازار سے، جا کر، دل و جاں اور

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں م ہم ہیں، تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا م ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ، ہر چند سر اُڑ جائے م جلّاد کو، لیکن، وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا م ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

لیتا، نہ اگر دل تمہیں دیتا، کوئی دم چین م کرتا، جو نہ مرتا، کوئی دن آہ و فغاں اور

پاتے نہیں جب راہ، تو چڑھ جاتے ہیں نالے م رُکتی ہے مری طبع، تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے م کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

○ ... ۱۸۵۲ء (قج)

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور م تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا م ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل، اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں"؟ م مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو: "قیامت کو ملیں گے" م کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر! جواں تھا ابھی عارفؔ م کیا تیرا بگڑتا، جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے، مرے گھر کے م پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے؟ م کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی م بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ، بہر حال، یہ مدّت خوش و ناخوش م کرنا تھا، جواں مرگ! گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو، جو کہتے ہو کہ "کیوں جیتے ہیں غالبؔ"؟ م قسمت میں ہے مرنے کی تمنّا کوئی دن اور

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا م
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے م
تیرا پتا نہ پائیں، تو ناچار کیا کریں

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم؟ م
ہو غم ہی جاں گداز، تو غمخوار کیا کریں

لے مرزا زین العابدین خاں عارفؔ اپریل ۱۸۵۲ء میں فوت ہوئے تھے۔ یہ غزل انہی کا مرثیہ ہے

○ ... ۱۸۵۲ء

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں [1] م خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی، رنگا رنگ بزم آرائیاں م لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعشِ گردوں دن کو پردے میں نہاں م شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں؟

قید میں یعقوب نے لی، گو، نہ یوسف کی خبر م لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے م ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق م میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام م قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں م تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا م بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار؟ م جو، مری کوتاہیِ قسمت سے، مژگاں ہو گئیں

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے م میری آہیں، بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں، تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب م یاد تھیں جتنی دعائیں، صرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آ گیا م سب لکیریں ہاتھ کی، گویا، رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم م ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج م مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب، تو اے اہلِ جہاں م دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

[1] یہ غزل دہلی اردو اخبار جلد ۱۴ نمبر ۳۲ مورخہ ۲۸ اگست ۱۸۵۲ء میں چھپی تھی

○ ... ۱۸۵۲ء (قح)

حضورِ شاہ میں، اہلِ سخن کی آزمائش ہے م
چمن میں، خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

قد و گیسو میں، قیس و کوہکن کی آزمائش ہے م
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں، آخر م
ہنوز اُس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی؟ م
اُسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

وہ آیا بزم میں، دیکھو، نہ کہیو پھر کہ غافل تھے م
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

رہے دل ہی میں تیر، اچھا، جگر کے پار ہو، بہتر م
غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سبحہ و زنّار کے پھندے میں، گیرائی م
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

پڑا رہ، اے دلِ وابستہ، بیتابی سے کیا حاصل؟ م
مگر پھر تابِ زلفِ پرشکن کی آزمائش ہے

○ ...۱۸۵۲ء (قج)

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو م
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمایش ہے

وہ آویں گے مرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا غالبؔ م
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمایش ہے

غم کھانے میں بودا، دلِ ناکام، بہت ہے م
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام، بہت ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے، ورنہ م
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

نَے تیر کماں میں ہے، نہ صیّاد کمیں میں م
گوشے میں قفس کے، مجھے آرام بہت ہے

کیا زہد کو مانوں؟ کہ نہ ہو گرچہ ریائی م
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں؟ م
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے؟ م
آلودہ بہ مے جامۂ احرام، بہت ہے

○ ...۱۸۵۲ء (قج)

ہے قہر، گر اب بھی نہ بنے بات، کہ اُن کو م
انکار نہیں، اور مجھے ابرام بہت ہے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں، اے مرگ م
رہنے دے مجھے یاں، کہ ابھی کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے؟ م
شاعر تو وہ اچھا ہے، پہ بدنام بہت ہے

○ ...۱۸۵۲ء

نکتہ[1] چیں ہے، غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے م
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے؟

میں بُلاتا تو ہوں اُس کو، مگر، اے جذبۂ دل! م
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بِن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے م
کاش! یوں بھی ہو کہ بِن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر م
کوئی پوچھے کہ "یہ کیا ہے؟" تو چھپائے نہ بنے

---

[1] خط بنام حقیر ۸ جنوری ۱۸۵۳ء (دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، اشاعت دوم میں ۸ جون سہواً لکھا گیا ہے) میں اس غزل کا ذکر ہے۔ اس لیے غزل ۸ جنوری ۱۸۵۳ء سے کچھ پہلے یعنی اواخرِ ۱۸۵۲ء میں کہی گئی ہوگی۔ غزل پہلی بار اُردوئے معلّیٰ میں درج ہوئی ہے

○ ... ۱۸۵۲ء

اس نزاکت کا بُرا ہو؛ وہ بھلے ہیں، تو کیا؟ م
ہاتھ آویں، تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے؟ م
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بِن آئے نہ رہے م
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ، تو بُلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے م
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش، غالبؔ م
کہ لگائے نہ لگے، اور بُجھائے نہ بنے

رُباعیات

○ ... ۱۸۵۲ء (قج)

۱

حق شہ کی بقا سے، خلق کو شاد کرے — تا شاہ، شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں، گانٹھ م — ہے صِفر کہ افزائشِ اعداد کرے

۲

اس رشتے میں لاکھ تار ہوں، بلکہ سِوا! — اتنے ہی برس شمار ہوں، بلکہ سِوا!
ہر سینکڑے کو ایک گِرہ فرض کریں م — ایسی گرہیں ہزار ہوں، بلکہ سِوا!

۱۸۵۳ء تا ۱۸۵۶ء

مُتفرِق

نسخۂ رام پور (ثانی / جدید) ۱۸۵۵ء

قادر نامہ (طبع اوّل) ۱۸۵۶ء

○ ... ۱۸۵۲ء

اس نزاکت کا بُرا ہو؛ وہ بھلے ہیں، توکیا؟ م
ہاتھ آویں، تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے؟ م
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بِن آئے نہ رہے م
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ، تو بُلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے م
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش، غالبؔ م
کہ لگائے نہ لگے، اور بُجھائے نہ بنے

○ ... ۱۸۵۲ء (قیح) رُباعیات

۱

حق شہ کی بقا سے، خلق کو شاد کرے | تا شاہ، شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں، گانٹھ م | ہے صِفر کہ افزایشِ اعداد کرے

۲

اس رشتے میں لاکھ تار ہوں، بلکہ سِوا! | اِتنے ہی برس شمار ہوں، بلکہ سِوا!
ہر سینکڑے کو ایک گِرہ فرض کریں م | ایسی گِرہیں ہزار ہوں، بلکہ سِوا!

۱۸۵۳ء تا ۱۸۵۶ء

مُتفرِق

نسخۂ رام پور (ثانی / جدید) ۱۸۵۵ء

قادر نامہ (طبع اوّل) ۱۸۵۶ء

○ ...۱۸۵۳ء

در مدحِ شاہ

اے شاہِ جہانگیرِ جہاں بخشِ جہاں دار	ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت[1]
جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو	تُو وا کرے اُس عقدے کو، سو بھی بہ اشارت
ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر؟	گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت
آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا	ہے فخرِ سلیماں، جو کرے تیری وزارت
ہے نقش مریدی ترا، فرمانِ الٰہی	ہے داغِ غلامی ترا، توقیعِ امارت
تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں	تو آگ سے گر رفع کرے تابِ شرارت
ڈھونڈے نہ ملے، موجۂ دریا میں، روانی	باقی نہ رہے، آتشِ سوزاں میں، حرارت
ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغّل	ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

[1] "یہ قطعہ نوروز کی مبارکباد پر مشتمل ہے، اور نوروز، آفتاب کے برج حمل میں داخلے پر منایا جاتا ہے۔ میرزا صاحب، سرور کو لکھتے ہیں: 'تحویلِ آفتاب بہ حمل کے باب میں موٹی بات یہ ہے کہ ۲۲ مارچ کو واقع ہوتی ہے۔ کبھی ۲۱ کبھی ۲۳ بھی آپڑتی ہے۔ اس سے تجاوز نہیں' دعود: ۲۲ دہلی اردو اخبار جلد ۱۵ نمبر ۱۳ مورخہ جمادی الآخرہ ۱۲۶۹ھ مطابق ۲۷ مارچ ۱۸۵۳ء میں حضور والا کی نیاز معمولی دسترخوان کا ذکر ہے، جو یکشنبہ ۹ جمادی الآخرہ کو نوروز کے دن منائی گئی تھی۔ یہ واقعہ میرزا سلیمان شکوہ بہادر کے پوتے میرزا نور الدین شاہی تخلص کی آمدِ دہلی کے بعد کا ہے۔ جن کی صحبت نے بہادر شاہ کو متہم بہ تشیع کیا تھا۔ اس لیے میری دانست میں یہ قطعہ مارچ ۱۸۵۳ء کا لکھا ہوا ہے۔" (مولانا عرشی مرحوم۔ نسخۂ عرشی، اشاعت دوم ص ۱۴۰)

○ ...۱۸۵۳ء

کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر؟	قاصر ہے ستایش میں تری، میری عبارت
نوروز ہے آج، اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں	نظّارگیِ صنعتِ حق، اہلِ بصارت
تجھ کو، شرفِ مہرِ جہاں تاب مبارک	غالبؔ کو، ترے عتبۂ عالی کی زیارت

...۱۸۵۳ء **مخمس**

گھستے گھستے، پانو میں زنجیر آدھی رہ گئی[1]
مر گئے پر، قبر کی تعمیر آدھی رہ گئی
سب ہی پڑھتا، کاش! کیوں تکبیر آدھی رہ گئی
کھینچ کے، قاتل، جب تری شمشیر آدھی رہ گئی
غم سے، جانِ عاشقِ دلگیر، آدھی رہ گئی

بیٹھ رہتا، لے کے چشمِ پُرنم، اُس کے روبرو
کیوں کہا تو نے کہ "کہہ دل کا غم اُس کے روبرو"
بات کرنے میں نکلتا ہے دم، اُس کے روبرو
کہہ سکے ساری حقیقت ہم نہ[2]، اُس کے روبرو
ہم نشیں، آدھی ہوئی تقریر، آدھی رہ گئی

[1] تتمۂ دہلی اردو اخبار۔ ۱۷ اپریل ۱۸۵۳ء۔ یہ شاہ ظفر کی غزل پر غالب کی تضمین ہے

[2] عرشی صاحب نے جب دیکھا کہ دیوانِ ظفر اور دہلی اردو اخبار میں 'ہم نہ' لکھا ہے اور قوافی نم، غم، دم، وغیرہ ہیں تو انہوں نے اسے 'نہ ہم' کر دیا۔ عرشی صاحب کی یہ ترمیم درست نہیں۔ ترمیم سے نہ کے وزن پر آگیا ہے جو جائز نہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہاں ظفر نے کب کہا ہوگا یعنی "کب ہم اُس کے روبرو"

○ ...۱۸۵۳ء

تو نے دیکھا؟ مجھ پہ کیسی بن گئی، اے رازدار
خواب و بیداری پہ، کب ہے، آدمی کو اختیار
مثلِ زخم، آنکھوں کو سی دیتا، جو ہوتا ہوشیار
کھینچتا تھا، رات کو میں خواب میں، تصویرِ یار
جاگ اُٹھا میں، کھینچی تصویر آدھی رہ گئی

غم نے جب گھیرا، تو چاہا ہم نے یوں، اے دلنواز
مستیِ چشمِ سیہ سے، چل کے، ہوویں چارہ ساز
تو صدا ے پا سے جاگا، تھا جو محوِ خوابِ ناز
دیکھتے ہی، اے ستمگر، تیری چشمِ نیم باز
کی تھی پوری ہم نے جو تدبیر آدھی رہ گئی

اس بُتِ مغرور کو کیا ہو کسی پر التفات؟
جس کے حسنِ روز افزوں کی یہ اک ادنیٰ ہے بات
ماہِ نو نکلے پہ، گزری ہوں گی راتیں پان سات
اُس رُخِ روشن کے آگے ماہِ یک ہفتہ کی رات
تابشِ خورشیدِ پُر تنویر آدھی رہ گئی

۱؎ دیکھیے دیوانِ ظفر (دہلی اردو اخبار میں جو چھپا تھا)

○ ...۱۸۵۳ء

تا مجھے پہنچائیے کاہش، بختِ بد ہے گھات میں
ہاں، فراوانی اگر کچھ ہے، تو ہے آفات میں
جز غم و رنج و الم، گھاٹا ہے ہر یک بات میں
کم نصیبی اِس کو کہتے ہیں کہ میرے ہات میں
آتے ہی، خاصیتِ اکسیر آدھی رہ گئی

سب سے، یہ گوشہ، کنارے ہے، گلے لگ جا مرے
آدمی کو کیوں پکارے ہے، ہے گلے لگ جا مرے
سر سے گر چادر اُتارے ہے، گلے لگ جا مرے
مانگ کیا بیٹھا سنوارے ہے، ہے گلے لگ جا مرے
وصل کی شب، اے بُتِ بے پیر آدھی رہ گئی

میں یہ کیا جانوں کہ وہ کس واسطے ہوں پھر گئے؟
پر نصیب اپنا، انھیں جاتا سُنا ہوں، پھر گئے
دیکھنا قسمت، وہ آئے اور پھر یوں پھر گئے
آ کے آدھی دور، میرے گھر سے وہ کیوں پھر گئے
کیا کشش میں دل کی اب تاثیر آدھی رہ گئی؟

○ ...۱۸۵۳ء

ناگہاں یاد آگئی ہے مجھ کو، یارب، کب کی بات؟
کچھ نہیں کہتا کسی سے، سن رہا ہوں سب کی بات
کس لیے تجھ سے چھپاؤں، ہاں وہ پرسوں شب کی بات؟
نامہ بر جلدی میں تیری وہ جو تھی مطلب کی بات
خط میں آدھی ہو سکی تحریر، آدھی رہ گئی

ہو تجلی برق کی صورت میں، ہے یہ بھی غضب
ہاں، چھ گھنٹے کی تو ہوتی، فرصتِ عیش و طرب
شام سے آتے، تو کیا اچھی گزرتی رات سب
پاس میرے وہ جو آئے بھی، تو بعد از نصفِ شب
نکلی آدھی حسرتِ تقریر، آدھی رہ گئی

تم جو فرماتے ہو "دیکھ، اے غالبِ آشفتہ سر
ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے؟ گیا کیوں اُس کے گھر؟"
جان کی پاؤں اماں! باتیں یہ سب سچ ہیں، مگر
دل نے کی ساری خرابی، لے گیا مجھ کو، ظفر
واں کے جانے میں، مری توقیر آدھی رہ گئی

○ ...۱۸۵۳ء

غزلیات

دل[1] ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں؟ م
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں م
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں؟

جب وہ جمالِ دلفروز، صورتِ مہرِ نیمروز م
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں مُنہ چھپائے کیوں؟

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ م
تیرا ہی عکسِ رخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں م
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

حسن اور اُس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم م
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں؟

واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع م
راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بُلائے کیوں؟

---

[1] دہلی اردو اخبار، جلد ۱۵ نمبر ۷ مورخہ ۱۳ر فروری ۱۸۵۳ء

○ ...۱۸۵۳ء

ہاں، وہ نہیں خدا پرست، جاؤ، وہ بے وفا سہی م
جس کو ہو دین و دل عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں؟
غالبِ خستہ کے بغیر، کون سے کام بند ہیں؟ م
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو، تو کیونکر ہو م کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو، تو کیونکر ہو؟[۱]
ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال م کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں؟ ہو، تو کیونکر ہو؟
ادب ہے اور یہی کشمکش، تو کیا کیجے؟ م حیا ہے اور یہی گومگو، تو کیونکر ہو؟
تمھیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا! م بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو، تو کیونکر ہو؟
اُلجھتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ م جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو، تو کیونکر ہو؟
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا م وہ شخص دن نہ کہے رات کو، تو کیونکر ہو؟
ہمیں پھر اُن سے اُمید، اور اُنھیں ہماری قدر م ہماری بات ہی پوچھیں نہ وُو، تو کیونکر ہو؟
غلط نہ تھا، ہمیں خط پر گماں تسلّی کا م نہ مانے دیدۂ دیدار جو، تو کیونکر ہو؟
بتاؤ اُس مژہ کو دیکھ کر، کہ مجھ کو قرار م یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو، تو کیونکر ہو؟
مجھے جنوں نہیں، غالبؔ، ولے بقولِ حضور: م "فراقِ یار میں تسکین ہو، تو کیونکر ہو؟"

---

۱ دہلی اردو اخبار، مطابق ۶ مارچ ۱۸۵۳ء

○ ...۱۸۵۳ء

قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو م
مرا ہونا بُرا کیا ہے، نوا سنجانِ گلشن کو؟[۱]
نہیں گر ہمدمی آساں، نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے م
نہ دی ہوتی خدایا، آرزوے دوست دشمن کو
نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اُس جراحت پر م
کیا سینے میں جس نے خوں چکاں مژگانِ سوزن کو
خدا شرمائے ہاتھوں کو! کہ رکھتے ہیں کشاکش میں م
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو
ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں م
نہیں دیکھا شناور، جوئے خوں میں تیرے توسن کو
ہوا چرچا جو میرے پانو کی زنجیر بننے کا م
کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو
خوشی کیا، کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے؟ ا
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو
وفاداری بشرطِ اُستواری، اصل ایماں ہے ا
مرے بُت خانے میں، تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

---

۱ دہلی اردو اخبار، ۸ مئی ۱۸۵۳ء

○ ...۱۸۵۳ء

شہادت تھی مری قسمت میں، جو دی تھی یہ خو مجھ کو م
جہاں تلوار کو دیکھا، جھکا دیتا تھا گردن کو

نہ لُٹتا دن کو، تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا؟ م
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے، کہ جویا ہوں جواہر کے؟ م
جگر کیا ہم نہیں رکھتے، کہ کھودیں جا کے معدن کو

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں، غالبؔ م
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے، کیا کہیے؟ م
ہوا رقیب، تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے؟[۱]

یہ ضد کہ آج نہ آوے، اور آئے بن نہ رہے م
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے، کیا کہیے؟

---

[۱] یہ غزل قلعے کے مشاعرے منعقدہ ۳۰ رجادی الثانی ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۰ راپریل ۱۸۵۳ء کے لیے کہی گئی تھی (خط بنام حقیر بحوالہ غالبؔ کے خطوط ص ۱۱۴۵) اور دہلی اردو اخبار (تتمہ) جلد ۱۵ نمبر ۱۷، میں ۲۴ راپریل ۱۸۵۳ء کو شائع ہوئی تھی

○ ...۱۸۵۳ء

رہے ہے یوں گہ و بے گہ، کہ کوئے دوست کو اب م
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے، کیا کہیے؟

زہے کرشمہ، کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب؟ م
کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے، کیا کہیے؟

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال م
کہ یہ کہے کہ "سرِ رہگزر ہے، کیا کہیے؟"

تمھیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال م
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا؟ کہیے؟

انھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے، کیوں لڑیے؟ م
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے، کیا کہیے؟

حَسَد، سزائے کمالِ سخن ہے، کیا کیجیے؟ م
ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے، کیا کہیے؟

کہا ہے کس نے کہ غالبؔ بُرا نہیں؟ لیکن م
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے، کیا کہیے؟

کہوں جو حال، تو کہتے ہو: "مدعا کہیے" م تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو، تو کیا کہیے[۱]

---

[۱] خط بنام حقیر اپریل ۱۸۵۳ء۔ نادراتِ غالبؔ ص ۳۵

○ ۱۸۵۳... ء

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستمگر ہیں" م مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو "بجا کہیے"

وہ نیشتر سہی، پر دل میں جب اُتر جاوے م نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے؟

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں م وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیے

جو مدّعی بنے، اس کے نہ مدّعی بنیے م جو نا سزا کہے، اس کو نہ ناسزا کہیے

کہیں حقیقتِ جانکاہیِ مرض لکھیے م کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے م کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

رہے نہ جان، تو قاتل کو خوں بہا دیجے م کٹے زبان، تو خنجر کو مرحبا کہیے

نہیں نگار کو الفت، نہ ہو، نگار تو ہے م روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے م طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا، غالبؔ م خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

بازیچۂ اطفال ہے، دنیا مرے آگے م ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے[1]

اک کھیل ہے، اورنگِ سلیماں، مرے نزدیک م اک بات ہے، اعجازِ مسیحا، مرے آگے

جُز نام، نہیں صورتِ عالم مجھے منظور م جُز وہم نہیں، ہستیِ اشیا، مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے م گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

---

[1] یہ غزل بھی "بشر ہے کیا کہیے" والی غزل کے ساتھ ہی کہی گئی تھی، ۱۰ اپریل ۱۸۵۳ء کو یا اس سے دو ایک روز پہلے۔ مگر دہلی اردو اخبار (تتمہ) میں ۲۲ مئی ۱۸۵۳ء کو شائع ہوئی تھی

○ ۱۸۵۳... ء

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے م تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو، خود بین و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں؟ م بیٹھا ہے بُتِ آئنہ سیما مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار م رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے، میں رشک سے گزرا م کیوں کر کہوں، "لو نام نہ اُن کا مرے آگے"

ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر م کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام م مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلا مرے آگے

خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے م آئی شبِ ہجراں کی تمنّا مرے آگے

ہے موجزن اک قُلزُمِ خوں، کاش، یہی ہو م آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے م رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا م غالبؔ کو بُرا کیوں کہو، اچھا مرے آگے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے م
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے[1]

---

[1] تتمہ دہلی اردو اخبار- ۱۹ جون ۱۸۵۳ء۔ جلوۂ داغ مرتبہ احسن مارہروی میں لکھا ہے کہ مشاعرے میں ذوق اور داغ بھی شامل تھے۔ جب داغ نے یہ شعر پڑھا
ہوئے مغرور وہ، جب آہ میری بے اثر دیکھی ؛ کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے
تو شاہ ظفر نے پاس بلا کر داغ کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ داغ اس وقت ۲۲ سال کے تھے

○ ...۱۸۵۳ء

ڈرے کیوں میرا قاتل ؟ کیا رہے گا اُس کی گردن پر م
وہ خوں، جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

نکلنا خلد سے آدمؑ کا سُنتے آئے ہیں، لیکن م
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے، ظالم، تیرے قامت کی درازی کا م
اگر اس طرّۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط، تو ہم سے لکھوائے م
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے، بادہ آشامی م
پھر آیا وہ زمانہ، جو جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقّع خستگی کی داد پانے کی م
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

محبّت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا م
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں، جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانے کا دروازہ، غالبؔ، اور کہاں واعظ م
پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

○ ...۱۸۵۳ء

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے م ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
خستگی کا تم سے کیا شکوہ ؟ کہ یہ م ہتھکنڈے ہیں، چرخِ نیلی فام کے
خط لکھیں گے، گرچہ مطلب کچھ نہ ہو م ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پی زمزم پہ مَے اور صُبحدم م دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے
دل کو آنکھوں نے پھنسایا، کیا مگر م یہ بھی، حلقے ہیں تمہارے دام کے
شاہ کے ہے، غُسلِ صحّت کی خبر م دیکھیے، کب دن پھریں حمّام کے[1]
عشق نے، غالبؔ، نکمّا کر دیا م ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

سلام

○ ...۱۸۵۴ء

سلام اُسے کہ اگر بادشا کہیں اُس کو تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اُس کو[2]
نہ بادشاہ، نہ سلطاں، یہ کیا ستایش ہے؟ کہو کہ خامسِ آلِ عبا کہیں اُس کو

---

[1] "دلی اردو اخبار" ۴ دسمبر ۱۸۵۳ء میں درج ہے کہ بادشاہ نے "۲۱ صفر (۱۲۷۰ھ) کو غسلِ صحت فرمایا۔" یہ مطابق ہے ۲۳ نومبر ۱۸۵۳ء کے۔

[2] "رامپور رضا لائبریری میں ایک مخطوطہ "دستور العمل اودھ" کے نام سے محفوظ ہے۔ اس میں مجتہد العصر مولانا سیّد محمد لکھنوی کی شاہ اودھ کے سامنے پیش کی ہوئی تحریریں اور ان پر شاہ کی توقیعیں منقول ہیں۔ اسیر لکھنوی، جو شاہ کے میر منشی تھے۔ اس کتاب کے مرتب معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سلام اس دستور العمل میں مجتہد العصر کے مکتوب مورخہ ۴ ذیقعدہ ۱۲۷۰ھ (۳۰ جولائی ۱۸۵۴ء) کے متصل بعد (۱۸۴ب) نقل کیا گیا ہے جس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان تاریخوں کے کچھ ہی بعد میرزا صاحب کی طرف سے موصول ہوا ہوگا۔ سلام کا عنوان ہے "یا اسد اللہ الغالب" اور خاتمے پر میرزا صاحب کی مہر (اسد اللہ الغالب) بھی نقل کر دی گئی ہے۔" (نسخۂ عرشی۔ اشاعتِ دوم ص ۳۹۰)

○ ...۱۸۵۴ء

خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی ؟ — کہو کہ رہبرِ راہِ خدا کہیں اُس کو

خدا کا بندہ، خداوندگار بندوں کا — اگر کہیں نہ خداوند، کیا کہیں اُس کو؟

فروغِ جوہرِ ایماں، حُسینؑ ابنِ علیؑ — کہ شمعِ انجمنِ کبریا کہیں اُس کو

کفیلِ بخششِ اُمّت ہے، بَن نہیں پڑتی — اگر نہ شافعِ روزِ جزا کہیں اُس کو

مسیحؑ جس سے کرے اخذِ فیضِ جاں بخشی — ستم ہے، کُشتۂ تیغِ جفا کہیں اُس کو

وہ، جس کے ماتمیوں پر ہے سلسبیل، سبیل — شہیدِ تشنہ لبِ کربلا کہیں اُس کو

عدو کے سمعِ رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات — کہ جنّ و انس و ملک سب بجا کہیں اُس کو

بہت ہے، پایۂ گردِ رہِ حسینؑ، بلند — بقدرِ فہم ہے، گر کیمیا کہیں اُس کو

نظارہ سوز ہے یاں تک ہر ایک ذرّۂ خاک — کہ لوگ جوہرِ تیغِ قضا کہیں اُس کو

ہمارے درد کی یارب کہیں دوا نہ ملے — اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اُس کو

ہمارا منہ ہے کہ دیں اُس کے حُسنِ صبر کی داد ؟ — مگر نبیؐ و علیؑ مرحبا کہیں اُس کو

زمامِ ناقہ، کف اُس کے میں ہے کہ اہلِ یقیں — پس از حسینؑ علیؑ پیشوا کہیں اُس کو

وہ ریگِ تفتۂ وادی پہ گام فرسا ہے — کہ طالبانِ خدا رہنما کہیں اُس کو

امامِ وقت کی یہ قدر ہے کہ اہلِ عناد — پیادہ لے چلیں اور ناسزا کہیں اُس کو

یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمنِ دیں — علیؑ سے آکے لڑے اور خطا کہیں اُس کو

یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ — بُرا نہ مانیے، گر ہم بُرا کہیں اُس کو

علیؑ کے بعد حسنؑ اور حسنؑ کے بعد حسینؑ — کرے جو اُن سے بُرائی، بھلا کہیں اُس کو؟

○ ...۱۸۵۴ء

نبیؐ کا ہو نہ جسے اعتقاد، کافر ہے — رکھے امامؑ سے جو بُغض، کیا کہیں اُس کو؟

بھرا ہے، غالبِ دلخستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اُس کو

غزلیات

○ ...۱۸۵۳/۵۴ء

دردِ منّت کشِ دوا نہ ہوا — م — مَیں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا[1]

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟ — م — اک تماشا ہوا، گِلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں ؟ — م — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب! کہ رقیب — م — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی — م — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ؟ — م — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی — م — حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما — م — کام گر رُک گیا، روا نہ ہوا

---

[1] گلستانِ سخن (تالیف قبل از اپریل ۱۸۵۴ء) میں اس غزل کا ایک شعر انتخاب ہوا ہے۔ نسخۂ عرشی اشاعتِ دوم ص ۱۹۲ پر عرشی صاحب نے اس غزل کو وسطِ ۱۸۵۲ء اور آغازِ ۱۸۵۴ء کے درمیان قرار دیا ہے مگر میری رائے میں جب "یہ غزل قیج میں نہیں ہے جو اگست ۱۸۵۲ء کے بعد کا مرتبہ ہے" تو اسے زیادہ سے زیادہ آخرِ ۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۴ء کے درمیان تسلیم کرنا چاہیے۔

○ ... ۱۸۵۳/۵۴ء

رہزنی ہے کہ دِلستانی ہے! م لے کے دل، دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں: م

"آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا"

○ ... ۱۸۵۴ء

درخورِ قہر و غضب، جب کوئی ہم سا نہ ہوا م پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا؟[1]

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم م اُلٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا م روبرو کوئی بُتِ آئنہ سیما نہ ہوا

کم نہیں نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں م تیرا بیمار، بُرا کیا ہے، گر اچھا نہ ہوا

سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا م خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا م کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا

ہر بُنِ مو سے، دمِ ذکر، نہ ٹپکے خونناب م حمزہ کا قصہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جُزو میں کُل م کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے م دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

جَور سے باز آئے، پر باز آئیں کیا؟ م کہتے ہیں: "ہم تجھ کو مُنہ دکھلائیں کیا؟"[2]

---

[1] خط بنام نبی بخش حقیرؔ (بعد از ۱۸ جون ۱۸۵۴ء) نادرات غالبؔ ص ۵۶

[2] مکتوب غالبؔ بنامِ منشی نبی بخش حقیرؔ مورخہ ۳ اکتوبر ۱۸۵۴ء میں اس غزل کا دوسرا شعر درج ہوا ہے

○ ... ۱۸۵۴ء

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں م ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا؟

لاگ ہو، تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ م جب نہ ہو کچھ بھی، تو دھوکا کھائیں کیا؟

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ؟ م یارب! اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؟

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے م آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا؟

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ م مر گئے پر، دیکھیے، دکھلائیں کیا؟

پوچھتے ہیں وہ کہ "غالبؔ کون ہے؟" م کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

کسی کو دے کے دل، کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو؟ م

نہ ہو جب دل ہی سینے میں، تو پھر مُنہ میں زباں کیوں ہو[1]

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں؟ م

سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ "ہم سے سرگراں کیوں ہو؟"

کیا غمخوار نے رُسوا، لگے آگ اس محبت کو! م

نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا رازداں کیوں ہو؟

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا م

تو پھر اے سنگ دل، تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

---

[1] خط بنام نبی بخش حقیرؔ مورخہ بعد از ۱۸ جون ۱۸۵۴ء

○ ...۱۸۵۴ء

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر، ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

یہ کہہ سکتے ہو: "ہم دل میں نہیں ہیں" پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہو، تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو، جرم کس کا ہے؟
نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو؟

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟
ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو؟

یہی ہے آزمانا، تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟
عدو کے ہو لیے جب تم، تو میرا امتحاں کیوں ہو؟

کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی؟"
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ "ہاں، کیوں ہو؟"

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو، غالبؔ؟
ترے بے مہر کہنے سے، وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

قطعہ

خجستہ انجمنِ طوے میرزا جعفر — کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالبؔ — نہ کیوں ہو مادۂ سالِ عیسوی "محظوظ"؟
۱۸۵۴ء

○ ...۱۸۵۴ء

قطعہ

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی — ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
کہا غالبؔ سے "تاریخ اس کی کیا ہے؟" — تو بولا: "اِنشراحِ جشنِ جمشید"
۱۲۷۰ھ

قطعہ

افطارِ صوم کی کچھ، اگر دستگاہ ہو — اُس شخص کو ضرور ہے، روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو — روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

رُباعی

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں؟ — آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟[1,2]
روزہ مرا ایمان ہے، غالبؔ، لیکن — خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں؟

○ ...دسمبر ۱۸۵۴ء تا اپریل ۱۸۵۷ء

مطلع

ملے، دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب
نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالبؔ[3]

[1،2] خط بنام نبی بخش حقیر مورخہ ۴ جون ۱۸۵۴ء۔ نادرات غالب ۵۳، ۵۸۔ خط سے ظاہر ہے کہ یہ رباعی اور قطعہ ۳ (جون) یا اس سے دو ایک روز پہلے کہے ہونگے

[3] یادگار غالب ص ۷۷۔ حالی لکھتے ہیں کہ بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے غالب اکثر ایسے اشعار دربار میں برجستہ پڑھا کرتے تھے۔ قیاس ہے کہ یہ شعر وفات ذوق کے بعد اور مئی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے کسی وقت کہا گیا ہوگا۔ ذوق ۱۵ نومبر ۱۸۵۴ء کو فوت ہوئے

○ ...۱۸۵۵ء

قطعہ

م

اے[1] شہنشاہِ آسماں اورنگ — اے جہاں دارِ آفتاب آثار

تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں — تھا میں اک دردمندِ سینہ فگار

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی — ہوئی میری وہ گرمیِ بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرّۂ ناچیز — رُوشناسِ ثوابت و سیّار

گرچہ، از روئے ننگِ بے ہنری — ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی — جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں — بادشہ کا غلامِ کار گزار

خانہ زاد اور مرید اور مدّاح — تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ گزار

بارے، نوکر بھی ہو گیا، صد شکر! — نسبتیں، ہو گئیں مُشخّص چار

نہ کہوں آپ سے، تو کس سے کہوں؟ — مُدّعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد، اگرچہ مجھ کو نہیں — ذوقِ آرائشِ سر و دستار

---

[1] ممکن ہے یہ قطعہ مہر نیمروز کے مسودے کے ساتھ ہی عیدِ قرباں کو بادشاہ کے حضور میں گزرانا ہو۔ اگرچہ مرزا نے اپنے ایک خط بنام نبی بخش حقیرؔ مورخہ ۲ جنوری ۱۸۵۱ء میں ششماہے کے بارے میں شکایتاً لکھا تھا اور کہا تھا کہ تنخواہ نہ ملنے پر وہ کام (مہر نیمروز) بند کر دیں گے مگر کام کرنا انھوں نے بند نہیں کیا تھا۔ چنانچہ مکمل مسودہ انھوں نے عیدِ قرباں کو پیش کیا۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ قطعہ انھوں نے ذوقؔ کی وفات (نومبر ۱۸۵۴ء) کے کچھ عرصے بعد ۱۸۵۵ء کے شروع میں گزرانا ہو بلکہ یہ زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

○ ...۱۸۵۵ء

کچھ تو جاڑے میں چاہیے، آخر — تا نہ دے، بادِ زمہریر، آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش؟ — جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال — کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ، اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انساں! — دھوپ کھاوے کہاں تلک جاں دار

دھوپ کی تابش، آگ کی گرمی — وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار!

میری تنخواہ جو مقرّر ہے — اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے، مُردے کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ، مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

بس کہ لیتا ہوں، ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سُود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا — ہو گیا ہے شریک، ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار

رزم کی داستان گر سنیے — ہے، زباں میری، تیغِ جوہر دار

بزم کا التزام گر کیجے — ہے، قلم میری، ابرِ گوہر بار

ظلم ہے، گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے، گر کرو نہ مجھ کو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا! — آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ — تا نہ ہو، مجھ کو، زندگی دشوار

○ ... ۱۸۵۵ء

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

○ ... ۱۸۵۵ء (قد) **قطعہ**

م

نُصرتُ الملک بہادر! مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے

گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے

اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا، خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

خستگی کا ہو بھلا، جس کے سبب سے سرِ دست
نسبت اک گونہ، مرے دل کو ترے ہات سے ہے

ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں!
یہ دعا، شام و سحر، قاضیِ حاجات سے ہے

تو سکندر ہے، مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی، مجھ کو، ملاقات سے ہے

اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار!
غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

قطعہ

م

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر، چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند

جو آئے، جام بھر کے پیے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے، پھولوں کو جائے پھاند

○ ... ۱۸۵۵ء (قد)

غالبؔ، یہ کیا بیاں ہے؟ بجز مدحِ بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت خواند

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زرِ مہر و ماہ، ماند

یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

قطعہ

م

سہل تھا مُسہل، و لے یہ سخت مشکل آپڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی، اتنے روز حاضر بن ہوئے

تین دن مُسہل سے پہلے تین دن مُسہل کے بعد
تین مُسہل، تین تبریدیں، یہ سب کے دن ہوئے؟

قطعہ

م

سیہ گلیم ہوں، لازم ہے، میرا نام نہ لے
جہاں میں، جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے

ہوا نہ غلبہ میسّر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہو میرا، شریکِ غالبؔ ہے

قطعہ

۲

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں — دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام — اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

مثنوی

در صفتِ انبہ

۲

ہاں، دلِ دردمندِ زمزمہ ساز — کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز؟
خامے کا صفحے پر رواں ہونا — شاخِ گُل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے، کیا لکھیے؟ — نکتہ ہائے خِرد فزا لکھیے
بارے، آموں کا کچھ بیاں ہو جائے — خامہ، نخلِ رُطب فشاں ہو جائے
آم کا، کون، مردِ میداں ہے؟ — ثمر و شاخ، گوے و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں؟ — آئے، یہ گوے اور یہ میداں
آم کے آگے پیش جاوے خاک — پھوڑتا ہے، جلے پھپھولے، تاک
نہ چلا، جب کسی طرح، مقدور — بادۂ ناب بن گیا، انگور
یہ بھی، ناچار، جی کا کھونا ہے — شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو، تمھیں خبر کیا ہے؟ — آم کے آگے نیشکر کیا ہے؟
نہ گُل اُس میں، نہ شاخ و برگ، نہ بار — جب خزاں آئے، تب ہو اُس کی بہار
اور دوڑائیے قیاس کہاں؟ — جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں؟
جان میں ہوتی، گر یہ شیرینی — کوہکن، باوجودِ غمگینی
جان دینے میں اُس کو یکتا جان — پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر — کہ دواخانۂ ازل میں، مگر
آتشِ گُل پہ قند کا ہے قِوام — شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہو گا کہ فرطِ رافت سے — باغبانوں نے باغِ جنت سے
انگبیں کے، بحکمِ ربّ الناس — بھر کے بھیجے ہیں، سر بمہر گلاس
یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات — مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہوا ہے ثمر فشاں، یہ نخل — ہم کہاں، ورنہ، اور کہاں یہ نخل
تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس — رنگ کا زرد، پر کہاں بو باس
آم کو دیکھتا اگر اِک بار — پھینک دیتا طِلائے دست افشار
رونقِ کارگاہِ برگ و نوا — نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہروِ راہِ خلد کا توشہ — طُوبیٰ و سِدرہ کا جگر گوشہ
صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم — ناز پروردۂ بہار ہے آم
خاص وہ آم، جو نہ ارزاں ہو — نوبرِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

○ ... ۱۸۵۵ء (قد)

وہ کہ ہے والیِ ولایتِ عہد　　عدل سے اُس کے، ہے حمایتِ عہد
فخرِ دیں، عزِّ شان، وجاہِ جلال　　زینتِ طینت و جمالِ کمال
کارفرمائے دین و دولت و بخت　　چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت
سایہ اُس کا، ہُما کا سایہ ہے　　خلق پر، وہ خدا کا سایہ ہے
اے مُفیضِ وُجودِ سایہ و نور　　جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور
اِس خُداوندِ بندہ پرور کو　　وارثِ گنج و تخت و افسر کو
شاد و دلشاد و شادماں رکھیو
اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو

غزلیات

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں　م　شبِ فراق سے، روزِ جزا زیاد نہیں
کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے ؟　م　بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں
جو آؤں سامنے ان کے، تو "مرحبا" نہ کہیں　م　جو جاؤں واں سے کہیں کو، تو "خیر باد" نہیں
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں، تو کہتے ہیں　م　کہ 'آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں'
علاوہ عید کے، ملتی ہے اور دن بھی شراب　م　گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

[1] "ولی عہدِ سلطنت، شاہزادہ غلام فخرالدین عرف میرزا فخرو متوفی ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء"

○ ... ۱۸۵۵ء (قد)

جہاں میں ہو غم و شادی بہم، ہمیں کیا کام ؟　م　دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
تم اُن کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو، غالبؔ　م　یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ "یاد نہیں"

آئی اگر بلا، تو جگر سے ٹلے نہیں　　ایرا ہی دے کے ہم نے بچایا ہے کِشت کو[1]
کعبے میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں　م　بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کُنشت کو
طاعت میں تا رہے نہ مَے و انگبیں کی لاگ　م　دوزخ میں ڈال دو، کوئی لے کر بہشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے ؟　م　ٹیڑھا لگا ہے قط، قلمِ سرنوشت کو
غالبؔ، کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے　م　خرمن جلے، اگر نہ ملخ کھائے کِشت کو

پھر اس انداز سے بہار آئی　م　کہ ہوئے، مہر و مہ، تماشائی
دیکھو، اے ساکنانِ خطۂ خاک　م　اِس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سرتاسر　م　رُوکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی　م　بن گیا، روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیے　م　چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر　م　بادہ نوشی ہے، باد پیمائی
کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی، غالبؔ　م　شاہِ دیندار نے شفا[2] پائی

[1] یہ شعر 'یادگارِ غالبؔ' میں درج ہے　[2] اس حاشیے کے لیے دیکھیے ص ۲۵۶

○ ... ۱۸۵۵ء (قد)

رَوندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی م اِترائے کیوں نہ، خاکِ سرِ رہگزار کی

جب اُس کے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ م لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی

بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم، و لے م کیونکر نہ کھائیے؟ کہ ہوا ہے بہار کی

رُباعیات

۱

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے بھیجے ہیں جو ارمُغاں شہِ والا نے

گن کر دیویں گے ہم دعائیں سَو بار ۲ فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

○ ... ۱۸۵۵ء ۲

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں عُشّاق کی پُرسش سے اُسے عار نہیں[1]

جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہوگا ۲ کیونکر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں

۳

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے کرتے ہیں درنگ، کام کرنے والے[2]

کہتے ہیں: "کہیں خدا سے" اللہ اللہ ۲ وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

○ ... ۱۸۵۶ء **قادر نامہ**

(قادر) اور (اللہ) اور (یزداں) خدا ہے (نبی، مُرسَل، پیمبر) رہنما[3]

۱،۲ے خط بنام حقیر۔ ۸ مارچ ۱۸۵۵ء نادراتِ غالب ص ۷۱

۳ے مثنوی قادر نامہ غالب کی زندگی میں پہلی بار ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۶ء) میں مطبع سلطانی دہلی سے اور دوسری بار ۲۲ محرم ۱۲۸۰ھ مطابق ۹ جولائی ۱۸۶۳ء کو محبس پریس دہلی سے چھپی تھی

○ ... ۱۸۵۶ء

پیشوائے دیں کو کہتے ہیں (اِمام) وہ رسول اللہ کا قائم مقام

ہے (صحابی) دوستِ خالص (نائب) ہے جمع اُس کی، یاد رکھ (اَصحاب) ہے

بندگی کا، ہاں، (عبادت) نام ہے نیک بختی کا (سعادت) نام ہے

کھولنا (افطار) ہے، اور روزہ (صَوم) (لیل) یعنی رات، دن اور روز (یوم)

ہے (صلوٰۃ)، اے مہرباں، اسمِ نماز جس کے پڑھنے سے ہو راضی بے نیاز

جانماز اور پھر (مُصَلّا) ہے وہی اور (سَجّادہ) بھی گویا ہے وہی

(اسم) وہ ہے، جس کو تم کہتے ہو نام (کعبہ اَلکہ) وہ، جو ہے (بَیتُ الحَرام)

گرد پھرنے کو کہیں گے ہم (طواف) بیٹھ رہنا گوشے میں ہے (اِعتکاف)

پھر (فلک، چرخ) اور (گردون) اور (سِپہر) آسماں کے نام ہیں، اے رشکِ مہر

(مہر) سورج، چاند کو کہتے ہیں (ماہ) ہے محبّت (مہر)، لازم ہے نباہ

(غرب)، پچھّم، اور پورب (شرق) ہے (ابر) بدلی، اور بجلی (برق) ہے

آگ کا (آتش) اور (آذر) نام ہے اور انگارے کا (اَخگر) نام ہے

(تیغ) کی ہندی اگر تلوار ہے فارسی پگڑی کی بھی (دستار) ہے

ینولا (راسُو) ہے اور (طاؤس) مور (کبک) کو ہندی میں کہتے ہیں چکور

(خُم) ہے مٹکا، اور ٹھلیا ہے (سَبُو) (آب) پانی، (بحر) دریا، نہر، (جُو)

(چاہ) کو کہتے ہیں ہندی میں کنواں (دُود) کو ہندی میں کہتے ہیں دُھواں

دودھ جو پینے کا ہے وہ (شیر) ہے (طفل) لڑکا، اور بوڑھا (پیر) ہے

(سینہ) چھاتی، (دست) ہاتھ اور (پاے) پانو
(شاخ) ٹہنی (برگ) پتّا، (سایہ) چھانو

(ماہ) چاند (اختر) ہیں تارے رات (شب)
دانت (دنداں)، ہونٹ کو کہتے ہیں (لب)

(اُستخواں)، ہڈّی ہے اور ہے (پوست) کھال
(سگ) ہے کُتا اور گیدڑ ہے (شغال)

تل کو (کُنجد) اور (رخ) کو گال کہہ
گال پر جو تِل ہو، اُس کو (خال) کہہ

کیکڑا (سرطاں) ہے، کچھوا (سنگ پُشت)
(ساق) پنڈلی، فارسی مُٹھی کی (مُشت)

ہے (شکم) پیٹ، اور بغل (آغوش) ہے
کُہنی (آرنج) اور کندھا (دوش) ہے

ہندی میں (عقرب) کا بچھّو نام ہے
فارسی میں بھوں کا (ابرو) نام ہے

ہے وہی (کژدُم)، جسے (عقرب) کہیں
(نیش) ہے وہ، ڈنک جس کو سب کہیں

ہے لڑائی (حرب) اور (جنگ) ایک چیز
(کعب) ٹخنا اور (شتالنگ) ایک چیز

ناک (بینی)، (پرّہ) نتھنا، (گوش) کان
کان کی لَو (نرمہ) ہے، اے مہربان

(چشم) ہے آنکھ، اور (مژگاں) ہے پلک
آنکھ کی پُتلی کو کہیے (مردُمک)

منھ پہ گر جُھرّی پڑے، (آژنگ) جان
فارسی چھینکے کی تو (آونگ) جان

مَسّا (آژخ) اور چھالا (آبلہ)
اور ہے دائی جنائی (قابِلہ)

اونٹ (اُشتُر)، اور (اُشغُر) سیہ ہے
گوشت ہے (لحم)، اور چربی (پیہ) ہے

ہے (زنخ) ٹھوڑی، گلا ہے (حنجرہ)
سانپ ہے (مار) اور جھینگر (زنجرہ)

ہے (زنخ) ٹھوڑی، (ذقن) بھی ہے وہی
(خاد) ہے چیل، اور (زغن) بھی ہے وہی

پھر (غلیواز) اُس کو کہیے، جو ہے چیل
چیونٹی ہے (مور) اور ہاتھی ہے (پیل)

لومڑی (روباہ) اور (آہو) ہِرن
(شمس) سورج، اور (شعاع) اُس کی کرن

(اسپ) جب ہندی میں گھوڑا نام پائے
(تازیانہ) کیوں نہ کوڑا نام پائے

(گربہ) بلّی، (مُوش) چوہا، (دام) جال
(رِشتہ) تاگا، (جامہ) کپڑا، (قحط) کال

(خر) گدھا، اور اس کو کہتے ہیں (اُلاغ)
(دیگداں) چُولہا، جسے کہیے (اُجاغ)

ہندی چڑیا، فارسی (گُنجشک) ہے
مینگنی جس کو کہیں وہ (پِشک) ہے

(تابہ) ہے، بھائی، توَے کی فارسی
اور (تِیہو) ہے لوَے کی فارسی

نام مکڑی کا (کلاش) اور (عنکبوت)
کہتے ہیں مچھلی کو (ماہی) اور (حُوت)

(پَشّہ) مچھّر اور مکھّی ہے (مگس)
(آشیانہ) گھونسلا، پنجرہ (قفس)

بھیڑیا (گرگ) اور بکری (گوسپند)
(میش) کا ہے نام بھیڑ، اے خود پسند

نام (گل) کا پھول، (شبنم) اوس ہے
جس کو نقّارہ کہیں، وہ (کُوس) ہے

(سقف) چھت ہے (سنگ) پتھر اینٹ (خِشت)
جو بُرا ہے، اُس کو ہم کہتے ہیں (زِشت)

(خار) کانٹا، (داغ) دھبّہ (نغمہ) راگ
(سیم) چاندی، (مس) ہے تانبا، (بخت) بھاگ

(زر) ہے سونا، اور (زرگر) ہے سُنار
(موز) کیلا، اور ککڑی ہے (خِیار)

(ریش) داڑھی موچھ (سَبلت) اور (بُرُوت)
(احمق) اور (نادان) کو کہتے ہیں اوت

زندگانی ہے (حیات) اور (مرگ) موت
(شُوے) خاوند، اور ہے (انباغ) سوت

(جملہ) سب، اور (نصف) آدھا، (ربع) پاؤ
(صرصر) آندھی، (سَیل) نالا، (باد) باؤ

ہے (جراحت) اور (زخم) اور گھاؤ (ریش)
بھینس کو کہتے ہیں، بھائی، (گاو میش)

○ ۱۸۵۶...ء

(ہفت) سات اور (ہشت) آٹھ اور (بست) بیس   (سی) اگر کہیے، تو ہندی اُس کی تیس
ہے (چہل) چالیس اور (پنجہ) پچاس   (ناامیدی) یاس اور (امیّد) آس
(دوش) کل کی رات اور امروز (آج)   (آرد) آٹا اور (غلّہ) ہے اناج
چاہیے ہے ماں کو (مادر) جاننا   اور بھائی کو (برادر) جاننا
پھاوڑا (بیل) اور درانتی (داس) ہے   فارسی (کاہ) اور ہندی گھاس ہے
سبز ہو جب تک اُسے کہیے (گیاہ)   خشک ہو جاتی ہے تب کہتے ہیں (کاہ)
(چکسہ) پُڑیا، (کیسے) کا تھیلی ہے نام   فارسی میں چھتے کا (سیلی) ہے نام
(اَخلکندو) جھنجھنا، (نیرو) ہے زور   (بادفر) پھرکی ہے، اور ہے (دُزد) چور
انگبیں (شہد) اور (عسل) یہ اے عزیز   نام کو ہیں تین، پر ہے ایک چیز
(آچل) اور (آروغ) کی ہندی ڈکار   (مے) شراب اور پینے والا (میگسار)
روئی کو کہتے ہیں (پنبہ) سُن رکھو   آم کو کہتے ہیں (انبہ) سُن رکھو
(خانہ) گھر ہے، اور کوٹھا (بام) ہے   قلعہ (دِز)، کھائی کا (خندق) نام ہے
ہے بنولا (پنبہ دانہ) لا کلام   اور تربُز (ہندوانہ) لا کلام
گر (دریچہ) فارسی کھڑکی کی ہے   (سرزنش) بھی فارسی جھڑکی کی ہے
ہے کہانی کی (فسانہ) فارسی   اور شعلے کی (زبانہ) فارسی
(نعل در آتش) اسی کا نام ہے   جو کہ بے چین اور بے آرام ہے
(پِست) اور ستّو کو کہتے ہیں (سویق)   (ژرف) اور گہرے کو کہتے ہیں (عمیق)

○ ۱۸۵۶...ء

(تار) تانا، (پود) بانا، یاد رکھ   (آزمودن) آزمانا یاد رکھ
(بوسہ) چُمّی، چاہنا ہے (خواستن)   کم ہے (اندک)، اور گھٹانا (کاستن)
خوش رہو، ہنسنے کو (خندیدن) کہو   گر ڈرو، ڈرنے کو (ترسیدن) کہو
ہے (ہراسیدن) بھی ڈرنا، کیوں ڈرو؟   اور (جنگیدن) ہے لڑنا، کیوں لڑو؟
ہے گزرنے کی (گزشتن) فارسی   اور پھرنے کی ہے (گشتن) فارسی
وہ (سرودن) ہے، جسے گانا کہیں   ہے وہ (آوردن)، جسے لانا کہیں
(زیستن) کو جانِ من، جینا کہو   اور (نوشیدن) کو تم پینا کہو
دوڑنے کی فارسی ہے (تاختن)   کھیلنے کی فارسی ہے (باختن)
(دوختن) سینا، (دریدن) پھاڑنا   (کاشتن) بونا ہے (رُفتن) جھاڑنا
(کاشتن) بونا ہے اور (کِشتن) بھی ہے   کاتنے کی فارسی (رِشتن) بھی ہے
ہے ٹپکنے کی (چکیدن) فارسی   اور سُننے کی (شُنیدن) فارسی
کُودنا (جستن)، (بریدن) کاٹنا   اور (لیسیدن) کی ہندی چاٹنا
دیکھنا (دیدن)، (رمیدن) بھاگنا   جان لو، (بیدار بودن) جاگنا
(آمدن) آنا، بنانا (ساختن)   ڈالنے کی فارسی (انداختن)
(سوختن) جلنا، چمکنا (تافتن)   ڈھونڈھنا (جُستن) ہے، پانا (یافتن)
باندھنا (بستن)، (کشادن) کھولنا   (داشتن) رکھنا ہے، (سُختن) تولنا
تولنے کو اور (سنجیدن) کہو   پھر خفا ہونے کو (رنجیدن) کہو

فارسی سونے کی (خُفتن) جانیے — منھ سے کچھ کہنے کو (گُفتن) جانیے
کھینچنے کی ہے (کشیدن) فارسی — اور اُگنے کی (دَمیدن) فارسی
اونگھنا پوچھو، (غنُودن) جان لو — مانجھنا چاہو، (زدُودن) جان لو
ہے قلم کا فارسی میں (خامہ) نام — ہے غزل کا فارسی میں (چامہ) نام
کس کو کہتے ہیں غزل؟ ارشاد ہو — ہاں، غزل پڑھیے، سبق گر یاد ہو

غزل

صبح سے دیکھیں گے رستا یار کا — جمعے کے دن وعدہ ہے دیدار کا
وہ چُراوے باغ میں میوہ جسے — پھاند جانا، یاد ہو، دیوار کا
پُل ہی پر سے پھیر لائے ہم کو لوگ — ورنہ، تھا اپنا ارادہ پار کا
شہر میں چھڑیوں کے میلے کی ہے بھیڑ — آج عالم اور ہے بازار کا
لاَل ڈِگی پر کرے گا جا کے کیا؟ — پُل پہ چل، ہے آج دِن اتوار کا
گر نہ ڈر جاؤ، تو دکھلاؤں تمھیں — کاٹ، اپنی کاٹھ کی تلوار کا
واہ بے! لڑکے، پڑھی اچھی غزل — شوق، ابھی سے ہے تجھے، اشعار کا
لو سُنو کل کا سبق، آجاؤ تم — پُوزی (افسار) اور دُمچی (پاردُم)
چھلنی کو (غِربال، پَرویزن) کہو — چھید کو تم (رَخنہ) اور (رَوزن) کہو
(چہ) کے معنی کیا، (چگویم) کیا کہوں — (من شوم خاموش) میں چپ ہو رہوں
(باز خواہم رفت) میں پھر جاؤں گا — (نان خواہم خورد) روٹی کھاؤں گا
فارسی (کیوں) کی (چرا) ہے یاد رکھ — اور گھنٹا لا (دِرا) ہے یاد رکھ

(دشت)، (صحرا) اور جنگل ایک ہے — پھر (سہ شنبہ) اور منگل ایک ہے
جس کو (ناداں) کہیے وہ انجان ہے — فارسی بینگن کی (بادِنجان) ہے
جس کو کہتے ہیں جمائی، (فازہ) ہے — جو ہے انگڑائی، وہی (خمیازہ) ہے
(بارہ) کہتے ہیں کڑے کو ہم سے پوچھ — باڑ ہے (تالار) اک عالم سے پوچھ
جس طرح گہنے کی (زیور) فارسی — اُس طرح ہنسلی کی (پَرگر) فارسی
بھِڑ کی، بھائی، فارسی (زنبور) ہے — دسپنا (انبُر) ہے اور (انبُوں) ہے
فارسی (آئینہ)، ہندی آرسی — اور ہے کنگھے کی، (شانہ)، فارسی
ہینگ (انگوزہ) ہے، اور (ارزیز) رانگ — (ساز) باجا، اور ہے آواز (بانگ)
(زوجہ) جورو (دیزنہ) بہنوئی کو جان — (خشم) غصّے اور بدخوئی کو جان
لوہے کو کہتے ہیں (آہن) اور (حدید) — جو نئی ہو چیز، اُسے کہیے (جدید)
ہے (نوا) آواز، ساماں اور (ال) — (نِرخ) قیمت اور (بہا) یہ سب ہیں مول
(سیر) لہسن (تُرب) مولی، (تَرّہ) ساگ — کھا (بخور)، (برخیز) اُٹھ، (بگریز) بھاگ
روئی کی پونی کا ہے (پاغند) نام — (دُوک) تکلے کو کہیں گے لا کلام
(گیتی) اور (گیہاں) ہے دُنیا، یاد رکھ — اور ہے (نَدّاف) دُھنیا، یاد رکھ
(کوہ) کو ہندی میں کہتے ہیں پہاڑ — فارسی (گُلخن) ہے اور ہندی ہے بھاڑ
تکیہ (بالش) اور بچھونا، بِسترا — اصل (بِستر) ہے، سمجھ لو تم ذرا
بِسترا بولیں سپاہی اور فقیر — ورنہ (بستر) کہتے ہیں بَرنا و پیر

○ ...۱۸۵۶ء

(پیر) بوڑھا اور (برنا) ہے جواں   جان کو البتہ کہتے ہیں (رواں)

اینٹ کے گارے کا نام (آژند) ہے   ہے (نصیحت) بھی وہی، جو (پند) ہے

(پند) کو (اندرز) بھی کہتے ہیں، ہاں   (ارض) ہے، پر (مرز) بھی کہتے ہیں ہاں

کیا ہے (ارض) اور (مرز)؟ تم سمجھے؟ (زمیں)   (عُنق) گردن، اور پیشانی (جبیں)

(آس) چکّی، (آسیا) مشہور ہے   اور (فوفل) چھالیا مشہور ہے

بانسلی (نَے) اور (جلاجل) جھانجھ ہے   پھر (سترون) اور (عقیمہ) بانجھ ہے

(کحل) سُرمہ، اور سلائی (میل) ہے   جس کو جھولی کہیے وہ (زنبیل) ہے

پایا قادر نامے نے آج اختتام   اک غزل تم اور پڑھ لو، والسلام!

شعر کے پڑھنے میں کچھ حاصل نہیں   غزل   مانتا، لیکن ہمارا دل، نہیں

علم سے ہی قدر ہے انسان کی   ہے وہی انسان، جو جاہل نہیں

کیا کہیں کھائی ہے حافظ جی کی مار؟   آج ہنستے آپ جو کھِل کھِل نہیں

کس طرح پڑھتے ہو رُک رُک کر سبق؟   ایسے پڑھنے کا تو میں قائل نہیں

جس نے قادر نامہ سارا پڑھ لیا
اُس کو آمد نامہ کچھ مشکل نہیں

مئی ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۲ء

متفرق

تیسرا مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۶۱ء

چوتھا مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۶۲ء

(پانچویں مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۶۳ء) کے تمام اشعار چوتھے مطبوعہ ایڈیشن تک شامل دیوان ہو کر شائع ہو چکے تھے)

○ ...۱۸۵۶ء

(پیر) بوڑھا اور (برنا) ہے جواں — جان کو البتہ کہتے ہیں (رواں)
اینٹ کے گارے کا نام (آژند) ہے — ہے (نصیحت) بھی وہی، جو (پند) ہے
(پند) کو (اندرز) بھی کہتے ہیں، ہاں — (اَرض) ہے، پر (مرز) بھی کہتے ہیں ہاں
کیا ہے (ارض) اور (مرز)؟ تم سمجھے؟ (زمیں) — (عُنق) گردن، اور پیشانی (جبیں)
(آس) چکی، (آسیا) مشہور ہے — اور (فوفل) چھالیا مشہور ہے
بانسلی (نَے) اور (جلاجل) جھانجھ ہے — پھر (ستروَن) اور (عقیمہ) بانجھ ہے
(کحل) سُرمہ، اور سلائی (میل) ہے — جس کو جھولی کہیے وہ (زنبیل) ہے
پایا قادر نامے نے آج اختتام — اک غزل تم اور پڑھ لو، والسلام!

شعر کے پڑھنے میں کچھ حاصل نہیں — غزل مانتا، لیکن ہمارا دل، نہیں
علم سے ہی قدر ہے انسان کی — ہے وہی انسان، جو جاہل نہیں
کیا کہیں کھائی ہے حافظ جی کی مار؟ — آج ہنستے آپ جو کھِل کھِل نہیں
کس طرح پڑھتے ہو رُک رُک کر سبق؟ — ایسے پڑھنے کا تو میں قائل نہیں

جس نے قادر نامہ سارا پڑھ لیا
اُس کو آمد نامہ کچھ مشکل نہیں

مئی ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۲ء

متفرق

تیسرا مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۶۱ء

چوتھا مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۶۲ء

(پانچویں مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۶۳ء) کے تمام اشعار چوتھے مطبوعہ ایڈیشن تک شاملِ دیوان ہو کر شائع ہو چکے تھے)

○ ...۱۸۵۷ء

قطعہ

بس کہ فعّالِ مایُرید ہے آج   ہر سلحشور انگلستاں کا[1]
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے   زہرہ، ہوتا ہے آبِ انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے   گھر، بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک   تشنۂ خوں ہے، ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک   آدمی، واں نہ جا سکے، یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے، پھر کیا؟   وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ   سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم   ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے، یارب!
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا؟

○ ...بعد از ۱۸۵۷ء

قطعہ

مسلمانوں کے میلوں کا ہوا قتل   پچے ہے جوگ مایا اور دیبی[2]
نشاں باقی نہیں ہے سلطنت کا   مگر، ہاں، نام کو اورنگ زیبی

---

[1] "یہ قطعہ اردوے معلیٰ: ۱۸۶۰ء میں علائی کے نام کے ایک خط کے ساتھ بغیر کسی حوالے کے چھپا ہے۔ مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے متعلق ہے"

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے "غالب کے بعض غیر متداول اشعار کا زمانۂ فکر" ص ۴۷

○ ... بعد از ۱۸۵۷ء

غزل

آپ نے "مسّنی الضّر" کہا ہے تو سہی   یہ بھی، یا حضرتِ ایوّب! گِلا ہے تو سہی[1]
رنج، طاقت سے سوا ہو تو نہ پیٹوں کیونکر؟   ذہن میں، خوبیِ تسلیم و رضا ہے تو سہی
ہے غنیمت کہ بامید گزر جائے گی عمر   نہ ملے داد، مگر روزِ جزا ہے تو سہی
دوست گر کوئی نہیں ہے، جو کرے چارہ گری   نہ سہی، لیک تمنّائے دوا ہے تو سہی
غیر سے، دیکھیے، کیا خوب نباہی اُس نے   نہ سہی ہم سے، پر اُس بُت میں وفا ہے تو سہی
نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں مَیں   کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

کبھی آجائے گی، کیوں کرتے ہو جلدی، غالبؔ؟
شہرۂ تیزیِ شمشیرِ قضا ہے تو سہی

○ ... قبل از ۸ فروری ۱۸۵۸ء

سہرا

ہم نشیں تارے ہیں، اور چاند شہاب الدّین خاں
بزمِ شادی ہے فلک، کاہ کشاں ہے سہرا[2]
ان کو لڑیاں نہ کہو، بحر کی موجیں سمجھو
ہے تو کشتی میں، و لے بحرِ رواں ہے سہرا

[1، 2] تفصیل کے لیے دیکھیے "غالب کے بعض غیر متداول اشعار کا زمانۂ فکر" ص ۶۵

○ ۱۸۵۸...ء

قصیدہ

کُلاہِ کشور و لشکر، پناہِ شہر و سپاہ — جنابِ عالیِ ایلن برون والا جاہ[1]

بلند رتبہ وہ حاکم، وہ سرفراز امیر — کہ، باج تاج سے لیتا ہے جس کا طرفِ کلاہ

وہ محضِ رحمت و رافت، کہ بہرِ اہلِ جہاں — نیابتِ دمِ عیسیٰ کرے ہے جس کی نگاہ

وہ عینِ عدل کہ دہشت سے جس کی پرسش کی — بنے ہے شعلۂ آتش، انیسِ پرِّ کاہ

زمیں سے سودۂ گوہر اُٹھے، بجائے غبار — جہاں ہو، توسنِ حشمت کا اُس کے جولاں گاہ

وہ مہرباں ہو، تو انجم کہیں: "الٰہی شکرا!" — وہ خشمگیں ہو، تو گردوں کہے: "خدا کی پناہ"

یہ اس کے عدل سے اضداد کو ہے آمیزش — ق کہ دشت و کوہ کے اطراف میں، بہرِ سرِ راہ

ہزبر پنجے سے لیتا ہے کام شانے کا — کبھی جو، ہوتی ہے اُلجھی ہوئی، دُمِ روباہ

نہ آفتاب، ولے آفتاب کا ہم چشم — نہ بادشاہ، ولے مرتبے میں ہمسرِ شاہ

خدا نے اُس کو دیا ایک خوبرو فرزند — ستارہ جیسے چمکتا ہوا بہ پہلوے ماہ

زہے ستارۂ روشن، کہ جو اُسے دیکھے — شُعاعِ مہرِ درخشاں ہو اُس کا تارِ نگاہ

---

[1] "یہ قصیدہ میرزا صاحب نے منشی شیو نرائن کی طرف سے مسٹر ایلن برون کے یہاں بیٹا پیدا ہونے کی مبارک باد پر لکھا تھا۔ چنانچہ منشی جی کو خط میں لکھتے ہیں:
"کل آپ کا خط آیا۔ رات بھر میں نے فکرِ شعر میں خونِ جگر کھایا۔ ۲۱ شعر کا قصیدہ کہہ کر تمھارا حکم بجا لایا۔ میرے دوست، خصوصاً میرزا تفتہ، جانتے ہیں کہ میں فنِ تاریخ کو نہیں جانتا۔ اس قصیدے میں ایک روش خاص سے سنہ ۱۸۵۸ء کا اظہار کر دیا ہے۔ خدا کرے، تمھارے پسند آوے۔ تم خود قدر دانِ سخن ہو۔ اور یہ تین استاد اس فن کے تمھارے یار ہیں۔ میری محنت کی داد مل جائے گی۔" (اردوے معلّٰی ص ۳۵۰)" نسخۂ عرشی ص ۳۷۶

○ ۱۸۵۸...ء

خدا سے ہے یہ توقع کہ عہدِ طفلی میں — بنے گا شرق سے تا غرب اُس کا بازی گاہ

جوان ہو کے کرے گا، یہ، وہ جہانبانی — کہ تابع اُس کے ہوں روز و شب سپید و سیاہ

کہے گی خلق اسے: "داورِ سپہر شکوہ" — لکھیں گے لوگ اسے: "خسروِ ستارہ سپاہ"

عطا کرے گا خداوندِ کارساز اسے — روانِ روشن و خوے خوش و دلِ آگاہ

ملے گی اس کو وہ عقلِ نہفتہ داں کہ اسے — پڑے نہ قطعِ خصومت میں احتیاجِ گواہ

یہ ترکتاز سے برہم کرے گا کشورِ روس — یہ لے گا، بادشہِ چیں سے، چھین تخت و کلاہ

سنینِ عیسوی اٹھارہ سو اور اٹھاون — یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے شام و پگاہ

یہ جتنے سینکڑے ہیں، سب ہزار ہو جاویں — دراز اس کی ہو عمر اس قدر، سخن کوتاہ

امیدوارِ عنایات، شیو نراین — کہ آپ کا ہے نمک خوار اور دولت خواہ

یہ چاہتا ہے کہ دُنیا میں عزّ و جاہ کے ساتھ
تمھیں اور اس کو سلامت رکھے سدا، اللہ!

غزل

۱۸۵۸...ء تا دسمبر ۱۸۶۵ء

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے؟ م — غلامِ ساقیِ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے؟[1]

---

[1] خط بنام مرزا حاتم علی مہر۔ محررہ اوائل جولائی ۱۸۵۸ء میں صرف مطلع اور مقطع درج ہے۔ مطلع ثانی بھی یقیناً ۱۸۶۲ء سے پہلے کہہ لیا گیا ہوگا جبھی تو یہ تینوں شعر عرشی میں شامل ہو سکے۔ مگر بقیہ چار شعر وہ ہیں جو غالب نے اپنے خط بنامِ علائی محررہ اواخر دسمبر ۱۸۶۵ء میں علائی کی فرمائش پر تازہ کہہ کر بھیجے تھے۔ اس طرح یہ غزل کا عہدِ فکر ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۵ء تک قرار پاتا ہے۔

○ ... ۱۸۵۸ء تا دسمبر ۱۸۶۵ء

تمھاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے م رقیب پر ہے اگر لطف، تو ستم کیا ہے؟
نہ حشر و نشر کا قائل، نہ کیش و ملّت کا خدا کے واسطے! ایسے کی پھر قسم کیا ہے؟
وہ داد و دید گراں مایہ شرط ہے ہمدم وگرنہ، مُہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے؟
کٹے تو شب کہیں کاٹے، تو سانپ کہلاوے کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بخم کیا ہے؟
لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود کسے خبر ہے کہ واں جُنبشِ قلم کیا ہے؟
سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی م یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اُس میں دم کیا ہے؟

○ ... قبل از ۱۸۶۰ء **مرثیہ**

ہاں، اے نفَسِ بادِ سحر، شعلہ فشاں ہو اے دِجلۂ خوں، چشمِ ملائک سے رواں ہو[1]
اے زمزمۂ قُم، لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو اے ماتمیانِ شہِ مظلوم کہاں ہو؟

بگڑی ہے بہت بات، بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو ماتم میں شہِ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو

---

[1] سرورِ ریاض ص ۲۳ تا ۲۷۔ از ریاض الدین امجد سندیلوی ریاض تخلّص۔ یہ بند خود غالبؔ نے "اپنے دست خاص سے لکھ کر" ۲۶ جولائی ۱۸۶۰ء کو امجد سندیلوی کو دیے تھے۔ تاہم کلام یقیناً پہلے کا کہا ہوا ہے۔ اگر حالیؔ کا قول تسلیم کر لیا جائے کہ یہ مرثیہ مجتہد العصر سید محمد کی فرمائش پر کہنا شروع کیا تھا تو یقیناً مرثیہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے کا فکر کردہ ہوگا۔ کیونکہ ہنگامے کے بعد تو بقول صاحب بزم غالبؔ خود مجتہد العصر کو بھی لکھنؤ چھوڑنا پڑا تھا۔ چنانچہ ۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء کے خط میں، غالبؔ نے مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ سے ان کی خیریت دریافت کی ہے اس کے بعد بھی عرصے تک حالات ایسی فرمائشوں کے لیے سازگار کہاں رہے ہونگے

○ ... قبل از ۱۸۶۰ء

گھر پھونکنے میں اپنے، مُحابا نہیں ہم کو گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو

یہ خرگہِ نُہ پایۂ جو مدّت سے بپا ہے
کیا خیمۂ شبّیر سے رُتبے میں سوا ہے؟

کچھ اور ہی عالم ہے، دل و چشم و زباں کا کچھ اور ہی نقشا نظر آتا ہے، جہاں کا
کیسا فلک؟ اور مہرِ جہانتاب کہاں کا ہوگا دلِ بیتاب کسی سوختہ جاں کا

اب صاعقہ و مہر میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں، اس رُو سے کہو برق نہیں ہے

... ۱۸۶۰ء **قطعہ**

جب کہ سیّد غلام بابا نے مسندِ عیش پر جگہ پائی[1]
ایسی رونق ہوئی برات کی رات کہ کواکب ہوے تماشائی

قطعہ

ہزار شکر کہ سیّد غلام بابا نے فرازِ مسندِ عیش و طرب جگہ پائی[2]
زمیں پہ ایسا تماشا ہوا برات کی رات کہ آسماں پہ کواکب بنے تماشائی

---

[1] خط بنام سیّاح۔ ۳۱ جولائی ۱۸۶۰ء (یہ وہی خط ہے جس میں غالبؔ نے کہا ہے کہ انھیں فنِ تاریخ گوئی و معمّا سے لگاؤ نہیں۔ اور کہ ان کی دونوں تاریخوں میں "مادّہ اوروں کا ہے اور اشعار ان کے ہیں۔ پھر کہتے ہیں "وہ دوست جو مادّہ ڈھونڈھ دیتے تھے' وہ جنّت کو سدھارے"

[2] خط بنام سیّاح۔ ۳۱ جولائی ۱۸۶۰ء

○ ...۱۸۶۰/۶۱ء

قطعہ

اس کتابِ طرب نصاب نے جب — آب و تابِ انطباع کی پائی
فکرِ تاریخ سال میں، مجھ کو — ایک صورت نئی نظر آئی
ہندسے پہلے سات سات کے دو — دِیے ناگاہ مجھ کو دکھلائی
اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا — با ہزاراں ہزار زیبائی
سالِ ہجری تو ہوگیا معلوم — بے شمولِ عبارت آرائی
مگر، اب ذوقِ بذلہ سنجی کو — ہے جداگانہ کارفرمائی
سات اور سات ہوتے ہیں چودہ — یہ اُمیدِ سعادت افزائی
غرض اس سے ہیں چاردہ معصوم — جس سے ہے چشمِ جاں کو بینائی
اور بارہ امام ہیں، بارہ — جس سے ایماں کو ہے توانائی

اُن کو، غالبؔ، یہ سال اچھا ہے
جو ائمہ کے ہیں تولّائی

...۱۸۶۲ء

قطعہ

سلیم خاں کہ وہ ہے نورِ چشمِ واصل خاں — حکیمِ حاذق و دانا ہے، وہ لطیف کلام[۲]
تمام دہر میں اُس کے مطب کا چرچا ہے — کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام

---

[۱] تذکرہ سراپا سخن طبعِ اوّل از محسن علی محسن لکھنوی۔ ص ۳۹۳۔ ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰/۶۱ء)
[۲] 'تکشیفِ حکمت' از حکیم محمد سلیم خاں دہلوی۔ مطبوعہ مارچ ۱۸۶۹ء ص ۱۸۸

○ ...۱۸۶۲ء

اسے فضائلِ علم و ہنر کی افزایش — ہوئی ہے، مبدعِ عالم سے، اس قدر انعام
کہ بحثِ علم میں اطفالِ ابجدی اُس کے — ہزار بار فلاطوں کو دے چکے اِلزام
عجیب نسخۂ نادر، لکھا ہے ایک اُس نے — کہ جس میں حکمت و طب ہی کے مسئلے ہیں تمام
نہیں کتاب، ہے اک منبعِ نکاتِ بدیع — کمالِ فکر میں دیکھا، خِرد نے، بے آرام
کل اُس کتاب کے سالِ تمام میں، جو مجھے — کہا یہ جلد کہ تو اس میں سوچتا کیا ہے؟
"لکھا ہے نسخۂ تحفہ"، یہی ہے سالِ تمام

۱۲۷۹ھ (۱۸۶۲ء)

...۱۸۶۲ء (مج)

غزل

کیونکر اُس بت سے رکھوں جان عزیز؟ — کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز
دل سے نکلا، پہ نہ نکلا دل سے — ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
تاب لائے ہی بنے گی، غالبؔ — واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

---

[۱] یہ غزل مب میں نہیں ہے اس لیے اسے مج کے حوالے سے ۱۸۶۲ء ہی کا قرار دے دیا ہے

○ ... ۱۸۶۲ء

رُباعیات

رقعے کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے؟ ثاقبؔ، حرکت یہ کی ہے بیجا تم نے
حاجی کلّو کو دے کے بے وجہ جواب غالبؔ کا پکا دیا کلیجا تم نے[1]

اے روشنیِ دیدۂ شہاب الدّیں خاں کٹتا ہے، بتاؤ کس طرح سے رمضاں؟
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک؟ سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں؟[2]

۱،۲ عرشی مرحوم فرماتے ہیں،

"یہ دونوں رباعیاں گویا دو منظوم خط ہیں جو مرزا صاحب نے نواب شہاب الدین خاں بہادر ثاقبؔ کو لکھے تھے۔ مولوی مہیش پرشاد مرتبِ خطوطِ غالبؔ کی رائے میں: ۱۸۶۲ء کے بعد کی معلوم ہوتی ہیں"۔ میری رائے میں یہ تفریحی رقعے ہیں جو شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ کے عنفوانِ شباب ہی میں لکھے گئے ہونگے۔ وہ نہ صرف اس وقت غیر شادی شدہ ہونگے بلکہ ۱۶-۱۷ سے زیادہ عمر کے نہ ہوں گے۔ بہر حال منشی مہیش پرشاد کے تتبع میں ان رباعیوں کو ۱۸۶۲ء میں رکھ لیا گیا ہے مگر یہ سال قطعی قیاسی ہے

۱۸۶۲ء
تا
۱۸۶۷ء

مُتفرِّقات

○ ...۱۸۶۳ء

قصیدہ

گِنی ہیں سال کے رشتے میں بیس بار گرہ — ابھی حساب میں باقی ہیں، سو ہزار گرہ[1]

گرہ کی ہے یہی گنتی کہ تا بروزِ شمار — ہوا کرے گی ہر اک سال آشکار، گرہ

یقین جان، برس گانٹھ کا جو تاگا ہے — یہ کہکشاں ہے کہ ہیں اس میں بے شمار گرہ

گرہ سے اور گرہ کی امید کیوں نہ بڑھے؟ — کہ ہر گرہ کی گرہ میں ہیں، تین چار گرہ

دکھا کے رشتہ، کسی جوتشی سے پوچھا تھا — کہ "دیکھ کتنی، اُٹھا لائے گا یہ تار، گرہ؟"

کہا کہ "چرخ پہ ہم نے گِنی ہیں نو گرہیں — جو یاں گِنیں گے، تو پاویں گے نو ہزار گرہ"

خود آسماں ہے مہاراؤ راجہ پر صدقے — کرے گا سینکڑوں اُس تار پر نثار، گرہ

وہ راؤ راجہ بہادر کہ حکم سے جن کے — رواں ہو تار پہ فی الفور، دانہ وار، گرہ

اُنھیں کی سالگرہ کے لیے ہے سال بسال — کہ لائے غیب سے غنچوں کی، نوبہار، گرہ

اُنھیں کی سالگرہ کے لیے بناتا ہے — ہوا میں بوند کو، ابرِ تگرگ بار، گرہ

---

[1] یہ قصیدہ مہاراؤ راجہ شیودان سنگھ والیِ الور کی شان میں لکھا گیا ہے۔ مصرعِ اول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی ۲۰ ویں سالگرہ کا جشن منایا جا رہا تھا۔ وہ راجہ بنے سنگھ کے (۱۸۵۷ء میں) مرنے پر ۱۳ برس کی عمر میں اگست ۱۸۵۷ء میں مسند نشین ہوئے تھے مگر ناتجربہ کاری کی بنا پر انھیں نومبر ۱۸۵۸ء میں اختیارات سے بے دخل کر دیا گیا اور پانچ سال بعد ۴ دسمبر ۱۸۶۳ء کو دوبارہ بااختیار کیا گیا (بحوالہ وقائع راجستان ص ۴/۷، ۳/۲، ۳) راجا شیودان سنگھ کی تاریخ ولادت معلوم نہیں مگر "بیس بار گرہ" سے ظاہر ہے کہ اختیارات عمر کے بیس سال پورے کرنے پر بحال کیے گئے ہوں گے۔ اس طرح ولادت کے ماہ و سال دسمبر ۱۸۴۳ء ٹھہرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تاریخ بھی ۴ ہی ہو یعنی ۴ دسمبر ۱۸۴۳ء

قصیدہ پہلے پہل رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا تھا

○ ...۱۸۶۳ء

اُنھیں کی سالگرہ کی یہ شادمانی ہے — کہ ہو گئے ہیں، گہر ہائے شاہوار، گرہ

اُنھیں کی سالگرہ کے لیے ہے یہ توقیر — کہ بن گئے ہیں، ثمر ہائے شاخسار، گرہ

سن اے ندیم، برس گانٹھ کے یہ تاگے نے — تجھے بتاؤں کہ کیوں کی ہے اختیار، گرہ؟

پئے دعائے بقائے جنابِ فیض مآب — لگے گی، اس میں، ثوابت کی اُستوار گرہ

ہزار دانے کی تسبیح چاہتا ہے بنے — بلا مبالغہ، درکار ہے ہزار گرہ

عطا کیا ہے خدا نے وہ جاذبہ اُس کو — کہ چھوڑتا ہی نہیں، رشتہ زینہار گرہ

کشادہ رُخ نہ پھرے کیوں کہ اس زمانے میں — بچی نہ، از پئے بندِ نقابِ یار، گرہ

متاعِ عیش کا، ہے، قافلہ چلا آتا — کہ جادہ رشتہ ہے اور ہے شترقطار گرہ

خدا نے دی ہے وہ، غالبؔ کو دستگاہِ سخن — کروڑوں ڈھونڈھ کے لاتا یہ خاکسار گرہ

کہاں مجالِ سخن؟ سانس لے نہیں سکتا — پڑی ہے، غم کی، مرے دل میں پیچ دار گرہ

گرہ کا نام لیا، پر نہ کر سکا کچھ بات — زباں تک آ کے، ہوئی اور اُستوار گرہ

کھُلے یہ گانٹھ، تو البتّہ دم نکل جاوے — بُری طرح سے ہوئی ہے گلے کا ہار گرہ

اِدھر نہ ہوگی، توجّہ حضور کی جب تک — کبھی کسی سے کھُلے گی نہ، زینہار گرہ

دعا یہ ہے کہ مخالف کے دل میں، از رہِ بُغض — پڑی ہے یہ جو بہت سخت نابکار گرہ

دل اُس کا پھوڑ کے نکلے، بہ شکلِ پھوڑے کے

خدا کرے کہ کرے اس طرح اُبھار گرہ

○ ... ۱۸۶۴ء

مثنوی[1]

اے جہاں آفریں خدائے کریم ۔۔۔ صانعِ ہفت چرخ و ہفت اقلیم
نام مکلوڈ جن کا ہے مشہور ۔۔۔ یہ ہمیشہ بہ صد نشاط و سرور
عمر و دولت سے شادماں ہیں ۔۔۔ اور غالب پہ مہرباں ہیں

شعر

ان دلفریبیوں سے نہ کیوں اُس پہ پیار آئے؟
روٹھا جو بے گناہ، تو بے عذر من گئے[2]

رباعی

اے منشیِ خیرہ سر، سخن ساز نہ ہو ۔۔۔ عصفور ہے تو، مقابلِ باز نہ ہو[3]
آواز تری نکلے اور آواز کے ساتھ ۔۔۔ لاٹھی وہ لگے کہ جس میں آواز نہ ہو

---

[1] یہ مثنوی میرزا غالب کے مرتبہ اُس بے نام اردو کتابچے کے ابتدائی میں ہے جسے میں نے اس کا عکس مع مقدمہ "انتخاب رقعات و اشعار غالب" کے نام سے چھپوا دیا ہے۔ یہ دیباچے کے آخر میں ملتی ہے، جو شاید انھوں نے ہندوستان میں مقیم انگریزوں کو اردو سکھانے کے لیے اپنے منتخب رقعات اور اشعار پر مشتمل ترتیب دیا تھا۔ میرزا صاحب نے اسے میکلوڈ صاحب "فنانشل کمشنر بہادر قلمرو پنجاب" کی نذر کیا ہے۔
"(مسٹر ڈانلڈ) مکلوڈ نے سر رابٹ منٹگمری کے ۱۰ر جنوری ۱۸۶۵ء کو مستعفی ہونے کے بعد پنجاب کی لفٹیننٹ گورنری کا عہدہ سنبھالا تھا۔ ظاہر ہے کہ فنانشل کمشنر وہ اس سے پہلے ہی ہو سکتے تھے۔ لہٰذا اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ ۱۸۶۴ء کی مرتبہ تسلیم کرنا چاہیے۔" (انتخابِ رقعات و اشعارِ غالب ص دس)

[2] خط بنام بے خبر مورخہ ۷ مارچ ۱۸۶۴ء

[3] لطائفِ غیبی مطبوعہ ۱۸۶۴ء ص ۱۵

○ ... ۲۵ دسمبر ۱۸۶۴ء تا ۸ جنوری ۱۸۶۵ء

قصیدہ[1]

مرحبا! سالِ فرخی آئیں ۔۔۔ عیدِ شوال و ماہِ فروردیں
شب و روز، افتخارِ لیل و نہار ۔۔۔ مہ و سال، اشرفِ شہور و سنیں
گرچہ ہے بعد عید کے نوروز ۔۔۔ لیک، بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں
سو، اس اکیس دن میں ہولی کی ۔۔۔ مجلسیں، جا بجا، ہوئیں رنگیں
شہر میں، کو بہ کو، عبیر و گلال ۔۔۔ باغ میں سو بہ سو، گل و نسریں
شہر، گویا، نمونۂ گلزار ۔۔۔ باغ، گویا، نگار خانۂ چیں
تین تیوہار اور ایسے خوب ۔۔۔ جمع ہرگز ہوئے نہ ہوں گے کہیں
پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں ۔۔۔ منعقد، محفلِ نشاط قریں
محفلِ غسلِ صحتِ نوّاب ۔۔۔ رونق افزائے مسندِ تمکیں
بزم گہ میں، امیر شاہ نشاں ۔۔۔ رزم گہ میں، حریفِ شیرِ کمیں
پیش گاہِ حضور، شوکت و جاہ ۔۔۔ خیر خواہِ جناب، دولت و دیں
جن کی مسند کا، آسماں، گوشہ ۔۔۔ جن کی خاتم کا، آفتاب نگیں

---

[1] خط بنام منشی سیل چند مورخہ ۱۹ر جنوری ۱۸۶۵ء سے پتا چلتا ہے کہ یہ قصیدہ ۲۵ر دسمبر ۱۸۶۴ء اور ۸ جنوری ۱۸۶۵ء کے درمیان لکھا گیا تھا۔ یہ نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم کے جشنِ صحت کے موقع پہ کہا گیا تھا

○ ...۲۵ دسمبر ۱۸۶۴ء تا ۸ جنوری ۱۸۶۵ء

جن کی دیوارِ قصر کے نیچے — آسماں، ہے گدائے سایہ نشیں
دہر میں اس طرح کی بزمِ سرور — نہ ہوئی ہو، کبھی بروئے زمیں
انجمِ چرخ، گوہر آگیں فرش — نور سے، ماہ ساغرِ سیمیں
راجہ اندر کا جو اکھاڑا ہے — ہے وہ بالائے سطحِ چرخِ بریں
وہ نظرگاہِ اہلِ وہم و خیال — یہ، ضیا بخشِ چشمِ اہلِ یقیں
واں کہاں یہ عطا و بذل و کرم — کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں
یاں زمیں پر نظر جہاں تک جائے — ژالہ آسا، بچھے ہیں، دُرِّ ثمیں
نغمۂ مُطربانِ زہرہ نوا — جلوۂ لولیانِ ماہ جبیں
اُس اکھاڑے میں جو کہ ہے مظنون — یاں، وہ دیکھا بچشمِ صورت بیں
سرورِ مہر فر ہوا جو سوار — ق بجمالِ تجمّل و تزئیں
سب نے جانا کہ ہے پری توسن — اور بالِ پری ہے، دامنِ زیں
نقشِ سُمِّ سمند سے، یکسر — بن گیا، دشت، دامنِ گلچیں
فوج کی گردِ راہ مُشک فشاں — رہروؤں کے مشام عطر آگیں
بس کہ بخشی ہے فوج کو عزت — فوج کا ہر پیادہ، ہے فرزیں
موکبِ خاص، یوں زمیں پر تھا — جس طرح ہے سپہر پر، پرویں
چھوڑ دیتا تھا گور کو، بہرام — ق ران پر داغِ تازہ دے کے، وہیں
اور داغ آپ کی غلامی کا — خاص بہرام کا ہے زیبِ سُریں
بندہ پرور نشاطرازی سے — مدعا، عرضِ فنِ شعر نہیں

○ ...۲۵ دسمبر ۱۸۶۴ء تا ۸ جنوری ۱۸۶۵ء

آپ کی مدح اور میرا مُنھ — گر کہوں بھی، تو کس کو آئے یقیں
اور پھر اب، کہ ضعفِ پیری سے — ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں
پیری و نیستی، خدا کی پناہ! — دستِ خالی و خاطرِ غمگیں
صرف، اظہار ہے، ارادت کا — ہے قلم کی، جو سجدہ ریز، جبیں
مدح گستر نہیں، دعا گو ہے — غالبِ عاجزِ نیاز آگیں

ہے دعا بھی یہی کہ دُنیا میں
تم رہو زندہ جاوداں، آمیں!

...قبل از ۱۸۶۵ء — شعر

خوشی جینے کی کیا، مرنے کا غم کیا
ہماری زندگی کیا، اور ہم کیا[1]

...۱۸۶۵ء — قطعہ

مُقامِ شکر ہے اے ساکنانِ خطّۂ خاک — رہا ہے زور سے ابرِ ستارہ بار برس[2]
کہاں ہے ساقیِ مہوش؟ کہاں ہے ابرِ مطیر — "بیار" لائیے گلنار گوں، "بہادہ" برس
خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی — درِ حضور پہ اے ابر، بار بار برس
ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو مَلک، وہ کہے — "امیر کلبِ علی خاں جییں ہزار برس"

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے 'غالب کے بعض غیر متداول اشعار کا زمانۂ فکر' ص ۶۵
[2] یہ قطعہ خط بنام نواب کلبِ علی خاں، مورخہ ۱۱ اگست ۱۸۶۵ء کے ساتھ بھیجا گیا تھا

○ ... ۱۸۶۵ء

فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں — کئی ہزار برس، بلکہ بے شمار برس
جنابِ قبلۂ حاجات! اس بلاکش نے — بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس

شفا ہو آپ کو، غالبؔ کو بندِ غم سے نجات
خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس

غزلیات

○ ... ۱۸۶۵ء

لطفِ نظارۂ قاتل، دمِ بسمل آئے — جان جائے، تو بلا سے، پہ کہیں دل آئے[1]
اُن کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری؟ — دوست جو ساتھ مرے تا لبِ ساحل آئے
وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو، اے شیخ — ساتھ حُجّاج کے اکثر کئی منزل آئے
آئیں جس بزم میں وہ، لوگ پکار اُٹھتے ہیں — لو، وہ برہم زنِ ہنگامۂ محفل آئے
دیدہ خونبار ہے مدّت سے، ولے آج ندیم — دل کے ٹکڑے بھی کئی، خون کے شامل آئے
سامنا حور و پری نے نہ کیا ہے، نہ کریں — عکس تیرا ہی، مگر، تیرے مقابل آئے
موت بس ان کی ہے جو مر کے وہیں دفن ہوئے — زیست اُن کی ہے جو اُس کوچے سے گھائل آئے
بن گیا سُبحہ وہ زُنّار، خدا خیر کرے! — وہ جو نازک ہے کمر اُس پہ بہت دل آئے

اب ہے دلّی کی طرف کوچ ہمارا غالبؔ
آج ہم حضرتِ نوّاب سے بھی مِل آئے

[1] "یہ غزل میرزا صاحب نے اپنے دوسرے سفرِ رامپور میں ۲۸ دسمبر ۱۸۶۵ء کو یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے کہی تھی۔ اس زمانے میں کلبِ علی خاں بہادر رام پور کے نواب تھے۔" (نسخۂ عرشی طبع دوم ص ۴۳۳)

○ ... ۱۸۶۵ء

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی — تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور سہی[1]
غیر کی مرگ کا غم کس لیے، اے غیرتِ ماہ؟ — ہیں ہوس پیشہ بہت، وہ نہ ہوا، اور سہی
تم ہو بت، پھر تمھیں پندارِ خدائی کیوں ہے؟ — تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی
حُسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی — آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی
تیرے کوچے کا ہے مائل، دلِ مضطر میرا — کعبہ اک اور سہی، قبلہ نما اور سہی
کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے، واعظ؟ — خلد بھی باغ ہے، خیر آب و ہوا اور سہی
کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں، یا رب! — سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
مجھ کو وہ دو، کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں — زہر کچھ اور سہی، آبِ بقا اور سہی

مجھ سے، غالبؔ، یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

قطعہ

○ ... ۱۸۶۵ء تا ۱۸۶۷ء

خوشی ہے یہ، آنے کی برسات کے — پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں[2]
سرِ آغازِ موسم میں، اندھے ہیں ہم — کہ دلّی کو چھوڑیں، لوہارو کو جائیں

[1] خط بنام نواب امین الدین احمد خاں مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۶۵ء
[2] یہ قطعہ نواب علائی کی بیاض سے لیا گیا ہے۔ "بیاض کے اندراجات میں ترتیب تاریخی کا لحاظ نہیں ہے، چنانچہ ان سے پہلے ۲۷ جنوری ۱۸۶۷ء کا اور ان کے بعد ۵ اپریل ۱۸۶۵ء کا اندراج ملتا ہے۔ اس لیے انہیں تقریباً اسی زمانے کا مان لیا ہے۔"

○ ...۱۸۶۵ء تا ۱۸۶۷ء

سوا ناج کے، جو ہے مقلوبِ جاں — نہ واں آم پائیں، نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں — ابھی جا کے پوچھو کہ "کل کیا پکائیں"؟
وہ کھٹے، کہاں پائیں اِملی کے پھول — وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں؟
فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشے دار
کہو اُس کو کیا، کھا کے ہم، حظ اُٹھائیں؟

غزلیات

...۱۸۶۶ء

در پر امیرِ کلبِ علی خاں کے ہوں مقیم[1] — ق — شایستۂ گدائیِ ہر در نہیں ہوں میں
بوڑھا ہوا ہوں، قابلِ خدمت نہیں، اسدؔ — خیرات خوارِ محض ہوں، نوکر نہیں ہوں میں

...۱۸۶۶ء

مسجد کے زیرِ سایہ، اک گھر بنالیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے[2]

---

[1] میرزا صاحب نے اس زمین میں اپنی (برسوں پرانی) غزل .... کا مقطع حذف کر کے اور آخر میں یہ دو شعر بڑھا کر، نواب کلبِ علی خاں بہادر والیِ رامپور کی خدمت میں ۹ جون ۱۸۶۶ء کو بھیجی تھی۔

[2] "یہ شعر میرزا صاحب نے اپنے مکان واقع محلہ بلّی ماران کے متعلق کہا تھا۔ مولانا حالی کے بیان کے مطابق یہ حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوان خانے کے متصل مسجد کے عقب میں تھا، اور اسی میں اُن کا انتقال ہوا تھا (یادگار: ۸)۔ مولانا مہر کی رائے ہے کہ اس میں میرزا صاحب جنوری ۱۸۶۶ء کے بعد منتقل ہوئے تھے۔ ملاحظہ ہو غالب: ۸۵ (طبعِ سوم)"۔ نسخۂ عرشی اشاعتِ دوم ص ۴۳۶

○ ...۱۸۶۷ء

قطعہ

گڑگانویں کی ہے جتنی رعیت، وہ یک قلم — عاشق ہے اپنے حاکمِ عادل کے نام کی[1]
سو یہ، نظر فروز قلم دان نذر ہے — مسٹر کوآن صاحبِ عالی مقام کی

ہندوستان کی بھی عجب سرزمین ہے — جس میں وفا و مہر و محبت کا ہے وفور[2]
جیسا کہ آفتاب نکلتا ہے شرق سے — اِخلاص کا ہوا ہے اسی ملک سے ظہور
ہے اصلِ تخمِ ہند سے، اور اس زمین سے — پھیلا ہے سب جہان میں یہ میوہ دُور دُور

غزلیات

شبِ وصال میں مُونس گیا ہے بن تکیہ — ہوا ہے موجبِ آرامِ جان و تن، تکیہ[3]
خراج بادشہِ چیں سے کیوں نہ مانگوں آج؟ — کہ بن گیا ہے خمِ جعدِ پُرشکن تکیہ
بنا ہے تختۂ گل ہائے یاسمیں، بستر — ہوا ہے دستۂ نسرین و نسترن تکیہ
فروغِ حُسن سے روشن ہے، خوابگاہ تمام — جو رختِ خواب ہے پرویں، تو ہے پرن تکیہ

---

[1] مسٹر جے ایل، کوآن اسسٹنٹ کمشنر گوڑگانواں۔ فروری ۱۸۶۶ء میں دلی سوسائٹی کے ممبر بنائے گئے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے خمخانۂ جاوید جلد اوّل ص ۸۰، ۸۱۔ قطعہ کوآن صاحب کی ٹرانسفر کے موقع پر کہا گیا تھا۔

[2] رسالۂ دہلی سوسائٹی، شمارہ تیسرا۔ احوالِ غالب، ص ۱۷۲ تا ۱۹۲

[3] پہلے پہل گلدستۂ انجمن مطبوعہ مطبع اکبری دہلی، ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں چھپی (مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لاہور)۔ بعد میں نواب احمد سعید خاں طالب شاگردِ غالب نے اپنے کاغذات سے فراہم کر کے ۴ جون ۱۹۱۳ء کے روزنامہ ہمدرد دہلی میں چھپوائی۔

○ ...۱۸۶۷ء

مزا ملے، کہو، کیا خاک ساتھ سونے کا؟ رکھے جو بیچ میں، وہ شوخِ سیم تن تکیہ
اگرچہ تھا یہ ارادہ، مگر خدا کا شکر! اُٹھا سکا نہ نزاکت سے، گلبدن تکیہ
ہوا ہے، کاٹ کے چادر کو، ناگہاں غائب اگرچہ زانوئے نل پر رکھے، دمن، تکیہ
بضربِ تیشہ وہ! اس واسطے ہلاک ہوا کہ ضربِ تیشہ پہ رکھتا تھا، کوہکن تکیہ
یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ، صبح ہونے تک رکھو نہ شمع پہ، اے اہلِ انجمن! تکیہ
اگرچہ پھینک دیا تم نے دور سے، لیکن اُٹھائے کیونکے، یہ رنجورِ خستہ تن، تکیہ
غش آ گیا جو، پس از قتل، میرے قاتل کو ہوئی ہے اُس کو مری لاشِ بے کفن تکیہ
جو بعدِ قتل مرا دشت میں مزار بنا لگا کے بیٹھتے ہیں اُس سے راہ زن تکیہ
شبِ فراق میں یہ حال ہے اذیت کا کہ سانپ فرش ہے، اور سانپ کا ہے مَن تکیہ
روا رکھو نہ رکھو، تھا جو لفظ "تکیہ کلام" اب اُس کو کہتے ہیں اہلِ سخن "سخن تکیہ"

ہم اور تم، فلکِ پیر جس کو کہتے ہیں
فقیرِ غالبِ مسکیں کا ہے کہن تکیہ

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں[1]
ہوں دردمند، جبر ہو یا اختیار ہو گہ نالۂ کشیدہ، گہ اشکِ چکیدہ ہوں

---

[1] خط بنام نواب علائی مورخہ ۳ مارچ ۱۸۶۷ء

○ ...۱۸۶۷ء

جاں لب پہ آئی، تو بھی نہ شیریں ہوا دہن از بس کہ تلخیِ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں
نے سبحہ سے علاقہ، نہ ساغر سے واسطہ میں معرضِ مثال میں، دستِ بُریدہ ہوں
ہوں خاکسار، پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ نَے دانۂ فتادہ ہوں، نے دامِ چیدہ ہوں
جو چاہیئے نہیں وہ، مری قدر و منزلت میں یوسفِ بقیمتِ اوّل خریدہ ہوں
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے، مری جگہ ہوں میں کلامِ نغز، ولے ناشنیدہ ہوں
اہلِ ورع کے حلقے میں، ہر چند، ہوں ذلیل پر عاصیوں کے زمرے میں، مَیں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح، اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

قصیدہ

کرتا ہے چرخ، روز بصد گونہ احترام[1] فرمانروائے کشورِ پنجاب کو، سلام[2]
حق گوے و حق پرست و حق اندیش و حق شناس نوابِ مستطاب، امیرِ شہ احتشام
جم رتبہ میکلوڈ بہادر کہ وقتِ رزم ترکِ فلک کے ہاتھ سے، وہ چھین لیں حُسام
جس بزم میں کہ ہو انھیں آہنگِ میکشی واں آسمان شیشہ بنے، آفتاب جام

---

[1] یہ قصیدہ سب سے پہلے ۱۰ جون ۱۹۱۴ء کے الہلال میں مولانا ابوالکلام آزاد نے شائع کیا تھا۔ مولانا نے اسے نواب سعید الدین احمد خاں طالب کے نسخۂ دیوانِ غالب سے حاصل کیا تھا۔
[2] سر ڈانلڈ میکلوڈ ۱۰ جنوری ۱۸۶۵ء کو منٹگمری صاحب کے مستعفی ہونے پر پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر مقرر ہوئے تھے

○ ... ۱۸۶۷ء

چاہا تھا میں نے، تم کو مہِ چاردہ کہوں — ق — دل نے کہا کہ "یہ بھی ہے تیرا خیالِ خام"

دو رات میں تمام ہے، ہنگامہ ماہ کا — حضرت کا عزّ و جاہ رہے گا علی الدّوام

سچ ہے تم آفتاب ہو، جس کے فروغ سے — دریائے نور ہے، فلکِ آبگینہ فام

میری سنو، کہ آج تم اِس سرزمین پر — حق کے تفضّلات سے، ہو مرجعِ انام

اخبارِ لودھیانہ میں میری نظر پڑی — تحریر ایک، جس سے ہوا بندہ تلخ کام

ٹکڑے ہوا ہے، دیکھ کے تحریر کو، جگر — کاتب کی آستیں ہے، مگر، تیغ کا نیام

وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا — جب یاد آگئی ہے، کلیجا لیا ہے تھام

سب صورتیں بدل گئیں، ناگاہ، یک قلم — نمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام

ستّر برس[1] کی عمر میں یہ داغِ جانگداز — جس نے، جلا کے، راکھ مجھے کر دیا تمام

تھی جنوری مہینے کی تاریخ، تیرہویں[2] — اِستادہ ہو گئے لبِ دریا پہ جب خیام

اُس بزمِ پُرفروغ میں، اِس تیرہ بخت کو — نمبر ملا نشیب میں، از روئے اہتمام

سمجھا اُسے گر اب، ہوا پاش پاش، دل — دربار میں جو، مجھ پہ چلی، چشمکِ عوام

---

[1] اس شعر سے ظاہر ہے کہ مرزا نے جب یہ شعر کہا تو وہ ستر برس کے ہو چکے تھے۔ لہٰذا اس کلام کو ۱۸۶۷ء کا کہا ہوا تسلیم کرنا چاہیے

[2] لب دریا (جمنا کنارے) ۱۳ جنوری کو ریل (پل پر) جاری ہونے کے جشن کے لیے خیمے لگ گئے۔ بقول مولانا عرشی پل پر سے ریل پہلی بار یکم جنوری ۱۸۶۷ء کو گزری تھی۔ ہو سکتا ہے کہ باقاعدہ جشن افتتاح ۱۳ جنوری کو منایا گیا ہو۔ چونکہ قصیدے میں غالب کو مناسب مقام و مرتبہ نہ ملنے کی شکایت ہے اس لیے ظاہر ہے کہ قصیدہ ۱۳ جنوری ۱۸۶۷ء کے بعد ہی کہا گیا ہوگا

○ ... ۱۸۶۷ء

عزت پہ اہلِ نام کی ہستی کی ہے، بِنا — عزّت جہاں گئی، تو نہ ہستی رہی، نہ نام

تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر — اُس ناز کا، فلک نے لیا مجھ سے انتقام

آیا تھا، وقت ریل کے کھُلنے کا بھی[1] قریب — تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا اژدحام

اس کشمکش میں آپ کا مدّاحِ دردمند — آقائے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام

جو واں نہ کہہ سکا، وہ لکھا ہے حضور کو — دیں آپ میری داد، کہ ہوں فائز المرام

ملک و سپہ نہ ہو، تو نہ ہو، کچھ ضرر نہیں — سلطانِ بر و بحر کے درگاہوں میں غلام

وکٹوریا کا، دہر میں جو، مدح خوان ہو — شاہانِ عصر، چاہیے، لیں عزّت اُس سے وام

خود، ہے تدارک اس کا، گورمنٹ کو ضرور — بے وجہ کیوں ذلیل ہو، غالبؔ ہے جس کا نام

امرِ جدید کا، تو نہیں ہے مجھے، سوال — بارے قدیم قاعدے کا، چاہیے، قیام

ہے بندے کو اعادۂ عزّت کی آرزو — چاہیں اگر حضور، تو مشکل نہیں یہ کام

دستورِ فنِ شعر یہی ہے قدیم سے — یعنی، دعا پہ مدح کا، کرتے ہیں اختتام

ہے یہ دعا کہ زیرِ نگیں آپ کے رہے — اقلیمِ ہند و سندھ سے تا ملکِ روم و شام!

---

[1] لب دریا (جمنا کنارے) ۱۳ جنوری کو ریل (پل پر سے) جاری ہونے کے جشن کے لیے خیمے لگ گئے۔ بقول مولانا عرشی پل پر سے ریل پہلی بار یکم جنوری ۱۸۶۷ء کو گزری تھی۔ ہو سکتا ہے کہ باقاعدہ جشن افتتاح ۱۳ جنوری کو منایا گیا ہو۔ چونکہ قصیدے میں غالب کو مناسب مقام و مرتبہ نہ ملنے کی شکایت ہے اس لیے ظاہر ہے کہ قصیدہ (جو در حقیقت شکایت نامہ ہے) ۱۳ جنوری ۱۸۶۷ء کے بعد ہی کہا گیا ہوگا

○ ... اکتوبر / نومبر ۱۸۶۷ء

قطعہ

ہند میں اہلِ تسنّن کی ہیں دو سلطنتیں
حیدرآبادِ دکن، رشکِ گلستانِ اِرم

رامپور، اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
کہ جہاں ہشت بہشت آکے ہوئے ہیں باہم

حیدرآباد بہت دور ہے، اس ملک کے لوگ
اُس طرف کو نہیں جاتے ہیں، جو جاتے ہیں تو کم

رام پور آج ہے وہ بُقعۂ معمور کہ ہے
مرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ آدم

رام پور ایک بڑا باغ ہے، از روئے مثال
دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خرّم

جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں
ہے اسی طور پہ یاں دجلہ فشاں دستِ کرم

ابرِ دستِ کرمِ کلبِ علی خاں سے مدام
دُرِّ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پیہم

صبحدم باغ میں آجائے، جسے ہو نہ یقیں
سبزہ و برگِ گل و لالہ پہ دیکھے شبنم

حبّذا! باغِ ہمایونِ تقدّس آثار
کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم

مسلکِ شرع کے ہیں، راہرو و راہ شناس
خضر بھی یاں اگر آجائے، تو لے اُن کے قدم

مدح کے بعد دعا چاہیے، اور اہلِ سخن
اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے بہ اِغراق، رقم

حق سے کیا مانگیے؟ ان کے لیے جب ہو موجود
ملک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و علَم

ہم نہ تبلیغ کے مائل، نہ غلو کے قائل
دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نوّاب کو ہم

یاخدا، غالبِ عاصی کے خداوند کو دے
دو وہ چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا، عالم

اولاً، عمرِ طبیعی بہ دوامِ اقبال
ثانیاً، دولتِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم[1]

لہ یہ قطعہ مکتوب غالب بنام نواب کلب علی خاں بہادر مورخہ ۵ رجب ۱۲۸۴ھ (۳ نومبر ۱۸۶۷ء) کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ [illegible] مرزا غالب کا یہ آخری کلام ہے جو تا حال دریافت ہوا ہے

○ ... بعد از ۱۳ جولائی ۱۸۶۷ء

شعر

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو، اب اللہ ہی اللہ ہے[1]

لہ (ا) آبِ حیات میں مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ "مرنے سے چند روز پہلے یہ شعر (دمِ واپسیں الخ) کہا تھا"

(ب) یادگارِ غالب میں حالی لکھتے ہیں:

"مرنے سے چند روز پہلے بے ہوشی طاری ہوگئی تھی۔ پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لیے افاقہ ہوجاتا تھا پھر بے ہوش ہو جاتے تھے۔ جس روز انتقال ہوگا، اُس سے شاید ایک دن پہلے میں ان کی عیادت کو گیا تھا۔ اس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا۔ اور نواب علاء الدین احمد خان مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا۔ اس کے جواب میں ایک فقرہ اور فارسی شعر جو غالباً شیخ سعدی کا تھا لکھوایا .... مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر وردِ زبان رہتا تھا: دمِ واپسیں الخ"

(ج) مرقعِ ادب مرتّبہ صفدر مرزاپوری کے ص ۱۹ پر غالب کا ایک خط بنام مولانا احمد حسین مینا مرزاپوری، مورخہ ۱۳ جولائی ۱۸۶۷ء درج ہے۔ اس میں مرزا لکھتے ہیں۔

"مولوی فرزند علی صاحب اخگر کا کون شخص مشتاق نہ ہوگا....
...... فقیر تو ان سے مل کر بہت خوش ہوا .... (وہ) جب
چاہیں اپنا کلام (برائے اصلاح) بھیج دیں ...."

معلوم ہوتا ہے چند ہی دنوں بعد، مینا مرزاپوری کے خط کے ساتھ ہی جناب اخگر کا خط مع غزل پہنچ گیا۔ اس کے جواب میں، اصلاح شدہ غزل واپس کرتے ہوئے مرزا نے یہ بھی لکھا:

"قبلۂ حاجات، میرا حال کیا پوچھتے ہیں۔ زندہ ہوں مگر مُردے سے بدتر۔ جو حالت میری آپ اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرما گئے تھے۔ اب اس سے بھی بدتر ہے۔ مرزاپور کیا آؤں اب سوائے سفرِ آخرت اور کسی سفر کی نہ مجھ میں طاقت ہے نہ جرأت۔ جوان ہوتا تو احباب سے

○ ...بعد از ۱۳ جولائی ۱۸۶۷ء

دعاے صحت کا طلب گار ہوتا۔ بوڑھا ہوں، تو دعاے مغفرت کا خواہاں ہوں۔ دم واپسیں برسرِ راہ ہے۔ عزیز ذاب اللہ ہی اللہ ہے"۔

اس خط سے ثابت ہے کہ اگر اس شعر کو مرزا کی بدیہہ گوئی پر محمول سمجھ لیا جاے اور فرض کرلیا جائے کہ جواب لکھتے وقت یہ شعر بھی قلم سے نکل گیا ہوگا، تو بھی شاید یہ آخرِ اگست ۱۸۶۷ء کے بعد کا فکر کردہ نہ ہوگا ـــــ واللہ اعلم

فہرستیں

فہرست اشعار
بلحاظِ سالِ فکر

• ۱۸۱۲ء

مثنوی

• ۱۸۱۲ء

غزلیات

• ۱۸۱۶ء

غزلیات

• ۱۸۱۶ء

رباعیات

• بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

غزل

• ۱۸۲۱ء

قصائد

• ۱۸۲۱ء

غزلیات

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی ۴۶۰

• ۱۸۵۵ء (قد)

رباعیات

اس سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے ۴۶۰

• ۱۸۵۵ء

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں ۴۶۰

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے ۴۶۰

• ۱۸۵۶ء

قادرنامہ

(قادر اور (اللہ) اور (یزداں) خدا ۴۶۰

• ۱۸۵۷ء

قطعہ

بس کہ فعّالِ مایُرید ہے آج ۴۷۰

• بعد از ۱۸۵۷ء

قطعہ

مسلمانوں کے میلوں کا ہوا قُل ۴۷۰

• بعد از ۱۸۵۷ء

غزل

یہ بھی یا حضرتِ ایوب، گلا ہے تو سہی ۴۷۱

قبل از ۸ فروری ۱۸۵۸ء

بزمِ شادی ہے فلک کاہ کشاں ہے سہرا ۴۷۱

• ۱۸۵۸ء

قصیدہ

جنابِ عالی ایلن برونِ والاجاہ ۴۷۲

• ۱۸۵۸ء تا دسمبر ۱۸۶۵ء

غزل

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے؟ ۴۷۳

• قبل از ۱۸۶۰ء

مرثیہ

ہاں اے نفسِ بادِ سحر، شعلہ فشاں ہو ۴۷۴

• ۱۸۶۰ء

قطعات

مسندِ عیش پر جگہ پائی ۴۷۵

فرازِ مسندِ عیش و طرب جگہ پائی ۴۷۵

• ۱۸۶۰/۶۱ء

قطعہ

آب و تابِ انطباع کی پائی ۴۷۶

• ۱۸۶۲ء

قطعہ

حکیمِ حاذق و دانا ہے، وہ لطیف کلام ۴۷۶

• ۱۸۶۲ء (مج)

غزل

کیوں کر اُس بُت سے رکھوں جان عزیز ۴۷۴

• ۱۸۶۲ء

رباعیات

رقعے کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے ۴۷۸

اے روشنیِ دیدۂ شہاب الدین خاں ۴۷۸

• ۱۸۶۳ء

قصیدہ

گنگی ہیں سال کے رشتے میں بیس بار گرہ ۴۸۰

• ۱۸۶۴ء

مثنوی

اے جہاں آفریں، خدائے کریم ۴۸۲

• ۱۸۶۴ء

شعر

ان دلفریبیوں سے نہ کیوں اُس پہ پیار آئے؟

روٹھا جو بے گناہ، تو بے عُذر من گیا ۴۸۲

• ۱۸۶۴ء

رُباعی

اے منشیِ خیرہ سر، سخن ساز نہ ہو ۴۸۲

• ۲۵ دسمبر ۱۸۶۴ء تا

۸ جنوری ۱۸۶۵ء

قصیدہ

مرحبا! سالِ فرخی آئیں ۴۸۳

• قبل از ۱۸۶۵ء

شعر

خوشی جینے کی کیا، مرنے کا غم کیا

ہماری زندگی کیا، اور ہم کیا ۴۸۵

• ۱۸۶۵ء

قطعہ

رہا ہے زور سے ابرِ ستارہ بار، برس ۴۸۵

• ۱۸۶۵ء

غزلیات

لطفِ نظّارۂ قاتل، دمِ بسمل آئے ۴۸۶

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی ۴۸۷

• ۱۸۶۵ء تا ۱۸۶۷ء

قطعہ

پییں بادۂ ناب اور آم کھائیں ۴۸۷

• ۱۸۶۶ء

غزلیات

شایستۂ گدائیِ ہر در نہیں ہوں میں ۴۸۸

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے ۴۸۸

• ۱۸۶۷ء

قطعہ

عاشق ہے اپنے حاکمِ عادل کے نام کی ۴۸۹

ہندوستان کی بھی عجب سرزمین ہے ۴۸۹

فہرستِ اشعار، بلحاظِ حروفِ تہجّی

(قافیہ و ردیف)

الف

ب

ت

و

ہ

ی

ــــــ * ــــــ

ے

اشاریے

اشاریے

نوٹ:۔ اشخاص، کتب و رسائل، مقامات وغیرہ سے متعلق ذیل کے اشاریوں
(ا) کو صرف ضروری نشاندہی تک محدود رکھا گیا ہے۔
(ب) کی ترتیب بلحاظِ حروفِ تہجی بیشتر پہلے ہی حروف تک محدود ہے۔
(ج) میں کسی ہندسے کے نیچے لکیر سے یہ مراد ہے کہ اس صفحہ پر وہ نام ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے۔

اشخاص

اشخاص

اشخاص

اشخاص

ب

اشخاص

پ

ت

اشخاص

ث

ج

اشخاص

چ

ح

اشخاص

خ

د

ذ

ر

ز

س

اشخاص

ش

ص

اشخاص

ض

ط

ظ

ع

اشخاص

اشخاص

غ

اشخاص

اشخاص

اشخاص | اشخاص

ف

اشخاص | اشخاص

ق

ک

گ

ل

م

اشخاص

اشخاص

اشخاص

اشخاص

اشخاص

شہر - ممالک

الف

ب

پ

ٹ

شہر - ممالک

ج

چ

ح

خ

د

ر

شہر۔ممالک

کتب

کتب

کتب

کتب

کتب

ذ

کتب

ر

س

ش

ع

غ

کتب

ف

ق

کتب

کتب

رسالے

اخبار

کتب خانے، لائبریریاں۔ ادارے

کتب خانے۔ لائبریریاں۔ ادارے	مضامین

مضامین

نظم۔ قصیدے۔ مثنوی وغیرہ

مطبعے، پریس، پبلیشرز	مطبعے، پریس، پبلیشرز

مطبع پریس۔ پبلشرز

مقام، جگہ وغیرہ (متفرقات)

مقام، جگہ وغیرہ (متفرقات)

مقام، جگہ وغیرہ (متفرقات)

مقام، جگہ وغیرہ (متفرقات)